ادبِ اطفال کے فروغ میں شجاعت علی راہیؔ کی شعری ونثری خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

(تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اردو)

مقالہ نگار:

بے نظیر ارشاد

رول نمبر: BI793011

رجسٹریشن نمبر: 07-NKK-0473

نگرانِ مقالہ:

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین

چیئر پرسن (شعبۂ اردو)

جامعۂ پشاور

شعبۂ اردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

سیشن ۲۰۱۶ء۔۲۰۲۰ء

میری حیات گھٹا، میرے فن کی عمر بڑھا
میرے خدا، مجھے لمحے نہ دے زمانے دے

پیش لفظ

ادب اطفال کسی بھی زبان کے ادب کا اہم شعبہ ہے۔ اس شعبے کے کئی مثبت مقاصد ہیں۔ یہ نہ صرف بچوں میں ادب کے مطالعے کا ذوق پیدا کرتا ہے بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی پروان چڑھاتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ بچوں کے ادب کو وہ توجہ نہیں مل سکی ہے، جس کی اِسے ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راقمہ نے ایم فل مقالے کے لئے معروف ادیب جناب شجاعت علی راہیؔ کی بچوں کے ادبِ اطفال کے شعبے میں شعری ونثری خدمات کے تنقیدی جائزے کا موضوع چنا۔

شجاعت علی راہیؔ بڑوں کے ادب کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب میں بھی ایک معتبر شاعر و نثر نگار کے طور پر مانے جاتے ہیں۔ بچوں کے لئے ان کی شعری اور نثری تخلیقات پر مبنی کتب کی کل تعداد اکیس (۲۱) ہے، جن میں سے بیشتر کتابیں باقاعدہ طور پر چھپ کر منظرِ عام پر آچکی ہیں اور کچھ تا حال زیرِ اشاعت ہیں۔

راقمہ کے مقالے کا عنوان ''ادب اطفال کے فروغ میں شجاعت علی راہیؔ کی شعری ونثری خدمات (تحقیقی وتنقیدی جائزہ) ہے۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اوّل ''اردو میں بچوں کا ادب: روایت وارتقاء'' کے لئے مختص ہے۔ اس باب میں بچوں کے ادب کے اعلیٰ معیارات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ آغاز میں بچوں کے ادب کی تعریف ومفہوم کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اسی باب میں بچوں کے ادب کی اہمیت وافادیت پر بھی بحث کی گئی ہے اور تاریخی تناظر میں بچوں کے ان ادیبوں کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے، جنہوں نے اردو میں بچوں کے ادب کی روایت وارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ چونکہ شجاعت علی راہیؔ کا تعلق خیبر پختونخوا سے ہے، اس لئے باب اوّل کے آخر میں خیبر پختونخوا میں بچوں کے ادب کے ماضی اور حال پر بھی تحقیقی وتنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

باب دوم ''شجاعت علی راہیؔ: سوانح حیات وشخصیت اور ادبی خدمات'' کے لیے مخصوص ہے۔ اس باب کا مقصد یہ ہے کہ شجاعت علی راہیؔ کی زندگی، تعلیمی مراحل، ادبی کاوشیں، شعری خدمات، افسانہ نگاری اور بچوں کے لیے مطبوعہ کتب کا جامع جائزہ پیش کیا جائے۔ اس باب میں مذکورہ حوالوں سے شجاعت علی راہیؔ کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات کو تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔ ان کی تخلیقات پر ہونے والے تحقیقی وتنقیدی مقالات اور مضامین سے بھی رہنمائی لی گئی ہے، تا کہ ان کے ادبی مقام ومرتبے کو پس منظر کے ساتھ بیان کیا جاسکے۔

باب سوم ''شجاعت علی راہیؔ کی بچوں کے لیے شاعری: فکری وفنی جائزہ'' میں بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی شعری کتب کے فکری وفنی حوالوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات، زبان وبیان اور تعلیمی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے تا کہ ان کی شاعری کی نمائندہ صفات کو سامنے لایا جاسکے۔

باب چہارم ''شجاعت علی راہیؔ کے بچوں کے لیے ناولٹ: فکری وفنی جائزہ'' کے لیے مختص ہے۔اس باب کے آغاز میں ناولٹ کی تعریف کی گئی ہے اور راہی صاحب کے ناولٹ نگاری میں کہانی پن، کردار نگاری اور زبان و بیان کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور یوں ان کے شائع شدہ ناولٹ زیر بحث لائے گئے ہیں۔

باب پنجم ''شجاعت علی راہیؔ کی بچوں کے لیے مختصر کہانیاں اور ڈرامے: تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔حصہ اول میں راہی صاحب کی کہانیوں کی کتاب ''ہم نے زردہ کھایا'' اور ''چڑیوں کی چہکار'' کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور بچوں کی شخصیت پر ان کہانیوں کے مثبت اثرات پر بحث کی گئی ہے۔اس باب کے حصہ دوم میں ان کے دوڈرامے ''شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا'' اور '' بچے ہوں تو ایسے ہوں'' میں کہانی، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کے اوصاف پر تحقیقی وتنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ حصہ دوم کے آغاز میں ڈرامے کی تعریف دی گئی ہے تا کہ اس کی روشنی میں راہی صاحب کی ڈراما نگاری کا جائزہ لیا جا سکے۔

مقالے کے آخری صفحات محاکے کے لیے مختص ہیں جس میں شجاعت علی راہی کے شعری ونثری ادب پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ان صفحات میں اردو ادب میں ان کے مقام ومرتبے پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بچوں کے ادب کے فروغ میں ان کی شعری ونثری تخلیقات کی اہمیت کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مقالہ نگاری کے دوران کئی مشکل مراحل آئے، لیکن بفضل خدا اساتذہ کرام ،نگران، بچوں کے ادباء، اور گھر کے افراد نے راقمہ کی بھرپور مدد کی اور ہر قسم کی رکاوٹوں کو دور کیا۔ میری خوش قسمتی دیکھیے کہ جب مقالے کے لیے موضوع کے انتخاب کی مشکل گھڑی آئی تو استاد محترم ڈاکٹر ارشد محمود ناشادؔ شعبۂ اردو علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد نے رہنمائی فرماتے ہوئے تجویز دی کہ میں خیبر پختون خوا سے تعلق رکھنے والے سینئر شاعر وادیب شجاعت علی راہیؔ کی بچوں کے لیے لکھی گئی شعری اور نثری کتب پر مقالہ لکھوں۔استاد محترم کی تجویز میرے لیے حکم کے برابر تھی۔اس موقع پر صدر شعبۂ اردو استاد محترم ڈاکٹر عبدالعزیز ساحرؔ نے کمال شفقت سے اس موضوع کے انتخاب میں حوصلہ افزائی کی۔تحقیق کے مراحل میرے لیے مشکل ہوتے اگر اساتذہ کرام ہمیں تحقیق کے فن سے آگاہ نہ کرتے۔ان کے مفید لیکچرز اور تربیت کے انداز نے ہی مجھے قلم اٹھانے کی تحریک دی۔

میں شجاعت علی راہیؔ کی انتہائی مشکور ہوں کہ انہوں نے اپنی تمام کتب، رسائل اور انٹرویوز کے لیے مجھے وقت دیا اور گاہے بگاہے تازہ ترین تحقیقی مواد اور کتب مجھے ارسال کیے اور ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔ میں ان کے لیے تہہ دل سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی انہیں طویل زندگی اور صحت عطا کرے۔

اس کے علاوہ اپنی نگران اور اعلیٰ شخصیت ڈاکٹر روبینہ شاہین صاحبہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ وہ نہ صرف ایک خوب صورت و خوب سیرت خاتون ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک مشفق رہنما بھی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی رہنمائی اور فنِ تحقیق میں مہارت نے میرے راستے کی تمام مشکلات دور کیں۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین چیئر پرسن شعبۂ اردو جامعۂ پشاور نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود مجھے وقت دیا اور بچوں کے ادب پر لکھے گئے نایاب تحقیقی مقالات تک میری رسائی کو ممکن بنایا۔ یہاں میں ایک شعر ان کی نذر کرنا چاہوں گی جو میں نے انہیں بارہا سنایا بھی ہے:

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

میڈم سے دیر سے شناسائی کو میں اپنے شومئی قسمت خیال کرتی ہوں کہ اس جیسی باصلاحیت انسان سے بہت بعد میں میری ملاقات ہوئی۔

خیبر پختون خواسے میرے سابق رفیق کار ڈاکٹر عرفان خٹک نے بھی گاہے گاہے مفید مشورے دیے۔ میں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میں خیبر پختون خوا ہی سے تعلق رکھنے والے شاعر، محقق اور بچوں کے ادیب ڈاکٹر اسحاق وردگ کی بھی احسان مند ہوں کہ انہوں نے مجھے نایاب کتب اور رسائل فراہم کیے اور فوقتاً فوقتاً تحقیق و تنقید کے رموز سے آشنا کیا۔

اسی طرح میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نہ صرف مجھے دعاؤں میں یاد رکھا بلکہ ہر قسم کی مدد اور معاونت کی۔ خصوصاً میری والدہ نے اس دوران دن رات میرا خیال رکھا کہ میں وقت پر اپنا کام پایہ تکمیل تک پہنچاؤں۔ آخر میں اپنے کمپوزر فضل رازق اور سیف اللہ کا بھی خصوصاً شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ان کی شبانہ روز محنت اور اضافی وقت دینے کی وجہ سے میں بروقت مقالہ جمع کرنے کے قابل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو! آمین

بے نظیر ارشاد
ایم۔فل اسکالر

فہرست ابواب

عنوانات

باب اوّل

اردو میں بچوں کا ادب: روایت وارتقاء

باب اوّل: اردو میں بچوں کا ادب: روایت و ارتقاء

۱۔ بچوں کا ادب: تعریف و مفہوم

ادب فنون لطیفہ کی شاخ ہے، اس لئے تہذیب کا لازمی حصہ سمجھنا چاہیے۔ یہ ادب ہی ہے جو ہزار سالوں سے انسانی زندگی کا ترجمان اور عکاس رہا ہے۔ ماہرین کے مطابق ادب انسان کی داخلی ضرورت ہے اس لیے میتھو آرنلڈ نے ادب کو تنقید حیات قرار دے کر اسے انسانی سماج کی ناگزیر ضرورت قرار دیا۔

ادب کے کئی روپ ہیں۔ شعری اور نثری اصناف کے علاوہ ادب کا ایک روپ بچوں کے ادب کی شکل میں موجود رہا ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں بچوں کا ادب صدیوں سے رائج ہے اور اس کی اہمیت و ضرورت کا دائرہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ادبِ اطفال یا بچوں کے ادب کی تعریف کیا ہے؟ کیا یہ محدود موضوعات کی ایک دنیا ہے؟ یا پھر یہ ایک تنوع کا حامل شعبۂ ادب ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر بچوں کے ادب کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> ''بچوں کا ادب ایسی تحریروں پر مشتمل ہوتا ہے، جن میں دوڑ پیچھے کی طرف کے مصداق ادیب بچہ بن کر بچوں کے لئے لکھتا ہے۔'' (۱)

گو یا ڈاکٹر سلیم اختر نے بچوں کے ادیبوں کے لئے ادبِ اطفال کے اہم فنی اُصول کی نشاندہی کی ہے کہ بچوں کے لئے لکھتے وقت اُن کی قوت مشاہدہ اور مزاج کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

بچوں کی نفسیات کے پیش نظر مرزا ادیب کی یہ رائے بھی اپنی جگہ معتبر ہے:

> ''بچوں کو وہی تحریر قطع نظر اس امر کے کہ وہ نظم ہے یا نثر، پسند آتی ہے، جو ان کی اپنی دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ بچوں کی اپنی دنیا سے مراد ہے، بچوں کا مخصوص ماحول، ان کی فطری رجحانات، ان کے اعمال و عواطف، ان کی ذہنی مطابقت، ان کے غور و فکر کی سطح۔ اس لئے ان کے ادب میں وہی کچھ ہونا چاہئے، جو ان کے گرد و پیش میں ہونا چاہئے، جسے وہ روزانہ دیکھتے ہیں اور جسے وہ خوب سمجھتے ہیں اور جو ان کے تخیل کو متحرک کرتا ہے۔''(۲)

بچوں کے ادب کی تعریف، خصوصیات، فنی لوازمات اور موضوعاتی تنوع پر ناقدین کے آراء میں شفیع الدین نیرؔ کی رائے بھی اپنی جگہ اہم ہے، ملاحظہ ہو:

> ''بچوں کے ادب سے مراد نظم و نثر کا وہ ذخیرہ ہے جو خاص طور پر بچوں کے لئے لکھا گیا ہو یا اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے بچوں کے لئے موزوں ہو یا یوں سمجھئے کہ جو ادب چار یا پانچ سال کی عمر سے تیرہ چودہ برس تک کے بچوں کے لئے مخصوص ہو، اسے ہم بچوں کے ادب سے تعبیر کرتے ہیں۔''(۳)

شفیع الدین نیرؔ کی تعریف کی تائید برٹانیکا جونیئر انسائیکلو پیڈیا کی تعریف سے بھی ہوتی ہے۔ جونیئر انسائیکلو پیڈیا کے مطابق بچوں کے ادب میں وہ تمام کتابیں شامل ہیں جو لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے بطور خاص لکھی گئی ہیں، نیز وہ کہانیاں اور کتب بھی اس میں شامل ہیں، جو بڑوں کے لئے لکھی گئی ہیں، مگر بچوں نے ان کو اپنا لیا ہے:

> "By the Children literature is meant three kind of writings, important in the lives of young people as they grow up. In the first place the term includes all of the different written kinds of stories, especially for boys and girls..... Secondly, It refers to traditional or folk literature, the collection of fairy tales, Finally, It includes the books written for adults which children have claimed as their own". (4)

شفیع الدین نیرؔ اور برٹانیکا جونیئر انسائیکلو پیڈیا کی تعریف کو مزید وسعت دیتے ہوئے مشہور انگریزی نقاد ہنری اسٹیل کومیگر (Henry Steele Commager) کہتے ہیں کہ بچوں کا ادب بڑوں کا وہ سارا سرمایہ ہے جسے اُنہوں نے قبول کر لیا ہے اور بلاشرکت غیرے اِس پر قابض ہو گئے ہیں۔ وہ اس بات کا فیصلہ بچوں پر چھوڑتے ہیں کہ ان کا ادب کیسا ہونا چاہیے۔ لکھتے ہیں:

> "What after all do we mean by the term? Is it the literature written especially for the young people? The fairy and wondar tales, the nursery rhyms and songs, the dull books of etiquelte and adominition and moral persuation, the story of school or playing field or of for-flung adventure? It is all of this, to sure, but it is for more. It is the whole vast body of literature, that children have adopted commonly to share with their elders, but some times to monopolize. It is quite literature, their literature. For it is, in the end, not the parents, the teachers, the preachers not even the authors, but the children themselves who determine what their literature is to be."(5)

ہنری اسٹیل کومیگر کی اس تعریف سے ثابت ہوتا ہے کہ بچے کبھی بھی اپنے بزرگوں اور بڑوں کے ادب میں دلچسپی لے کر انہیں قبول نہیں کریں گے، بلکہ وہ ہر اُس چیز کو قبول کریں گے جو اُن کی نفسیات اور معیار سے مطابقت رکھتی ہو، جس میں سادگی کے ساتھ دلچسپی بھی ہو۔

چنانچہ ادبِ اطفال کے ممتاز محقق و نقاد ڈاکٹر محمود الرحمن اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''جو چیز بھی بچوں کے کام و دھن کو لذت دی سکتی ہے اور ان کے مزاج و مذاق سے ہم آہنگ ہو، وہ ان کا ادب قرار پاتی ہے، چاہے یہ چیزیں بڑوں اور بزرگوں کی ملکیت ہی کیوں نہ ہو'' (۶)

گویا ڈاکٹر محمود الرحمن نے ہر اس تحریر کو بچوں کے ادب کے دائرے میں شامل کیا ہے، جس میں بچوں کے لیے کشش اور دلچسپی کا سامان ہو۔

بچوں کی ادب کے تعریف میں مختلف آراء دراصل بچوں کے ادب کی اہمیت کا اعتراف ہے۔ ان تعریفوں میں اہل قلم نے بچوں کے ادب کے کثیر المقاصد ہونے کی گواہی دی ہے اور اس کے مقصدی ہونے کی نشاندہی کی ہے۔ اس باب میں پروفیسر اکبر رحمانی کا خیال ہے:

''وہ ادب جس کے ذریعے بچوں کی دلچسپی اور شوق کی تسکین ہو، اور جو مختلف عمر کے بچوں کی نفسیات ضرورتوں، دلچسپیوں، میلانات اور ان کے فہم و ادارک کی قوت کو پیش نظر رکھ کر تخلیق کیا گیا ہو، صحیح معنوں میں ''بچوں'' کا ادب کہلانے کا مستحق ہے۔'' (۷)

بچوں کے ادب کی خصوصیات جدید دور کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے، اور بچوں کی شخصیت میں تخلیقی صفات پیدا کر کے اُن کو فطری طور پر گہرائی دیتی ہے، تاہم یہ امر ضروری ہے کہ بچوں کے ادیب ان مقاصد سے باخبر ہوں تاکہ وہ اپنی تحریروں میں وہ خصوصیات پیدا کریں جن کا ذکر محترمہ زیب النساء بیگم نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''بچوں کا ادب اُن قدروں اور خصوصیتوں کا حامل ہونا چاہیے جو کسی بھی زبان کے نظم و نثر کو ادب کا درجہ بخشتی ہیں۔ ان میں خیال کی رفعت، جذبے کی صداقت، زبان کی لطافت، اور بیان کا حُسن ہونا چاہیئے۔ کوئی بھی تحریر جو دل کو چھو لینے والی کیفیت و تاثیر سے محروم ہو، ادب میں شامل نہیں ہو سکتی۔ بچوں کا ادب اس سے مستثنیٰ نہیں۔ بچوں کی جمالیاتی حس کی تسکین اُن کی تربیت اور نشوونما اس کا بنیادی مقصد ہونا چاہئے۔'' (۸)

لہٰذا اس بحث کو ہم سمیٹتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کے ادب سے مراد وہ تحریریں ہیں جو بچوں کی ذہنی سطح، مشاہدے اور احساسات سے ہم آہنگ ہوں۔ علاوہ ازیں اس میں وہ تحریریں بھی بچوں کے ادب کا حصہ بن سکتی ہیں جو

بچوں کے لئے نہ لکھی گئی ہوں لیکن بچے اُن سے لطف اُٹھا سکتے ہوں، تاہم اس میں یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ وہ تحریریں صرف بچوں کو تفریح ہی نہ دیں بلکہ وہ بچوں میں اخلاقی خوبیاں، محنت، ہمدردی اور کتاب دوستی کا جذبہ بھی پیدا کرے۔

۲۔ بچوں کے ادب کی ضرورت واہمیت اور افادیت:

بچوں کے ادب کی مختلف تعریفوں سے نہ صرف بچوں کے ادب کی خصوصیات سامنے آتی ہیں بلکہ ادبِ اطفال کی اہمیت اور ضرورت پر بھی روشنی پڑتی ہے جس پر تمام ناقدین متفق ہیں۔ بدقسمتی سے ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں ترقی یافتہ ممالک میں بچوں کے ادب کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ان ممالک میں بچوں کے ادب کے فروغ کے لئے کئی اشاعتی ادارے قائم ہیں اور بچوں کے ادب کو بچوں کی تعلیم وتربیت، شخصیت کی تعمیر اور مطالعے کے فروغ کے لئے ایک مؤثر ذریعے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بچوں کی ادب کی اہمیت اور ضرورت کے بارے میں بچوں کے مشہور ادیب نظر زیدی لکھتے ہیں:

> ''بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں ان کا ادب اس کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ بات بنیادی طور پر سمجھنے کے قابل ہے کہ اس عمر میں ان کی عقل ناپختہ ہوتی ہے اور اُن کے دل ودماغ پر وقتی اور ہنگامی جذبات غالب رہتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم وتربیت میں بچوں کے ادب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔''(۹)

بچوں کے ادب کی افادیت کا بڑا پہلو یہ ہے کہ یہ بچوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور ان میں مطالعے کے ذوق کو بھی بڑھاتا ہے اس تناظر میں محترمہ عذرا اصغر لکھتی ہیں:

> ''ہمارے جیسے ترقی پذیر ملک میں ایسے ادب کی ضرورت ہے جو ہمارے نونہالوں کے اخلاق سنوارے، اُن کا MORAL بلند کریں، اُن کو ذمہ دار اور باشعور شہری بنائے، ان میں بہادری، جرأت اور بے خوفی کا رجحان پیدا کر سکے۔''(۱۰)

ذوقِ مطالعہ پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ بچوں کا ایسا ادب جو بامقصد بھی ہو اور بچوں کو مثبت تفریح بھی فراہم کرتا ہو، درحقیقت بچوں کی نفسیاتی ضرورت بھی ہے کیونکہ بچے زندگی کے ایک ایسے دور سے گزر رہے ہوتے ہیں جو ان کی شخصیت اور نفسیات کے حوالے سے ایک اہم دور ہوتا ہے۔ اس اہم پہلو پر ڈاکٹر سلیم اختر ان الفاظ میں تجزیہ پیش کرتے ہیں:

> ''بچوں کا ادب، ادب نہیں نفسیات کا مسئلہ ہے۔ ادب کا نام لیتے ہوئے ہمارے ذہن میں ادب، اُس کی تخلیق اور مقاصد سے وابستہ تمام تنقیدی اور فلسفیانہ نظریات اور دیگر نزاعی مباحث آ جاتے ہیں۔ بڑوں کی زندگی، شخصیت اور مسائل وغیرہ میں جو پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ ادب جب اُس کی عکاسی سے پہلو تہی کرے یا ناکام رہے تو اگر وہ بے معنی نہ بھی سمجھا جائے تو کم از کم صحت مندی سے ضرور ہی عاری جانا جائے گا۔''(۱۱)

ڈاکٹر سلیم اختر کا تجزیہ درست ہے کہ صحت منداد ب بچوں کی نفسیات کو متوازن بناتا ہے، اس لئے یہ امر لائق توجہ ہے کہ بچوں کے ادب کی اہمیت کی اس نمایاں جہت کو سامنے رکھ کر بچوں کے ادب کو فروغ دیا جائے، اس اہم نکتے سے اتفاق کرتے ہوئے بچوں کے ادیبوں کو فن اور فکر کے درمیان توازن بھی برقرار رکھنا چاہئے، اس لئے کہ ادب میں اگر مقصدیت، ادب کے فنی اُصولوں پر حاوی ہو جائے اور ادب کے آفاقی مقصد یعنی صحت مند تفریح کو نظر انداز کر دیا جائے تو ایسا ادب اپنی کشش کھو بیٹھا گا۔ بچے صرف اسی نظم اور کہانی میں دلچسپی لیں گے جو انہیں تفریح اور لطف دینے کے مقصد میں کامیاب ہو سکے گا۔ اگر لطف سے خالی کہانی اور نظم بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام ہوگا تو ایسے ادب کی ادبیت پر سوالیہ نشان ضرور لگ سکتا ہے۔

بچوں کا ادب صرف تعلیم و تربیت اور نفسیات کے میدان تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ اُردو زبان کے فروغ کا بھی اہم ذریعہ ہے۔ رسائل، اخبارات میں بچوں کے صفحات، کتابیں، بچوں کو اُردو زبان کا روزمرہ اور محاورہ سکھاتی ہیں۔ بچے ادب اطفال کے مطالعے سے افعال، حروف اور زبان کے مختلف انداز سیکھتے ہیں۔ زبان سیکھنے کے علاوہ ان کی تخلیقی صلاحیتیں بھی بیدار ہوتی ہیں، انہیں لکھنے کے مواقع مُیسر آتے ہیں اور اس طرح مستقبل کے ادیبوں کی ادبی تربیت کا عمل جاری رہتا ہے۔ گویا ادب کا مستقبل بچوں کے ادب سے ہی وابستہ ہے۔ بچوں کے معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر اسحاق وردگ نے راقمہ کو اپنے ایک انٹرویو میں ادب اطفال کی افادیت کے بارے میں بتایا:

> ''بچوں کا ادب ہی ادب کی بنیاد ہے۔ یہی وہ شعبہ ہے جو مستقبل کے لئے ادیبوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو اظہار و نکھار کے مواقع فراہم کرتا ہے۔'' (۱۲)

اگر تاریخ ادب اردو کا جائزہ لیا جائے تو عہد بہ عہد ادب اطفال کی پختہ روایت ملتی ہے جس سے بچوں کے ادب کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کا پتا چلتا ہے۔ اردو تحقیق و تنقید نے بھی ادب اطفال کی روایت کا جائزہ لے کر اس رائے کو استحکام بخشا ہے کہ ادب اطفال ایک با مقصد تخلیقی عمل ہے اور اہل قلم کو اس اہم شعبے میں بھی طبع آزمائی کرنی چاہئے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے سرکاری و ادبی اداروں اور ادبی تنظیموں کو بھی بچوں کے ادب کی ترویج و اشاعت کے عمل میں اپنا مثبت کردار ادا کرنا چاہیئے۔

۳۔ اُردو میں بچوں کے ادب کی روایت و ارتقاء:

اردو میں ادب اطفال کے آغاز کے بارے میں محققین نے کئی نظریات پیش کیے ہیں۔ انہوں نے مختلف ادوار کو ادب اطفال کا ابتدائی دور قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خوشحال زیدی نے اپنی تحقیقی کتاب میں اسے تین ادوار میں تقسیم

کیا ہے۔ان کا حاصل تحقیق ملاحظہ ہو:

''اردو ادب اطفال کا تاریخی ارتقاء:

۱۔دور اوّل ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک

۲۔دور دوم ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک

۳۔دور سوم ۱۹۴۷ء سے تا حال''۔(۱۳)

ڈاکٹر خوشحال زیدی نے حضرت امیر خسرو کو اردو میں بچوں کا پہلا ادیب قرار دیا ہے۔ان کے مطابق:

''اردو میں امیر خسرو بچوں کے شاعر ہیں اور خسرو کی تصنیف ''خالق باری'' بچوں کے ادب کی پہلی تصنیف ہے۔''(۱۴)

اس کے برعکس ڈاکٹر محمود الرحمان کے مطابق بچوں کے ادب کا آغاز اورنگ زیب عالم گیر کے دور سے ہوتا ہے۔وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''اردو میں بچوں کے ادب کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے ہوتا ہے۔اس زمانے میں نوعمر افراد کے لئے متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں۔جو زیادہ تر لغت پر مشتمل تھیں۔مثلاً ''خالق باری''؛ ''ایزد باری''؛ ''صفات باری'' وغیرہ۔''(۱۵)

ڈاکٹر محمود الرحمان کی یہ رائے درست نہیں۔''خالق باری'' اورنگزیب عالمگیر کے عہد سے پہلے لکھی گئی۔اس کی وضاحت ڈاکٹر خوشحال زیدی کی اس تحقیق سے بھی ہوتی ہے:

''اردو ادب میں ادبِ اطفال کا آغاز اگر خالق باری سے ہوتا ہے جیسا کہ محمود الرحمن نے بھی تسلیم کیا ہے۔تو ان کا یہ خیال نامناسب معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کے ادب کا آغاز عہد عالمگیر سے ہوا کیوں کہ عہد عالمگیر سے تقریباً چار صدی قبل ''خالق باری'' تصنیف کی جا چکی تھی۔''(۱۶)

ڈاکٹر خوشحال زیدی، ریاض احمد صدیقی اور مولانا محوی صدیقی سمیت کئی محققین نے ''خالق باری'' کو ادبِ اطفال کی پہلی کتاب قرار دیا ہے۔ریاض صدیقی کے خیال کے مطابق:

''تعلیم محض دینی عقائد تک محدود ہوتی تھی۔اس قسم کی محدود تعلیم کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے امیر خسرو نے ''خالق باری'' لکھی۔''(۱۷)

''معروف محقق حافظ شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں یہ دعوٰی کیا ہے کہ ''خالق باری'' سے پہلے عہد عالمگیر کے ایک بزرگ عبدالواسع ہانسوی نے بچوں کے لئے ''نصاب سہ زبان'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔''(۱۸)

ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک بچوں کے ادب کے ارتقاء میں جن ادیبوں نے اہم کردار ادا کیا ان میں امیر خسرو، میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، انشاء اللہ خان انشاؔ، مرزا غالب شامل ہیں۔

''میر تقی میر کی نظمیں ''موہنی بلی''، ''بکری اور کتے''، ''مور نامہ''، ''مچھر''، ''کھٹمل'' وغیرہ۔ اس عہد کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں اپنے موضوع، اسلوب اور زبان ہر اعتبار سے بچوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔'' (۱۹)

ادبِ اطفال کے ابتدائی دور میں نظیر اکبر آبادی کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے بچوں کے لئے بڑی تعداد میں نظمیں لکھ کر بچوں کے ادب کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔ ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر محمود الرحمان لکھتے ہیں:

''صحیح معنوں میں نظیر اکبر آبادی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بچوں کے ادب کو مذہب اور لغت کی سنجیدہ بزم سے نکال کر نونہالوں کے بزم میں پہنچا دیا ہے۔ جہاں ان کے اپنے جذبات، احساسات نمایاں ہیں۔'' (۲۰)

اس تناظر میں نظیر اکبر آبادی کی نمائندہ نظموں میں ''ایام طفلی''، ''معصوم بھولے بھالے''، ''تربوز''، ''کن کوے اور پتنگ''، ''گلہری کا بچہ''، ''ریچھ کا بچہ''، ''ہرن کا بچہ'' اور ''تل کا لڈو'' روایت ساز نظمیں ہیں۔

اردو کے استاد شاعر انشاء اللہ خان نے بھی پہلے دور کو اعتبار بخشا۔ ان سے پہلے بچوں کے ادب کا سرمایہ شاعری پر مبنی تھا۔ انشاء اللہ خان انشاء نے نثری ادب کی اٹھان میں اپنا حصہ ڈالا۔ اس حوالے سے ان کی کہانی ''رانی کیتکی'' لائق تحسین کتاب ہے۔ پروفیسر جاوید نہال، انشاء اللہ خان انشاء کی اس تصنیف کو ان لفظوں میں سراہتے ہیں:

''رانی کیتکی' انشاء کی انوکھی تصنیف ہے۔ کہانی لکھنے میں انشاء نے معجزے کی حد تک کمال کر دیا ہے۔ پوری کہانی میں عربی، فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا۔'' (۲۱)

ادبِ اطفال کے ابتدائی دور میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مناظر عاشق ہرگانوی نے فورٹ ولیم کالج کو ان لفظوں میں سراہا ہے:

''۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج دہلی سے وابستہ جان گلکرائسٹ، حیدر بخش حیدری، میر امن اور میر شیر افسوس وغیرہ نے بچوں کے لئے نظم و نثر میں لکھا''۔ (۲۲)

اس دور کی خوش بختی یہ ہے کہ بچوں کے ادب کو مرزا غالب جیسا نابغہء روزگار شاعر نصیب ہوا۔ ان کی تصنیف ''قادر نامہ'' کو ادبِ اطفال میں اچھی خاصی حیثیت حاصل ہے۔ محققین اس امر پر متفق ہیں کہ بچوں کے ادب کے قدیم دور میں ''قادر نامہ'' نے ایک سنگ میل کا مقام حاصل کیا۔ ڈاکٹر اسحاق وردگ ''قادر نامہ'' کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

''مرزا غالب کے قلم سے ''قادر نامہ'' کی تخلیق ادبِ اطفال کی روایت سازی کا اہم موڑ ہے۔ یہ صرف تصنیف ہی نہیں مرزا غالب کی جانب سے ادبِ اطفال کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کی طرف

اہلِ قلم کی توجہ مبذول کرنے کی کامیاب کاوش ہے۔ میرے نزدیک غالب نے تعلیم وتربیت کے عمل میں ادبِ اطفال کے کردار کو اجاگر کیا ہے۔'' (۲۳)

ادبِ اطفال کا دوسرا دور اس لحاظ سے کامیاب عہد ہے کہ اردو کے نامی گرامی ادیبوں نے بچوں کے ادب کو مقدم سمجھا اور اس کو وسعت دی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بچوں کے ادب نے ایک انقلابی قدم اُٹھایا اور نظم ونثر کی روایت نے ادبِ اطفال کو استحکام بخشا۔ اس پورے عہد پر نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر محمود الرحمان لکھتے ہیں:

''سنہ ۵۷ کے انقلاب کے بعد بچوں کے ادب میں جو نیا رجحان پیدا ہوا وہ حد درجہ خوش آئند وخوشگوار تھا۔ اس نے ادبِ اطفال کو حقیقت وواقعیت سے قریب کر دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بچے اپنے ادب میں دلچسپی لینے لگے۔ ان کو پسندیدہ چیزیں پڑھنے کو ملیں۔ بچوں کا ادب اس عظیم ترقی کے لئے ان بڑی شخصیتوں کا مرہونِ منت ہے جنہوں نے وقت کی آواز سُنی، جو آگے بڑھ کر تعمیری کاموں میں منہمک ہو گئے۔'' (۲۴)

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ادبِ اطفال کے معماروں میں غلام احمد فروغی، محمد حسین آزاد، پیارے لال، آشوب، ڈپٹی نذیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، شبلی نعمانی، مولوی ذکاء اللہ، اسماعیل میرٹھی، پنڈت برج نرائن چکبست، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، درگا سہائے سرور، منشی پریم چند، تلوک چند محروم، حامد اللہ افسر، خواجہ حسن نظامی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، امتیاز علی تاج، حجاب امتیاز، چراغ حسن حسرت، صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب وغیرہ نے نظم ونثر کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔

ادبِ اطفال کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس پورے عہد میں اسلامی ادب اور ترقی پسند ادب سے وابستہ ادیبوں نے یکساں طور پر بچوں کے ادب کی اہمیت کو محسوس کیا۔ انہوں نے بچوں کے لئے سیکھنے کے عمل کو اعتبار دے کر ادبِ اطفال کو محفوظ مستقبل دیا۔

غلام احمد فروغی نے بچوں کے ادب کو درسی کتب کا حصہ بنا کر اس کی تعلیمی ضرورت کا احساس دلایا، تاہم مقصدیت کے بوجھ تلے ان کی تحریریں ادبی لطف سے محروم نظر آتی ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خوشحال زیدی لکھتے ہیں:

''ان کتب کے ذریعے فروغی بچوں میں اردو، فارسی اور عربی کی استعداد بڑھانا چاہتے تھے۔ یہ کتابیں چونکہ محض درسی مقصد کے تحت لکھی گئی تھیں اس لئے ان میں بچوں کی خشکی اور بے کیفی کا احساس ہوتا تھا۔'' (۲۵)

۱۸۵۷ء کے بعد کی روایت میں محمد حسین آزاد کی تجویزیں بھی ادبِ اطفال کی شان بڑھاتی ہیں۔ آزادؔ نے بچوں کی درسی کتب مرتب کرتے وقت تفریح، تربیت اور اردو زبان کی ترقی کو مقدم رکھا۔ انہوں نے کوشش کی کہ زبان کی مٹھاس

کے ساتھ ساتھ بچے کتب کے ذریعے اپنے آس پاس کے ماحول کی سمجھ بوجھ بھی پیدا کریں۔ انہوں نے نظم ونثر میں بچوں کے لئے کتب مرتب کیں۔ ان کی قابل قدر نظموں میں ''سلام علیک''، ''جیسا چاہو سمجھ لو''، ''ہے امتحان سر پر کھڑا''، ''زمستان''، ''شبِ سرما'' اور ''شبِ ابر'' وغیرہ کافی مقبول ہیں۔ نثر میں ان کی کتب ''قصص الہند'' اور ''نصیحت کا کرن پھول'' بھی اہمیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر محمود الرحمان آزاد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آزادؔ نے بچوں کے ادب کو بہت کچھ عطا کیا۔ نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ آزادؔ کے سامنے اُردو میں بچوں کا شاندار ادب موجود نہیں تھا۔ ماضی بعید میں جو کچھ کتابیں لکھی گئی تھیں وہ نصاب وادب کے تقاضے کو پورا نہیں کرتی تھیں۔'' (۲۶)

آزاد کی تخلیقی صلاحیت نے اس کمی کو پورا کرتے ہوئے ادبِ اطفال کے فروغ کا راستہ ہموار کیا، اس لئے ان کی مرتب کردہ کتب طویل عرصے تک پڑھائی جاتی رہیں۔ حامد حسن قادری نے ان الفاظ میں آزادؔ کی کاوشوں کو سراہا ہے:

''یہ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کی بہترین کتابیں ہیں۔ بچوں کی درسیات میں اس سے بہتر کتابیں موجود نہ تھیں۔'' (۲۷)

''آزادؔ کی ان کاوشوں کو اس لئے بھی سراہنا چاہیے کہ انہوں نے انگریزی زبان وتہذیب کے مقابل نئی نسل تک اردو زبان پہنچائی اور ادب کی افادیت کی بھرپور مثال قائم کی۔'' (۲۸)

درسی کتب اور ادبِ اطفال کے فروغ میں پیارے لال آشوب کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ بچوں کے لئے شعر ونثر میں جن ادیبوں نے اس عہد میں فیصلہ کن کردار ادا کیا، ان میں ڈپٹی نذیر احمد نے بھی ادبِ اطفال پر توجہ دی۔ انہوں نے بچوں کے لئے لکھنے کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''میں اپنے بچوں کے لئے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں۔۔۔۔۔ ڈھونڈا، تلاش کیا۔ کہیں پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال کی کتابیں بنانی شروع کیں۔'' (۲۹)

نذیر احمد نے کہانیوں کے ذریعے ان مقاصد کو حاصل کیا۔ ان کی گہری دلچسپی کی وجہ سے نثر کو ترقی ملی۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی تحریروں میں کہیں کہیں وعظ ونصیحت کی بہتات بوجھل پن کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ انہوں نے نظمیں بھی لکھیں، تاہم وہ لطف کا وہ تاثیر پیدا نہیں کرتیں جو شاعری کا مقصد ہے۔ ان کے نمائندہ کتابوں میں ''چند پند'' ''منتخب الحکایات'' اور ''نصاب خسروؔ'' نے ادبِ اطفال کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

سرسید تحریک سے وابستہ خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے بھی اصلاح کی نیت سے بچوں کے لئے لکھا۔ ان کی نظریں معاشرے کی اصلاح پر تھیں، اس لئے ان کی تحریروں میں یہ خصوصیت بھی اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ اس حوالے سے

ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں:

> ''حالی کے یہاں گہری سنجیدگی اور شدید احساس ہے۔ اسی چیز نے انہیں قومی شاعر بنایا ہے۔ لیکن حالی کبھی کبھی اس دائرے سے باہر نکلتے ہیں اور زندگی کی عام دلچسپیوں میں انہوں نے بچوں کے لئے عام دلچسپی کی نظمیں لکھی ہیں''(۳۰)

جب حالی لاہور منتقل ہونے کے بعد درس و تدریس سے وابستہ ہوئے تو ان کا بچوں کے ادب سے براہ راست تعلق بنا۔ ان کی نمائندہ نظموں میں ''خدا کی شان''، ''بلی اور چوہا''، ''شیر کا شکار''، ''بڑوں کا حکم مانو'' اور ''مرغی اور اس کے بچے'' ان کو ادبِ اطفال میں نمایاں مقام دلاتی ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی نے تاریخ، سوانح عمری، تنقید اور شاعری کے میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کو آزمایا۔ انہوں نے کچھ نظمیں ادبِ اطفال کے مزاج کے مطابق بھی لکھیں۔ جن میں ''صبحِ اُمید'' اور ''عدل جہانگیر'' شامل ہیں، تاہم ان کی زبان کافی مشکل ہے۔

دوسرے دور میں اگر کسی شاعر کو ادبِ اطفال میں نمایاں مقام حاصل ہے تو وہ مولوی اسماعیل میرٹھی ہیں۔ ڈاکٹر سیفی پریمی اپنی کتاب ''اسماعیل میرٹھی حیات اور کارنامے'' میں انہیں یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''برصغیر میں اردو کی بہترین درسی کتابیں وہ ہیں جو اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لئے مرتب کیں۔ اسماعیل میرٹھی نے اتنا ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے محسوس کیا کہ اردو زبان میں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ مختلف عمر کے بچوں کے لئے موزوں نظمیں موجود نہیں ہیں۔ اس کمی کو انہوں نے خود پورا کیا۔''(۳۱)

انہوں نے آسان زبان میں فارسی کتب کو اردو میں ترجمہ کیا اور فارسی کی شیرینی اور پند و نصیحت کو بھی اردو میں کامیابی سے پیش کیا۔ ''باجے کا بھوت''، ''ایک شیر اور چیتا''، ''خودرائی کا نتیجہ''، ''محمود غزنوی اور بڑھیا''، ''محنت سونے سے بہتر ہے'' اور ''سرکشی کا ثمرہ'' میں ان کے قلم کے جوہر بخوبی کھلتے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی نے درسی کتابوں کے لئے معلوماتی مضامین بھی لکھے۔ جن میں ''ہوا اور پانی''، ''کوئلے کی کان'' اور ''نئی دنیا کا پانا'' جیسے مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کا مقصد بچوں کو نئی دنیا سے آگاہ کرنا ہے۔

بچوں کے ادب کی تاریخ میں اسماعیل میرٹھی بطور شاعر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ڈاکٹر محمود الرحمان لکھتے ہیں:

> ''مولوی اسماعیل میرٹھی کا مقام بچوں کے ادب میں بہت ہی بلند ہے۔ وہ صحیح معنوں میں بچوں کے شاعر تھے۔ انہوں نے نوعمر افراد کے لئے جو ادب تیار کیا تھا اس کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا۔ اسماعیل کی قدر و منزلت کے آگے دوسرے شعراء کا چراغ نہ جل سکا۔''(۳۲)

اسماعیل میرٹھی چونکہ خود ایک مدرس تھے تو بچوں کو پڑھانے سے انہیں، ان کی نفسیات اور ان کے جذبات و احساسات کو سمجھنے کا خوب موقع ملا۔ جس کا انہوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ ان کی نظمیں اپنی زبان، کھیل اور بچوں کے ماحول سے مطابقت رکھنے کی وجہ سے بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

ان کی نظموں کی اس خوبی کو عبدالقادر سروری نے یوں سراہا ہے:

''ابتداء ہی سے اسماعیل میرٹھی کا تعلق درس و تدریس سے رہا تھا اس لئے انہیں بچوں کی سمجھ اور ان کی نفسیات کے مطالعہ کا بڑا اچھا موقع ملا۔ اس موقع سے اسماعیل نے جو فائدہ اٹھایا وہ بے حد قابل ستائش ہے۔'' (۳۳)

اسماعیل میرٹھی نے پرانے موضوعات کو نئے انداز سے پیش کیا۔ ان کی نظموں میں بچوں سے گفتگو کا انداز ملتا ہے، اس لئے ان کی نظمیں اسکول میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس قسم کے نظموں میں ''جگنو اور بچہ''، ''ماں اور بچہ''، ''ایک گدھا شیر بنا''، ''ناقدردانی''، ''ملمع کی انگوٹھی''، ''ایک لڑکا اور بیر''، ''پن چکی''، ''کچھوا اور خرگوش''، ''دال کی فریاد''، ''جاڑا اور گرمی''، اور ''دال اور چپاتی'' ان کی فنکارانہ مہارت کی روشن مثالیں ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد شاعری کا رخ موڑنے والے شاعروں میں اکبرالہ آبادی ایک منفرد اسلوب کے شاعر ہیں۔ ان کی تخلیقات قابل توجہ ہیں، اگر چہ انہوں نے خاص طور پر بچوں کے لئے نظمیں نہیں لکھی تھیں لیکن مزاحیہ رنگ و روپ کی وجہ سے اُن کی کچھ نظمیں بچوں کی دنیا میں بھی مقبول ہوئیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر خوشحال زیدی کی یہ رائے درست ہے:

''ہر چند کہ شعوری طور پر اکبرالہ آبادی نے بچوں کے لئے قلم نہیں اٹھایا لیکن ان کی نظموں میں سے چند اپنے مزاج، نوعیت اور ظریفانہ انداز کی وجہ سے بچوں میں مقبول ہوئیں۔'' (۳۴)

ان چند نظموں کی وجہ سے ادبِ اطفال میں اکبرالہ آبادی کا تذکرہ بھی ہو جاتا ہے۔ دوسرے دور میں علامہ اقبال کی شمولیت سے ادبِ اطفال کا دامن نہ صرف وسیع ہوا بلکہ بچوں کے ادب کی ضرورت، اہمیت اور افادیت بھی دو چند ہو گئی۔ اقبال کی شاعری منفرد اور با مقصد تھی۔ ان کا فلسفہ اور شاعری کا مقصد بچوں کے ادب میں اس شان سے آیا کہ بچوں کے ادب کی بنیادی ضرورتوں کا خیال بھی رکھا گیا اور مقاصد بھی حاصل کیے گئے۔

محترمہ زیب النساء بیگم اپنی کتاب میں اقبال کو یوں خراج تحسین پیش کرتی ہیں:

''اقبال کا پیغام حیات ہی دراصل نئی نسل سے ان کے تعلق کو استوار کرتا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انقلاب کی کشمکش سے بھرپور زندگی قوموں کی بقا و ارتقا کی ضمانت اور انقلاب سے محروم زندگی موت کا پیغام ہوتی ہے۔'' (۳۵)

یہی پیغام اقبال کی بچوں کے لئے کی گئی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ چونکہ اقبال نے شاعری سے اصلاحِ امت کا کام لیا اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے، اس لئے بچوں کے لئے شاعری کرتے وقت بھی ان کا نظریہ شعر یہی تھا کہ بچوں میں خودی، خودداری، ہمدردی، انسان دوستی اور فطرت سے محبت کے جذبات ابھارے جائیں۔ اقبال نے اس دور کے حالات کے مطابق بچوں کی تربیت کے عمل میں شاعری سے کام لیا۔ اقبال کی عظمت یہ بھی ہے کہ انہوں نے دوسرے شاعروں کے

برعکس بچوں کی شاعری کو زیادہ توجہ دی۔ مرزا ادیب اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''کیا بڑا شاعر وہی ہو سکتا ہے، جس نے بالغ لوگوں کے لئے شاعری کی ہو اور اس نسل کو نظرانداز کر دیا ہو جو عہد طفلی میں سے گزر رہی ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں یہی نظریہ رائج ہے۔ ہمارے کئی شاعروں نے بڑوں کے لئے بھی شاعری کی ہے اور بچوں کے لئے بھی، ان میں علامہ اقبال بھی ہیں۔'' (۳۶)

اقبال نے ''بانگ درا'' میں آٹھ نظمیں بچوں کے لیے لکھیں، ان نظموں سے اقبال کی بصیرت جھلکتی ہے۔ نظموں کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ایک مکڑا اور مکھی (۲) ایک پہاڑ اور گلہری (۳) ایک گائے اور بکری (۴) بچے کی دنیا (۵) ہمدردی
(۶) ایک پرندہ اور جگنو (۷) پرندے کی فریاد (۸) ہندوستانی بچوں کا گیت (میرا وطن)

ان نظموں میں پہلی چھ نظمیں انگریزی سے لی گئی ہیں اور آخری دو اُن کی اپنی تخلیق کردہ ہیں، تاہم اقبال کا کمال دیکھیے کہ انہوں نے ماخوذ نظموں کو بھی طبع زاد نظموں جیسی روانی دی ہے اور ان نظموں میں مقبولیت کی خوبی پیدا کی ہے۔

اقبال کی شاعری میں مقصدیت اہم جوہر ہے۔ عبدالقوی دسنوی اپنی کتاب میں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''وہ بچے کے ذہن کی تعمیر اس طرح کرنا چاہتے تھے جس سے وہ ایسا انسان بن سکے جو خدا آگاہ ہو، صداقت شعار ہو، حریت پسند ہو، ہمدرد مجسم ہو، غرور و تکبر کی لعنت سے پاک ہو، حسن شناس ہو، خدمت گزار ہو، غریبوں کا مددگار ہو، کمزوروں کا حامی ہو، وطن پرست ہو، انسان دوست ہو، برائیوں سے پاک ہو اور پیکر عمل ہو''۔ (۳۷)

اقبال کی نظم ''ایک مکڑا اور مکھی'' میں بچوں کو خوشامد پسندی کے نقصانات بتائے گئے ہیں۔ ''پہاڑ اور گلہری'' میں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ دنیا میں کوئی شے حقیر اور ناکارہ نہیں۔ ''ایک گائے اور بکری'' میں نیکی کے بدلے نیکی کا پیغام دیا ہے۔ ''بچے کی دعا'' بے مثال نظم ہے، جو پڑھتے ہی دل پر اثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی نے اس نظم کی تعریف یوں کی ہے:

''بچے کی دعا'' اردو میں بچوں کے لئے لکھی گئی مقبول ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اس کی مقبولیت کا راز اس کے تاثر میں پوشیدہ ہے۔'' (۳۸)

نظم ''ہمدردی'' میں دوسروں سے ہمدردی کو بہترین خوبی قرار دیا گیا ہے۔ ''ایک پرندہ اور جگنو'' بھی تاثیر میں بے مثال ہے۔ ''ایک پرندہ اور جگنو'' اور ''پرندے کی فریاد'' میں بھی یہی پیغام دیا گیا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی بچوں کے لئے شاعری کو ان لفظوں میں سراہا ہے:

''اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے اقبال کو بڑی دلچسپی تھی۔ بچوں کی ذہنی تربیت کے لئے انہوں نے ایسے مضامین لکھے ہیں جنہیں پڑھ کر قوم بچوں کی خودی کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے۔'' (۳۹)

اقبال کو بچوں میں جو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے ایسے عنوانات اور ایسے موضوعات منتخب کیے ہیں جو بچوں کے دل میں جاگزیں ہیں، جنہیں وہ جانتے بوجھتے اور سمجھتے ہیں۔

بیسویں صدی، اردو میں بچوں کے ادب کے لئے ایک اہم سنگ میل ثابت ہوئی۔ خیال و انداز بیان کے نئے دروازے کھلے۔ ادب کے ساتھ ساتھ بچوں کی ادبی صحافت بھی پروان چڑھنے لگی۔ بچوں کے رسائل، اخبارات کے صفحات پر بچوں کے لئے تحریریں شائع ہونے لگیں۔ چھپائی کی سہولیات اور جدید تعلیم کی ترقی نے بچوں کے ادب کے لئے نئے مواقع پیدا کیے۔ اس صدی میں شاعری اور نثر کے میدانوں میں کئی بڑے شاعروں اور کہانی کاروں نے جنم لیا اور کئی اصناف نے ترقی کے راستے پر تیزی سے سفر شروع کر کے ادبِ اطفال کو معاشرے کی ناگزیر ضرورت بنا دیا۔ اس تناظر میں پروفیسر ڈاکٹر معین الدین لکھتے ہیں:

> ''بچوں کے ادب کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہو چکا تھا۔ لیکن بیسوی صدی میں اس کی تخلیق و اشاعت کا کام بہت تیزی سے شروع ہوا اور بچوں کے لئے عمدہ کتابیں شائع ہونے لگیں۔'' (۴۰)

اس صدی میں بچوں کے جن ادیبوں نے مقبولیت حاصل کی، ان میں چند ادیبوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ دیگر ادیبوں میں منشی پریم چند، تلوک چند محروم، حامد اللہ افسر، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، امتیاز علی تاج، چراغ حسن حسرت، کرشن چندر، صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، شفیع الدین نیرّ، خاطر غزنوی، نسبتاً رجحان ساز تخلیق کار کے طور پر ادب اطفال سے وابستہ رہے۔ اس صدی میں تقسیم ہندوستان کے بعد بھارت اور پاکستان کی شکل میں ادبِ اطفال کے دو نئے مراکز وجود میں آئے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو افسانے نے پریم چند کے روپ میں صاحب اسلوب افسانے نگار کے ذریعے اپنی بنیاد مضبوط کی۔ پریم چند کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے بچوں کے ادب میں بھی طبع آزمائی کی۔ بقول ڈاکٹر محمود الرحمان:

> ''پریم چند اردو کے بہت بڑے افسانہ نگار تھے ان ہی کے ہاتھوں اردو افسانہ نگاری کا چراغ روشن ہوا۔ ایک اعلیٰ مقام پر متمکن ہونے کے باوجود انہوں نے بچوں کے ادب سے غفلت نہیں برتی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جن ادیبوں نے بچوں کی کہانیوں کی جانب اپنی توجہ مبذول کی ان میں منشی پریم چند سرفہرست ہیں۔'' (۴۱)

اردو میں پریم چند کی کہانیاں انڈیا اور پاکستان کے اسکولوں کے نصاب میں بھی شامل ہیں جو ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ ان کی کہانیاں ''نادان دوست''، ''عبرت''، ''ایفائے عہد''، ''دست پناہ'' اور ''طلوع محبت'' وغیرہ بچوں کے مزاج

کے مطابق دیہات کے ماحول، جذبات نگاری اور اخلاقی پیغام کے زیرِ اثر ہیں۔تلوک چند محروم کی نظموں کے دو مجموعے ''بہار طفلی'' اور ''بچوں کی دنیا'' بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود مدرس رہے اور انہیں براہِ راست بچوں کا مشاہدہ کرنے کے مواقع نصیب ہوئے۔ حامد اللہ افسر نے بھی معلم کی حیثیت سے بچوں کی نفسیات کو پرکھا اور نظم ونثر میں بچوں کے لئے مثبت تفریح کا اہتمام کیا۔ بقول ڈاکٹر نوید الحسن ہاشمی:

> ''بچوں کے لئے جو کہانیاں یا نظمیں انہوں نے لکھی ہیں، اس میں انہیں کامیابی اس لئے ہوئی کہ خود اُن کی طبیعت میں ایک طرح کی معصومیت تھی جو انہیں بچوں کے احساسات کے قریب کر دیتی تھی۔ وہ ان چھوٹی موٹی چیزوں پر بھی لکھنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے جو بچوں کے لئے اہمیت رکھتی ہیں۔'' (۴۲)

حامد اللہ افسر اپنے دور کے تقاضوں سے باخبر شاعر تھے۔ اس لئے انہوں نے جذبہ حب الوطنی کے جذبات کو فروغ دیا۔ ان کی نظموں کے دو مجموعے ''بچوں کا افسر'' اور ''گہوارے کا گیت'' چھپ چکے ہیں۔ حفیظ جالندھری نے بھی بیسویں صدی کے ادبِ اطفال کو شاعری کا حسن بخشا۔ انہوں نے بڑوں کے لئے لکھی گئی شاعری کی مہارت سے بچوں کے لئے نظمیں لکھیں۔ ان کی نظموں میں موسیقیت اور مترنم الفاظ کے اثرات بچوں کو عمدہ تفریح دیتی ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سیدہ مشہدی اپنی کتاب میں یوں لکھتی ہیں؛

> ''ان (حفیظ جالندھری) کی کہانیاں اور نظمیں اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ انہوں نے کائنات اور مظاہر کائنات کو بچوں کی نگاہ سے دیکھا اور انہیں اپنی نقطہ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی اور وہ بچوں کی نفسیات، ان کی کیفیات، ان کے مزاج اور ان کی پسند و ناپسند سے بخوبی آشنا تھے۔'' (۴۳)

حفیظ جالندھری کا بچوں کے ادب پر ایک احسان یہ بھی ہے کہ انہوں نے پہلی بار اردو کی قدیم کہانیوں کو بچوں کے لئے آسان فہم زبان میں لکھا۔ ''بدر بادشاہ'' اور ''جواہر شہزادی'' اس سلسلے کی مثالی تحریریں ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے ''بہار کے پھول'' اور ''پھول مالا'' وغیرہ کے نام سے یادگار نظموں کے مجموعے چھوڑے۔ کرشن چند نے ادبِ اطفال کو ''الٹا درخت'' کے نام سے پہلا ناول دیا۔ اس ناول کا حسن یہ ہے کہ یہ اپنی شاعرانہ نثر کی وجہ سے بچوں کے ذوق کی آبیاری کرتا ہے۔ بچوں ہی کے لئے ان کا ناول ''ایک گدھے کی سرگزشت'' بھی مزے کی تخلیق ہے۔ اختر شیرانی نے بھی بڑوں کے ادب کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب میں بھی طبع آزمائی کی۔

ڈاکٹر یونس حسنی اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں:

> ''پھولوں کے گیت'' اُن کی ایسی نظموں کا مجموعہ ہے جو بچوں اور بچیوں کے لئے بھی لکھی گئی ہے۔ ان نظموں میں مناظر فطرت، قدرت کی پیش کش، وطن دوستی، کھیل کود، سبق آموزی سبھی کچھ ہے۔'' (۴۴)

ان کی نظمیں ''شب برات''، ''ہوائی جہاز''، ''گھڑی''، ''نئے سال پر بھی'' اور ''برسات'' میں بچوں کے لئے شاعری کے خوب صورت نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

امتیاز علی تاج نے کہانی پن کو مہارت کے ساتھ نبھایا۔ ''روپے کا غلام'' ان کی خوب صورت کہانی ہے جو دلچسپی اور تفریح کے لحاظ سے یادگار کہانی ہے۔ چراغ حسن حسرتؔ نے ادب و صحافت کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب کو بھی یادگار تحریریں دی ہیں۔ انہوں نے پرانی اور تاریخی کہانیوں کو نئے انداز سے لکھا۔ غلام مصطفیٰ صوفی تبسم وہ ادیب ہیں جنہوں نے بچوں کے ادب کو نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کیا۔ اس باب میں ڈاکٹر نثار احمد قریشی اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں:

> ''بچوں کے شاعر کی حیثیت سے صوفی صاحب اپنے پیشرو اور ہم عصر شعرا میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ موضوع اور زبان دونوں کے اعتبار سے بچوں کے لئے ان کی شاعری پر کشش اور دلفریب ہے۔ ان کی نظموں کا بہتر حصہ مزاحیہ ہے۔ مزاح و زندہ دلی کے اعتبار سے خود صوفی صاحب کی شخصیت ان نظموں میں بڑی حد تک جلوہ گر ہے۔'' (۴۵)

صوفی تبسم نے بچوں کے لئے نظم نگاری میں ''ٹوٹ بٹوٹ'' کا کردار متعارف کرایا۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کی لاری'' اور ''گپ شپ'' بچوں کے لئے دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ بچوں کے لئے اُن کا مجموعہ ''جھولنے'' شوخی اور زندہ دلی کا خوب صورت پیکر ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ احمد ندیم قاسمی کی کہانیاں بھی بچوں کے ادب میں عمدہ اضافہ ہیں۔ وہ بچوں کے رسالے ''پھول'' کے مدیر بھی رہے۔ ان کی قابلِ ذکر کہانیوں میں ''چوہوں کی بارات''، ''میاں ہدہد'' اور ''شرارت'' شامل ہیں جس میں انہوں نے بچوں کے لئے اعلیٰ شاعری پیش کی۔ ان کی نثری تحریروں میں ''جلیبیاں'' اور ''ننھے نے سلیٹ خریدی'' ایسی کہانیاں ہیں جو کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کے اُصولوں پر پوری اُترتی ہیں۔ مرزا ادیب بچوں کے ادب سے بطور مدیر، محقق، نقاد، ڈرامہ نگار اور کہانی نویس کے وابستہ رہے ہیں۔ ''بی بی فاختہ اُڑتی جاتی''، ''میں تمہارا دوست''، ''یہ نہیں ہوگا'' میں تجسس اور کردار نگاری کے خوب صورت نمونے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے مطابق:

> ''شفیع الدین نیئر کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی بچوں کے ادب کے لئے وقف کی تھی۔ ان میں بچوں کے ذہن کو سمجھنے اور ان سے محبت کرنے کی وہ صفت ہے جو پیدائشی معلم کا جوہر ہوتی ہے۔'' (۴۶)

ان کی نظموں میں آسان اور سلیس انداز میں بچوں کو تفریح فراہم کی گئی ہے۔ ''بچوں کا تحفہ'' اور ''اخلاقی نظمیں'' ان کی یادگار کتابیں ہیں۔

اکیسویں صدی تک آتے آتے ادبِ اطفال نے ترقی کی کئی منزلیں طے کی۔ جدید ایجادات، اظہار کے مواقعوں اور شعبہ دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اکیڈمی ادبیات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد جیسے سرکاری اداروں اور

ادبی انجمنوں نے بھی بچوں کے ادب کی رفتار کو آگے بڑھایا اور نئے امکانات کے دروازے کھولے۔ تعلیم کی شرح بڑھنے اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے قیام نے بھی ادبِ اطفال کو بچوں کے لئے دلچسپی کا مرکز بنایا، تاہم اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ اردو میں بچوں کے ادب کو عالمی ادبِ اطفال کے مقابل لانے کے لئے نئے منصوبوں اور سرکاری توجہ و سرپرستی کی اشد ضرورت ہے۔

پاکستان میں ادبِ اطفال کی تازہ صورتحال پر نظر ڈالی جائے تو کراچی اور لاہور سے بچوں کے رسائل نکل رہے ہیں۔ بچوں کے نئے ادیبوں میں اختر عباس، محمد شعیب مرزا، علی اکمل تصور، مزمل صدیقی، جدون ادیب، محبوب الٰہی مخمور، ڈاکٹر افضل حمید، نذیر انبالوی، ناصر زیدی، نور محمد جمالی، کلیم چغتائی، احمد حاطب صدیقی، سید صفدر رضا، محمد بن قاسم، منیر احمد راشد، محمد فہیم عالم، محمد ندیم اختر، کاشف بشیر کاشف، محمد ادریس قریشی، اویس یوسف زئی اور احمد عدنان طارق ادبِ اطفال کے دامن کو وسعت دے رہے ہیں۔ آج کا ادبِ اطفال اپنے اندر ایک اچھا خاصا تنوع رکھتا ہے اور اُمید ہے کہ اِس کا مستقبل بھی روشن ہوگا، بشرطیکہ اسے شجاعت علی راہی جیسے سنجیدہ شاعر و ادیب کی توجہ ملتی رہے، جنھوں نے طویل عرصے تک ادبِ اطفال کے ساتھ اپنے تعلق کو نبھایا اور آج بھی ان کا قلم ادبِ اطفال کی روایت کو آگے بڑھانے میں پوری طرح متحرک نظر آتا ہے۔

۴۔ خیبر پختون خوا میں بچوں کا ادب:

اُردو کے دیگر مراکز کی بہ نسبت خیبر پختون خوا میں بچوں کے ادب کی روایت اتنی زیادہ قدیم نہیں اور نہ ہی اتنی شاندار ہے کہ اسے اطمینان بخش قرار دیا جا سکے۔ انفرادی سطح پر کئی ادیبوں نے بغیر کسی حکومتی سرپرستی کے پاکستان بھر میں اپنی پہچان کرائی اور خیبر پختون خوا کی نمائندگی کی۔ اس ضمن میں پروفیسر گوہر رحمن نوید اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں:

> ''ملک کی دیگر حصوں کی طرح صوبہ سرحد میں بھی بچوں کا ادب تخلیق کرنے کی روایت موجود ہے لیکن یہ قدرے کمزور اس لئے ہے کہ ہمارے ہاں پہلے پہل بچوں کی تربیت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی۔'' (۴۷)

اس حوالے سے پروفیسر ڈاکٹر نواز طائر کی رائے ہے:

> ''سرحد میں ابتداء میں بچوں کا تخلیقی ادب بلکہ تحریری ادب بہت بعد میں شروع ہوا اُس کی دو وجوہات بہت اہم ہیں، پہلی یہ کہ یہاں تعلیم کی کمی ہے۔ بچوں کے لئے ادب وہاں تحریر ہوتا ہے جہاں اُس کے پڑھنے والے موجود ہوں۔ جہاں پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ موجود نہ ہو وہاں کس کے لئے ادب لکھا جائے، دوسری اہم وجہ وسائل کی کمی ہے۔'' (۴۸)

خیبر پختون خوا کے معروف نقاد و محقق پروفیسر ڈاکٹر عرفان اللہ خٹک بھی اس رائے سے متفق ہیں۔ اُنہوں نے راقمہ کو اپنے ایک مصاحبے میں بتایا:

> ''بچوں کے ادب کی تاریخ میں خیبر پختون خوا کا حصہ بہت کم ہے اس کی کئی وجوہات ہیں، لیکن پھر بھی یہ

غنیمت ہے کہ قدیم وجدید دور کے کئی ادیبوں نے اس کمزور روایت کو مضبوط بنانے کی کوشش کی جن میں رضا ہمدانی، محسن احسان، خاطر غزنوی، شجاعت علی راہیؔ، ڈاکٹر اسحاق وردگ، رئیس احمد مغل اور ارشد سلیم جیسے اہل قلم کی خدمات کا اعتراف ضروری ہے۔"(۴۹)

نوشین ودود نے بھی اپنے ایم۔اے کے تحقیقی مقالے میں خیبر پختون خوا میں ادبِ اطفال کی کمزور روایت کا تذکرہ یوں کیا ہے:

"صوبہ سرحد میں بچوں کا ادب اتنا توانا نہیں ہے، جتنا باقی ادب۔ اس کی بنیادی وجہ یہ رہی ہے کہ صوبہ سرحد میں بچوں کی مادری زبان اُردو نہیں تھی اور یہاں کے بیشتر بچوں کو اُردو زبان کی سمجھ نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کے لئے جتنا تخلیق کیا گیا، وہ اُن کی مادری زبان میں تھا، مگر بڑے بچوں کے لئے ادیبوں نے ادب تخلیق کیا"۔(۵۰)

خیبر پختون خوا میں بچوں کے ادب کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ قدیم دور ۲۔ جدید دور

قدیم دور سے وابستہ ادیبوں میں رضا ہمدانی، محسن احسان، خاطر غزنوی، احسان طالب اور شجاعت علی راہیؔ وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ جدید دور میں ڈاکٹر اسحاق وردگ، رئیس احمد مغل، فیاض احمد فیضی، اصغر علی خان، شاہد انور شیرازی، اختر منیر، احسان الحق حقانی، عمران یوسف زئی، ارشد سلیم، نجیب اللہ ہمدرد اور عبداللہ ادیب جیسے لکھاری شامل ہیں۔

رضا ہمدانی خیبر پختونخوا کے ابتدائی دور کے ادب اطفال کے نمائندہ قلم کار ہیں۔ انہوں نے بڑوں، بچوں اور خواتین ہر مکتبہ فکر کے لئے یکساں طور پر لکھا۔ بچوں کے لئے انہوں نے گلی محلے میں بچوں کے ساتھ گھل مل کر اُن کی نفسیات اور دلچسپیوں کا جائزہ لے کر لکھا۔ رضا ہمدانی کی بچوں کے لئے لکھی گئی مختلف کہانیاں ابتداء میں کتابچوں کی صورت میں "کہانیاں ہی کہانیاں" کے عنوان سے چھپی۔ بعدازاں لوک ورثے کے قومی ادارے نے دسمبر ۱۹۷۹ء میں کچھ ضروری ترامیم کے ساتھ یہ کتاب "بچوں کی کہانی" کے نام سے شائع کی۔ اس مجموعے میں کل باون کہانیاں ہیں جو بچوں کی نفسیات، رجحانات اور میلانات کے مطابق ہیں۔ ان میں بچوں کے لئے تفریح اور اصلاح کا پہلو ساتھ ساتھ پایا جاتا ہے۔

رضا ہمدانی کی بچوں کے لئے لکھی گئی کہانیوں میں "جگنومیاں کی کہانی"، "طوطا مینا کی کہانی" اور "فاختہ کی کہانی" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ پروفیسر گوہر رحمان نوید رضا ہمدانی کی کہانی "جگنومیاں کی کہانی" کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رضا ہمدانی کی بچوں کے لئے لکھی گئی تحریروں میں "جگنومیاں کی کہانی" ایک سبق آموز کہانی ہے اور باتوں باتوں میں کہانی کار نے اپنا نقطۂ نظر اچھے طریقے سے واضح کیا ہے۔"(۵۱)

رضا ہمدانی نے نثری خدمات کے علاوہ بچوں کے لئے شاعری بھی کی۔جس میں ''تاروں بھری رات''، ''پاکٹ منی''، ''نونہال'' اور کئی دوسری نظمیں شامل ہیں۔

محسن احسان پاکستان کے ایک معروف شاعر، ادیب اور ماہر تعلیم تھے۔اُن کا تعلق پاکستان کے صوبے خیبر پختونخوا سے تھا۔اُنھوں نے اردو ادب کی آبیاری میں اپنی قابل قدر خدمات انجام دیں۔اُن کے کئی شعری مجموعے چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔اُنھوں نے بچوں کے لئے بھی شاعری کی اور اُن میں جذبہ حب الوطنی کو بیدار کرنے کے لئے ''ترانہ'' لکھا جس کے کچھ اشعار دیکھیے:

''اے وطن ، میری آنکھوں کے تارے وطن
اے وطن، اے وطن میرے پیارے وطن

تیرے ذروں میں خورشید کی روشنی
تیرے پھولوں میں مہتاب کی چاندنی

تیرے دریاؤں میں ناچتی زندگی
اے وطن ، میری آنکھوں کے تارے وطن
اے وطن، اے وطن میرے پیارے وطن'' (۵۲)

پہلے دور کے نمائندہ ادیبوں میں ایک نام خاطر غزنوی کا بھی ہے، جنھوں نے بچوں کے لئے نظم و نثر دونوں میں طبع آزمائی کی اور خیبر پختون خوا میں ادب اطفال کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔اس تناظر میں ڈاکٹر اسحاق وروگ اپنے پی۔ایچ۔ڈی مقالے میں لکھتے ہیں:

''خاطر غزنوی کی تخلیقی شخصیت کا ایک بھرپور حوالہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے خصوصی توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ بچوں کے ادب میں بھی طبع آزمائی کی اور شاعری، معلوماتی مضامین، اور پہیلیوں کی صورت میں دامن ادبِ اطفال کو وسعت عطا کی۔'' (۵۳)

''خاطر غزنوی نے بچوں کے لئے پوری انہماک سے شاعری کی۔اس ضمن میں ان کی نظموں کا مجموعہ ''ننھی منی نظمیں'' ادبِ اطفال میں قابل قدر اضافہ ہے۔یہ مجموعہ بچوں کی نفسیات اور فہم و ادراک کی صلاحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کمال خوبی سے تخلیق کیا گیا ہے کہ یہ بطریق احسن جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ (۵۴)

ممتاز شاعر جمیل الدین عالی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''زیر نظر کتاب کے مصنف اردو کے مشہور شاعر جناب خاطر غزنوی ہیں۔ اُنہوں نے خوب صورت نظمیں لکھتے وقت بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ نظمیں دلچسپ بھی ہیں اور ان کا مطالعہ بچوں کی معلومات خصوصاً ذخیرہ الفاظ میں اضافے کا باعث بھی ہوگا۔'' (۵۵)

''ننھی منی نظمیں'' میں شامل ''گنتی''، ''دس چوزیں''، ''آوازیں''، ''جنگل میں منگل'' اور ''کاغذ'' خاطر غزنوی کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں بچوں کو تفریح کے ساتھ ساتھ تعلیمی تربیت بھی دی گئی ہے۔ اس تناظر میں پروفیسر گوہر رحمان نوید کی رائے ملاحظہ ہو:

''خاطر غزنوی نے بچوں کے لئے منظوم کتابیں لکھیں۔ جن میں منظوم کہانیاں، تدریسی نظمیں اور پہیلیاں شامل ہیں۔'' (۵۶)

خاطر غزنوی کی نظموں کی خصوصیات سمجھنے کے لئے ان کی نظم گنتی سے یہ ٹکڑا دیکھیے، جس میں انہوں نے چھوٹے بچوں کو گپ شپ کے انداز میں گنتی سکھائی ہے:

ایک اکن ایک
ماموں لایا کیک

دو اکن دو
امی اتو لو

تین اکن تین
چچا گیا چین (۵۷)

خاطر غزنوی کی نظموں کا مزاج بچوں کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ انہوں نے بڑی باریک بینی سے بچوں کے مزاج اور ان کی دلچسپیوں کا مشاہدہ کیا ہے اور اس کو پیش نظر رکھ کر نظمیں تخلیق کی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی نظم ''دس چوزے'' تفریح کے ساتھ ساتھ نصیحت کے حوالے سے بھی اچھی نظم ہے۔ ڈاکٹر اسحاق وردگ اس نظم کی توصیف میں لکھتے ہیں:

''دس چوزے'' بھی اپنی اوصاف کی حامل نظم ہے۔ جہاں بچوں کو گنتی کے ساتھ ساتھ جمع منفی، کا حسابی قاعدہ بھی دلچسپی سے سکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضمنی طور پر بچوں کو غیر محسوس طریقے سے ہر درس ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ جو بچے ماں کی اجازت کے بغیر باہر نکلتے ہیں وہ نقصان اٹھاتے ہیں۔' (۵۸)

''خاطر غزنوی نے جہاں بچوں کے لئے دلچسپ نظمیں کہی ہیں، وہیں وہ نثر میں بھی طبع آزمائی کرتے

رہے۔ شاعری کے مقابلے میں ان کی نثری تحریریں کم ہیں۔ تاہم اس مختصر سرمائے میں بھی بچوں کی
تعلیم وتربیت کا واضح سامان موجود ہے۔"(۵۹)

احسان طالب نے فکشن کے میدان میں قلم آزمائی کی اور ادبِ اطفال کو "شیر بچہ" کے نام سے ایک ناولٹ دیا۔ جس میں ناولٹ نگاری کے جوہر خوب صورتی سے ملتے ہیں۔

آخر میں اسی دور سے تعلق رکھنے والے شاعر وادیب شجاعت علی راہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اُنہوں نے ادبِ اطفال کو قدیم و جدید دونوں ادوار میں اپنی بہترین تخلیقات سے نوازا۔ بچوں کے لئے اُن کی شاعری کا مجموعہ "زمزم شگوفے" ۱۹۸۳ء طفیل آرٹ پرنٹرز کی وساطت سے شائع ہوا۔ اِس مضمون میں کل آٹھارہ نظمیں ہیں جو بچوں کی استعداد، عمر اور دلچسپیوں کو مدِ نظر رکھ کر تخلیق کی گئی ہیں۔ بچوں کے لئے "ہوائی جہاز" کے نام سے لکھی گئی نظم میں جہاز کے اُڑنے کی آواز اور انداز کو راہیؔ خوب صورت الفاظ میں منظر کشی کرتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں:

گھر گھر بولے، غر غر بولے
اُڑنے کو جب یہ پَر تولے
پُھر پُھر پُھر پُھر ناک گھمائے
اُڑتا جائے ، شور مچائے"(۶۰)

شجاعت علی راہیؔ چونکہ طویل عرصے تک جدہ میں ملازمت سے منسلک رہے تو اس دوران ادبِ اطفال سے عارضی طور پر اُن کا رشتہ منقطع ہوگیا، اِس لئے اُن کی مزید کتابیں منظر عام پر نہ آسکیں، لیکن بعد ازاں اُنہوں نے ادبِ اطفال کو ایک خاص مشن کے طور پر اپنا کر اس کمی کو پورا کر دیا۔ جس کے نتیجے میں جدید دور میں بچوں کے لئے اُن کی تخلیقات کی ایک لمبی فہرست نظر آتی ہے جن میں پانچ شعری مجموعے بارہ ناولٹ، دو کہانیوں کے مجموعے اور دو ڈرامے شامل ہیں۔ اِن میں سے بیشتر کتابیں باقاعدہ طور پر چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں، تاہم اُن کا یہ تخلیقی سفر ہنوز جاری ہے۔

پہلے دور کے ان نمائندہ ادیبوں کے علاوہ جن اہلِ قلم نے خیبر پختونخوا میں ادبِ اطفال کی روایت کی بنیادیں مضبوط کیں، ان میں کلیم خارجی، ایم ایس آرزو، ڈاکٹر اعجاز راہیؔ، منور رؤف اور نصرت نسیم کا ذکر بھی ضروری ہے کہ انہوں نے ادبی مراکز سے دور پختونخوا میں اردو ادبِ اطفال کی آبیاری کی۔

نوے کی دہائی میں خیبر پختونخوا میں اردو ادبِ اطفال کے جدید دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دہائی میں جواں سال اہلِ قلم نے پاکستان کے معروف بچوں کے رسائل میں لکھنے کا آغاز کیا اور بہت جلد ہی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوا کر

رہے۔ شاعری کے مقابلے میں ان کی نثری تحریریں کم ہیں۔ تاہم اس مختصر سرمائے میں بھی بچوں کی تعلیم وتربیت کا واضح سامان موجود ہے۔'' (۵۹)

احسان طالب نے فکشن کے میدان میں قلم آزمائی کی اور ادب اطفال کو ''شیر بچہ'' کے نام سے ایک ناولٹ دیا۔ جس میں ناولٹ نگاری کے جوہر خوب صورتی سے ملتے ہیں۔

آخر میں اسی دور سے تعلق رکھنے والے شاعر وادیب شجاعت علی راہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اُنہوں نے ادب اطفال کو قدیم و جدید دونوں ادوار میں اپنی بہترین تخلیقات سے نوازا۔ بچوں کے لئے اُن کی شاعری کا مجموعہ ''بزم شگوفے'' ۱۹۸۳ء طفیل آرٹ پرنٹرز کی وساطت سے شائع ہوا۔ اِس مضمون میں کل اٹھارہ نظمیں ہیں جو بچوں کی استعداد، عمر اور دلچسپیوں کو مدِ نظر رکھ کر تخلیق کی گئی ہیں۔ بچوں کے لئے ''ہوائی جہاز'' کے نام سے لکھی گئی نظم میں جہاز کے اُڑنے کی آواز اور انداز کو راہیؔ خوب صورت الفاظ میں منظر کشی کرتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں:

گھر گھر بولے، غر غر بولے
اُڑنے کو جب یہ پَر تولے
پُھر پُھر پُھر پُھر ناک گھمائے
اُڑتا جائے ، شور مچائے'' (۶۰)

شجاعت علی راہیؔ چونکہ طویل عرصے تک جدہ میں ملازمت سے منسلک رہے تو اس دوران ادب اطفال سے عارضی طور پر اُن کا رشتہ منقطع ہو گیا، اِس لئے اُن کی مزید کتابیں منظر عام پر نہ آ سکیں، لیکن بعد ازاں اُنہوں نے ادب اطفال کو ایک خاص مشن کے طور پر اپنا کر اس کمی کو پورا کر دیا۔ جس کے نتیجے میں جدید دور میں بچوں کے لئے اُن کی تخلیقات کی ایک لمبی فہرست نظر آتی ہے جن میں پانچ شعری مجموعے بارہ ناولٹ، دو کہانیوں کے مجموعے اور دو ڈرامے شامل ہیں۔ اِن میں سے بیشتر کتابیں باقاعدہ طور پر چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں، تاہم اُن کا یہ تخلیقی سفر ہنوز جاری ہے۔

پہلے دور کے ان نمائندہ ادیبوں کے علاوہ جن اہل قلم نے خیبر پختونخوا میں ادبِ اطفال کی روایت کی بنیادیں مضبوط کیں، ان میں کلیم خارجی، ایم ایس آرزو، ڈاکٹر اعجاز راہیؔ، منور رؤف اور نصرت نسیم کا ذکر بھی ضروری ہے کہ انہوں نے ادبی مراکز سے دور پختونخوا میں اردو ادبِ اطفال کی آبیاری کی۔

نوے کی دہائی میں خیبر پختونخوا میں اردو ادبِ اطفال کے جدید دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دہائی میں جواں سال اہل قلم نے پاکستان کے معروف بچوں کے رسائل میں لکھنے کا آغاز کیا اور بہت جلد ہی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوا کر

ملک گیر شہرت حاصل کی۔اس تناظر میں پروفیسر گوہر رحمان نوید لکھتے ہیں:

''سرحد میں بچوں کا ادب تخلیق کرنے والے ادیبوں میں نوجوانوں کی جونئی کھیپ آئی ہے۔ان میں رئیس احمد مغل، اسحاق وردگ، فیاض اختر فیضی، اصغر علی خان، شاہد انور شیرازی، اختر منیر، احسان الحق، حقانی، عمران یوسف زئی، ارشد سلیم، نجیب اللہ ہمدرد، عبداللہ ادیب، نام اور کام دونوں لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ان نوجوانوں نے ملک بھر کے بچوں کے جرائد میں بہت لکھا اور خوب داد و تحسین پائی۔''(۶۱)

ان نوجوان ادیبوں کا کمال دیکھیے کہ انہوں نے خیبر پختونخوا میں ادب اطفال کی روشن روایت کو نیا خون دیا، ان کی تحریروں میں مطالعے، ریاضت اور مشاہدے کے اوصاف ان کی مہارت کے ثبوت ہیں۔

خیبر پختونخوا میں جدید ادب اطفال کا آغاز ڈاکٹر اسحاق وروگ سے ہوتا ہے۔انہوں نے ادب اطفال کی نثری و شعری اصناف کے دامن کو وسعت بخشی۔انہوں نے بچوں کے لئے لکھنے کا آغاز سکول کے زمانے سے کیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔پروفیسر گوہر رحمان نوید اپنی کتاب میں ڈاکٹر اسحاق وردگ کی خدمات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''محمد اسحاق وردگ بھی صوبہ سرحد میں ادب اطفال کے حوالے سے مستند و معتبر نام ہے۔انہوں نے بہت کم عمری میں اپنے قلم کے ذریعے پاکستان بھر کے نوجوان ادیبوں میں اپنی ایک الگ پہچان کرائی اور بہت سے اعزازات حاصل کیے۔جن میں دعوۃ اکیڈمی کی طرف سے اردو ادب میں نمایاں ادبی خدمات پر ''نشانِ اعزاز'' ایوارڈ شامل ہے۔''(۶۲)

حافظہ نورین فاطمہ اپنے تحقیقی مقالے ''اُردو میں بچوں کا ادب (اکیسویں صدی میں)'' میں ڈاکٹر اسحاق وردگ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''وہ خیبر پختونخوا کے پہلے اور تاحال واحد ادیب ہیں جنہیں ''نشانِ امتیاز'' سے نوازا گیا۔اُن کی ادبی خدمات پر اُنہیں کئی اسناد اور ایوارڈز دیے جاچکے ہیں۔حال ہی میں 'اشارہ ادبی' ایوارڈ ۲۰۱۶ء عطا کیا گیا۔وہ ان دنوں انجمن جدت پسند مصنفین پاکستان کے بانی صدر ہیں۔''(۶۳)

ڈاکٹر اسحاق وردگ نے نہ صرف ادبِ اطفال کی مختلف جہتوں میں تخلیقی سفر کیے ہیں بلکہ وہ ایک شاعر، کہانی کار، محقق، نقاد، مدیر اور مترجم کے طور پر بھی بچوں کے ادب سے وابستہ رہ چکے ہیں۔اس حوالے سے ادیب و کالم نگار وقار احمد اعوان لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اسحاق وردگ نے سکول کے زمانے ہی سے بچوں کے رسائل کے لئے کہانیاں اور نظمیں لکھنا شروع کیں۔ان کی قابلیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔کہ ۱۹۹۵ء میں شعبہ بچوں کا ادب، ''دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد'' نے بچوں کی بہترین کہانیوں کا انتخاب شائع کیا تو اس میں اسحاق وردگ کی کہانی بھی شامل تھی۔''(۶۴)

ڈاکٹر اسحاق وردگ کی نظموں اور کہانیوں میں ان کا نظریہ ادبِ اطفال تعلیم، تربیت اور تفریح کی صورت میں ملتا ہے۔

اس سلسلے میں ان کی کہانی ''معذور یا مجبور'' ایک روشن مثال ہے۔ یہ کہانی ایک معذور مگر خوددار بچے کی کہانی ہے جو معاشرے کے لئے ایک مثالی کردار بن کر اپنی معذوری کو راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دیتا۔ نوشین وددو اس کہانی کے تجزیے میں لکھتی ہیں:

> ''معذور یا مجبور'' کا مرکزی کردار معذور بچہ ہونے کے باوجود خودی کا پتلا ہے۔ جب دونوں جوانوں کی گاڑی کا شیشہ صاف کرنے کے لئے یہ بچہ لپکتا ہے تو نوجوان اسے منع کر دیتے ہیں، لیکن تھوڑی دیر بعد وہ دونوں جب اس بچے کی تصویر اتارنے کے بعد اسے دس روپے کا نوٹ تھما دیتے ہیں تو بچہ اسے حقارت سے پھینک دیتا ہے۔'' (۶۵)

اسحاق وردگ کی کہانیوں میں پاکستانیت بھی ایک اہم حوالہ ہے۔ ان کی کہانی ''ہم بھائی ہیں'' اِسی سلسلے کی اہم مثال ہے۔ یہ کہانی ماہنامہ ''چندا'' کراچی میں مارچ ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی۔ ''فرض'' کے عنوان سے ایک اور کہانی ''پیغام'' ڈائجسٹ لاہور میں شائع ہوئی۔

''تم کرن بنو'' میں بچوں کو مایوسی سے امید کی طرف لے جانے کی بھرپور سعی کی گئی ہے۔ گوہر رحمان نوید اس کہانی کی تعریف میں رقم طراز ہیں:

> ''تم کرن بنو' پاکستان کے حال سے مایوس اور مستقبل سے نااُمید نوجوانوں کی کہانی ہے۔ جب پروفیسر بابا ان کو سمجھاتا ہے تو نوجوانوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ان کی یاس آس میں بدل جاتی ہے۔'' (۶۶)
>
> ان کی دیگر کہانیوں میں ''چھوٹا'' میں ایک حساس مزدور بچے کی کہانی ہے۔ یہ کہانی خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ کی مرتب کردہ بہترین کہانیوں کے انتخاب ''پُرعزم بچے'' میں شامل ہے۔ (۶۷)

یاد رہے کہ خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور کے زیرِ اہتمام ان کی کتاب ''اور تتلیاں روٹھ گئیں'' بھی شائع ہو چکی ہے۔

بطور شاعر ڈاکٹر اسحاق وردگ نے جہاں بڑوں کے لئے نئے لہجے کی شاعری کی، وہاں بچوں کے ادب میں بھی ان کی نظمیں، بچوں کے لئے صحت مند تفریح کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ ان کی درج ذیل نظم اس سلسلے میں ایک روشن مثال کا درجہ رکھتی ہے:

رنگ برنگی تتلی

رنگ برنگی تتلی ہے — گلشن میں جو رہتی ہے
اس سے چمن کی زینت ہے — دل و نظر کی راحت ہے
بچو! تتلی بن کے رہو — بے رنگی میں رنگ بھرو
تم بھی تتلی جیسے ہو — دل کے چمن میں رہتے ہو
تم سے ہے رنگین جہاں — رہتے ہیں دل سب شاداں
تم بھی گھر کی زینت ہو — دل کا چین اور راحت ہو (۶۸)

غرض اسحاق وردگ نے ایسا عمدہ ادب تخلیق کیا ہے، جس میں بچوں کی تفریح کے جملہ سامان کے ساتھ درس وتدریس کے مقاصد کے تمام لوازمات کما حقہ موجود ہیں۔

رئیس احمد مغل بھی جدید ادبِ اطفال کے ایک اہم تخلیق کار ہیں۔ ان کی تحریریں زبان و بیان، موضوع اور پیش کش کے حوالے سے عمدہ تحریریں ہیں۔ رئیس احمد مغل کی تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر گوہر رحمان نوید لکھتے ہیں:

> ''رئیس کی کہانیاں بچوں کی اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ ان میں علم و ادب کی پیاس بڑھانے میں ہر طرح ممد و معاون ہیں۔'' (۶۹)

ان کی نمائندہ کہانیوں میں ''برساتی انکل''، ''بڑا بچپن''، ''چری کے پیچھے'' اور ''ہوا کی جیت'' وغیرہ ادبِ اطفال کے اعلیٰ معیار کے مطابق ہیں، جس میں کردار نگاری سے مکالمہ نگاری تک سلیقہ مندی کا اہتمام ملتا ہے۔

فیاض اختر فیضی بھی نوے کی دہائی کے نوجوان ادیبوں میں شامل ہیں۔ ان کی کہانی ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' میں ''پیاسا کوا'' کی کہانی کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی دیگر کہانیوں میں ''خزانے کا راز'' اور ''ایک خط'' اُن کی فنی پختگی کو ظاہر کرتی ہیں۔

اصغر علی خان نے بھی بچوں کے لئے اعلیٰ ادب تخلیق کرنے میں اپنی مثال قائم کی۔ اُنہیں دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد سے بچوں کے بہترین لکھاری کا انعام ملا۔ انہوں نے جماعت ہشتم سے ہی بچوں کے لئے لکھنا شروع کیا اور اُن کی کہانیاں ماہنامہ ''آنکھ مچولی''، ''بچوں کا رسالہ''، ''انوکھی کہانیاں'' اور ''مجاہد'' میں تواتر کے ساتھ چھپتی رہیں۔ اُن کی مشہور کہانیوں میں ''پاگل کون''، ''شامت کا مارا'' اور ''انسانی خلیے'' شامل ہیں۔

شاہد انور شیرازی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے ننھے ادیب کے طور پر بہت جلد شہرت کی بلندیوں کو چھوا اور بہت پذیرائی حاصل کی۔ اُنہوں نے مردان سے بچوں کا اخبار بھی جاری کیا اور بچوں کے لئے نظم و نثر دونوں میں طبع آزمائی کی۔ اُن کی مشہور کہانیاں ''انوکھا سبق''، ''ہاتھی کے دانت''، ''کمزور''، ''قصور کس کا''، ''ایک ہی ماں کے بیٹے''، ''عاصم اور پھول کہانی''، ''بلا عنوان''، ''روز اسی طرح تو ہوتا ہے'' کے عنوان سے مختلف رسائل و جرائد میں چھپیں۔ ان کی کہانیاں اپنی روانی اور آسان فہم اسلوب بیان کی خصوصیات سے مزین ہوتی ہیں۔ شیرازی نے بچوں کے لئے شاعری کر کے اپنے ہم عصروں میں اس حوالے سے انفرادیت حاصل کی۔ اپنی ایک نظم ''جی چاہتا ہے'' میں وہ سارے بچوں کی معصوم شرارتوں کو موضوع بناتے ہیں:

پٹاخے چلانے کو جی چاہتا ہے
ذرا مار کھانے کو جی چاہتا ہے

شرارت سے بنتے ہیں سب کام میرے
شرارت دکھانے کو جی چاہتا ہے

نہ رغبت ہے کوئی کتابوں سے مجھ کو
نہ اسکول جانے کو جی چاہتا ہے

پڑھائی کی بابت کوئی ڈانٹ سُن کر
بہانے بنانے کو جی چاہتا ہے'(۷۰)

اختر منیر نے ''انسان دشمن لوگ''، ''دوستی''، ''انوکھی مہمان نوازی''، ''واپسی'' اور ''مصالحہ دار روٹی'' کے عنوان سے اچھی کہانیاں لکھ کر ادبِ اطفال کے دامن کو وسعت بخشی۔

خیبر پختونخوا کے جدید ادبِ اطفال کی روایت میں ارشد سلیم کی کہانیوں میں ''تم بچے نہیں رہے''، ''احساس ندامت''، ''شیطان کی شکست''، ''قائد میں شرمندہ ہوں'' میں کہانی کاری کا حسن ملتا ہے۔

خیبر پختونخوا میں ادبِ اطفال کی روایت میں پچھلے کئی برسوں سے نئے ادیبوں کی آمد کا عمل رکا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر ادبِ اطفال کے فروغ کے وہ مواقع نہیں جو لاہور، کراچی اور دیگر مراکز میں ملتے ہیں، اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ سرکاری ادبی ادارے بچوں کے نئے ادیبوں کو دریافت کرے تاکہ ادبِ اطفال کی روایت خیبر پختونخوا میں آگے بڑھ کر بچوں کی تربیت میں اپنا اہم کردار ادا کر سکے۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر: ڈاکٹر: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۵۳۳

۲۔ مرزا ادیب: اردو میں بچوں کا ادب (ایک جائزہ): مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰

۳۔ بحوالہ اردو میں بچوں کا ادب از ڈاکٹر خوشحال زیدی: کلر پرنٹرز، دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۲۸

۴۔ Britannica Junior Encyclopedia Vol 4c: January 1, 1966, P 249

۵۔ Henry Commager: from' Introduction of the, "A Critical History of Children Literature." MEIGS, 1953, Page VII.

۶۔ محمود الرحمن: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: نیشنل پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۶۔۷

۷۔ اکبر رحمانی: پروفیسر: اردو میں ادبِ اطفال (ایک جائزہ): ایجوکیشنل اکادمی، اسلام پورہ، جلگاؤں، ۱۹۹۱ء، ص ۶۸

۸۔ زیب النساء: بیگم: اقبال اور بچوں کا ادب: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۳۱

۹۔ نظر زیدی: بچوں کے ادب میں بچوں کی پسند کا مسئلہ: مشمولہ ماہنامہ ''کتاب'': لاہور، (بچوں کا ادب نمبر) ۱۹۷۸ء، ص ۴۷

۱۰۔ عذرا اصغر: بچوں میں ذوق مطالعہ کس طرح بڑھایا جائے: مشمولہ ماہنامہ ''کتاب''، ص ۲۲

۱۱۔ سلیم اختر: ڈاکٹر: بچوں کا ادب اور نفسیات: مشمولہ بچے اور ادب، مرتبہ: شیما مجید، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۳۹

۱۲۔ اسحاق وردگ: پروفیسر: انٹرویو: مطبوعہ روزنامہ ''آج صبح'': پشاور، ۲۴ اپریل ۲۰۱۶ء، ص ۳

۱۳۔ خوشحال زیدی: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: ص ۱۵۷

۱۴۔ خوشحال زیدی: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: ص ۱۶۴

۱۵۔ محمود الرحمن: ڈاکٹر: آزادی کے بعد بچوں کا ادب: ماہنامہ ''کتاب''، لاہور، بچوں کا ادب نمبر، جنوری ۱۹۷۹ء، ص ۹

۱۶۔ خوشحال زیدی: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: ص ۱۶۰

۱۷۔ ریاض صدیقی: پاکستان میں بچوں کا ادب اور مسائل: ماہنامہ 'ماہِ نو'، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۷۰۔۷۱

۱۸۔ محمود شیرانی: حافظ: پنجاب میں اردو: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۹

۱۹۔ خوشحال زیدی: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: ص ۱۶۵

۲۰۔ محمود الرحمن: ڈاکٹر: آزادی کے بعد بچوں کا ادب: ماہنامہ ''کتاب'': ص ۹

۲۱۔ جاوید نہال: پروفیسر: انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب: اردو رائٹرس گلڈ، کلکتہ، ص ۴۵۵

۲۲۔ بحوالہ روشنی کا سفر: از ڈاکٹر: محمد افتخار کھوکھر: شعبہ بچوں کا ادب: دعوۃ اکیڈمی: اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۱۱۔۱۲

۲۳۔ اسحاق وردگ: ادب اطفال کی روایت پر ایک نظر (مقالہ): غیر مطبوعہ

۲۴۔ محمود الرحمن: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: ص ۱۶۷

۲۵۔ خوشحال زیدی: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: ص ۱۷۳

۲۶۔ محمود الرحمن: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: ص ۱۶۸

۲۷۔ حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۳۸۸

۲۸۔ اسحاق وردگ: پروفیسر: ادب اطفال کی روایت پر ایک نظر: (مقالہ) غیر مطبوعہ

۲۹۔ الیاس احمد مجیبی: بچوں کے ادب کے پچیس سال: ''ساقی'' کراچی، جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء، ص ۱۶۳

۳۰۔ عبادت بریلوی: ڈاکٹر: روایت کی اہمیت: انجمن ترقی اردو، پاکستان، ص ۲۴۰

۳۱۔ سیفی پریمی: اسماعیل میرٹھی حیات اور کارنامے: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۲۴۳

۳۲۔ محمود الرحمن: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: ص ۱۸۸

۳۳۔ عبدالقادر سروری: جدید اردو شاعری: انجمن امداد باہمی، مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد، دکن، ۱۹۳۲ء، ص ۱۱۷

۳۴۔ خوشحال زیدی: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: ص ۱۸۷

۳۵۔ زیب النساء بیگم: اقبال اور بچوں کا ادب: ترقی اردو بیورو، دہلی ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۴

۳۶۔ مرزا ادیب: بچوں کا ادب (ایک جائزہ): ص ۶۷

۳۷۔ عبدالقوی دسنوی: بچوں کا اقبال: نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء، ص ۳۸۔۳۹

۳۸۔ خوشحال زیدی: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: ص ۱۹۰

۳۹۔ جگن ناتھ آزاد: اقبال کی کہانی: ترقی اردو بورڈ، دہلی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۰

۴۰۔ بحوالہ روشنی کا سفر: محمد افتخار کھوکھر: ص ۱۱

۴۱۔ محمود الرحمن: اردو میں بچوں کا ادب: ص ۳۳۷

۴۲۔ نور الحسن ہاشمی: ڈاکٹر: بچوں کے افسر: مشمولہ ماہنامہ ''نیا دور'' لکھنؤ، ۱۹۷۹ء، ص ۳۵

۴۳۔ سیدہ مشہدی: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: ایمن پبلی کیشنز، رانچی، انڈیا، ۱۹۹۰ء، ص ۱۷۳

۴۴۔ یونس حسنی: ڈاکٹر: اختر شیرانی اور جدید اردو ادب: انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۳۸۸

۴۵۔ نثار احمد قریشی: ڈاکٹر: صوفی غلام مصطفیٰ تبسم: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۸

۴۶۔ ذاکر حسین: ڈاکٹر: اعتراف حق: مشمولہ ''پیام تعلیم''، شفیع الدین نیرؔ نمبر، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۶

۴۷۔ گوہر رحمان نوید: صوبہ سرحد میں اردو ادب: یونیورسٹی پبلشرز، پشاور، ۲۰۱۰ء، ص ۴۵۵

۴۸۔ بحوالہ صوبہ سرحد میں بچوں کا ادب، از پروفیسر: گوہر رحمان نوید: مشمولہ شش ماہی مجلہ ''خیابان''
شعبہ اردو جامعہ پشاور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۱

۴۹۔ پروفیسر: ڈاکٹر: عرفان اللہ خٹک سے راقمہ کا انٹرویو: بمقام بنوں، بتاریخ ۱۵ نومبر، ۲۰۱۸ء

۵۰۔ نوشین وودود: اردو میں بچوں کے ادب کا ارتقا اور صوبہ سرحد: تحقیقی مقالہ ایم۔اے (اردو)
شعبہ اردو جامعہ پشاور، ۲۰۰۹ء، ص ۵۲

۵۱۔ گوہر رحمان نوید: صوبہ سرحد میں اردو ادب: ص ۴۵۶

۵۲۔ ترانہ از محسن احسان: مشمولہ سہ ماہی ادبیات: بچوں کا ادب نمبر: شمارہ نمبر ۹۵۔۹۶، اکادمی ادبیات،
۲۰۱۲ء، ص ۷۲۔ ۷۳

۵۳۔ اسحاق وردگ: ڈاکٹر: خاطر غزنوی: احوال و آثار (تحقیقی و تنقیدی جائزہ): پی ایچ ڈی (مقالہ) غیر مطبوعہ،
شعبہ اردو جامعہ پشاور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۹۶

۵۴۔ اسحاق وردگ: ڈاکٹر غزنوی: احوال و آثار (تحقیقی و تنقیدی جائزہ): ص ۲۹۷

۵۵۔ دیباچہ: ننھی منی نظمیں از جمیل الدین عالی: سینڈیکیٹ آف رائٹرز: پشاور، ۱۹۹۳ء، ص ۲

۵۶۔ گوہر رحمان نوید: صوبہ سرحد میں بچوں کا ادب: ص ۴۵۷

۵۷۔ نظم گنتی از خاطر غزنوی: مشمولہ ''ننھی منی نظمیں''، سینڈیکیٹ آف رائٹرز: ص ۵

۵۸۔ اسحاق وردگ: ڈاکٹر: خاطر غزنوی: احوال و آثار، ص ۲۹۷

۵۹۔ اسحاق وردگ: ڈاکٹر: خاطر غزنوی: احوال و آثار، ص ۲۰۸

۶۰۔ شجاعت علی راہیؔ: زمزم شگوفے: طفیل آرٹ پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۳۵

۶۱۔ گوہر رحمان نوید: صوبہ سرحد میں بچوں کا ادب: ص ۴۸۷

۶۲۔ صوبہ سرحد میں بچوں کا ادب: از گوہر رحمان نوید: مشمولہ ''خیابان'' ص ۱۴۵

۶۳۔ نورین فاطمہ: حافظہ: اردو میں بچوں کا ادب (اکیسویں صدی میں) تحقیقی مقالہ: (غیر مطبوعہ) گورنمنٹ کالج
یونیورسٹی، فیصل آباد ۲۰۱۷ء، ص ۶۴

۶۴۔ وقار احمد اعوان: تعارف: اسحاق وردگ: ڈاکٹر: مشمولہ روزنامہ ''آج صبح'' ۲۴ اپریل، ۲۰۱۹ء، ص ۳

۶۵۔ نوشین وودود: اردو میں بچوں کے ادب کا ارتقاء اور صوبہ سرحد: ص ۵۸

۶۶۔ گوہر رحمان نوید: صوبہ سرحد میں بچوں کا ادب: ص ۱۴۶

۶۷۔ کہانی چھوٹا از اسحاق وردگ: ڈاکٹر: مشمولہ پرعزم بچے: خیبر پختون خوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور: ۲۰۱۲ء، ص ۷

۶۸۔ اسحاق وردگ: ڈاکٹر: رنگ برنگی تتلی: مشمولہ ماہنامہ ''ساتھی'' کراچی، مئی ۲۰۱۹ء، ص ۵۱

۶۹۔ گوہر رحمان نوید: صوبہ سرحد میں اردو ادب: ص ۴۵۹

۷۰۔ نظم جی چاہتا ہے از شاہد انور شیرازی: ماہنامہ ''مجاہد'': پشاور، دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۲۰

باب دوم

شجاعت علی راہیؔ: سوانح حیات، شخصیت اور ادبی خدمات

باب دوم: شجاعت علی راہیؔ: سوانح حیات، شخصیت اور ادبی خدمات

ا۔ سوانح حیات:

ادب ترجمان حیات ہے کیونکہ زندگی اور ادب ہر دور اور ہر رنگ میں ایک دوسرے کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ اردو زبان وادب کی ترقی اور فروغ میں جس طرح پاکستان کے ہر صوبے نے اپنا بہترین کردار ادا کیا ہے۔ اُسی طرح صوبہ خیبر پختون خوا نے بھی اردو زبان وادب کے فروغ میں بھر پور حصہ لیا۔ صوبہ خیبر پختون خوا میں پشاور کے بعد ضلع کوہاٹ کو علم وادب کا گہوارہ اور ایک اہم مرکز شمار کیا جاتا ہے۔

کوہاٹ ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ ادبی لحاظ سے کوہاٹ کی سرزمین بہت زرخیز ہے۔ اس خطے نے بڑے بڑے ادباء، شعرا اور مصوروں کو جنم دیا ہے جنھوں نے اپنی مٹی اور فن سے وفا کرتے ہوئے اردو زبان وادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔

احمد فراز اور ان کے والد آغا برق کوہاٹی، رحیم گل، شعیب قریشی، آزر سرحدی، قیوم مروت، میر عبدالصمد، جسٹس ایم آر کیانی، ایوب صابر، عزیز اختر وارثی، اسلم فیضیؔ، احمد پراچہ، غلام حیدر اختر، انجم یوسف زئی، مصور لیاقت علی خان، سورج نرائن، شاہد زمان اور شجاعت علی راہیؔ جیسی مشہور ومعروف شخصیتیں اسی پر تاثیر مٹی کے خمیر سے پیدا ہوئیں۔ یہ نام اور یہ ہستیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان قلم کاروں نے اپنی بہترین و نایاب تخلیقات کی بدولت دنیائے شعر وادب میں ایک منفرد اور اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ احمد پراچہ اپنی کتاب میں کوہاٹ کے بارے میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''کوہاٹ کی مٹی بڑی زرخیز اور مردم خیز ہے۔ یہ خطہ شروع ہی سے شعر وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں ہر دور میں شعر وادب کا چرچا رہا ہے۔ اردو ادب کے بے لوث خدمات میں اس سرزمین کے اہل قلم کو ایک مقام حاصل ہے۔ اس علاقے کی مٹی سے خوش فکر شاعر، خوش ذوق ادیب، نڈر دانشور اور بے باک صحافی پیدا ہوئے''۔(۱)

احمد فراز کی طرح شجاعت علی راہیؔ کا تعلق بھی کوہاٹ سے ہے۔ شجاعت علی راہیؔ نئی نسل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ بنیادی طور پر وہ اپنے آپ کو ایک بہترین شاعر کی حیثیت سے منوا چکے ہیں۔ لیکن شاعری کے علاوہ انھوں نے دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کر کے ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

خاندانی پس منظر:

شجاعت علی راہیؔ ایک سید گھرانے کے چشم وچراغ ہیں۔ ان کا اصل نام شجاعت علی شاہ (نقوی البخاری) ہے جبکہ ادبی دنیا میں وہ اپنے قلمی نام شجاعت علی راہیؔ سے مشہور ہیں۔ ''راہیؔ'' ان کا تخلص ہے جو ایک طرح سے اسم بامسمّیٰ ہے۔ کیونکہ راہیؔ نے تعلیم وتدریس کے حوالے سے بہت سے ممالک کا سفر کیا اور عرصہ دراز تک بیرون ملک مقیم بھی رہے ہیں۔

ان کی قلمی نام کے حوالے سے رضا ہمدانی کہتے ہیں:

''شجاعت علی راہی کا قلمی نام''راہی''اسم بامسمٰی ہے اس لئے کہ وہ ہر لمحہ پابہ رکاب رہا۔اس کی زندگی کا بیشتر حصہ سفر میں بسر ہوا۔اس نے برطانیہ،فرانس،ڈنمارک،مغربی جرمنی،ناروے،مصر،اٹلی،سویڈن ،تھائی لینڈ،سعودی عرب،بنگلہ دیش کی نہ صرف سیر کی بلکہ وہاں تحصیل علوم میں بھی مگن رہا۔(۲)

شجاعت علی راہیؔ کے آباؤاجداد بخارا سے پاکستان آکر آباد ہو گئے تھے جن کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں:

''ہمارے والد محترم(آغاجی)کا خاندان صدی دو صدی پہلے بخارا سے نقل مکانی کر کے پاکستان کے شمالی مغربی منطقے میں آباد ہوا''۔(۳)

بعد ازاں پشاور اور پھر پشاور سے کوہاٹ میں نثار سٹریٹ محلہ میاں بادشاہ میں قیام پذیر ہو گئے۔تقریباً دو عشروں تک بیرون ملک (برطانیہ اور سعودی عرب) میں ملازمت کرنے کے بعد کوہاٹ لوٹے تو کوہاٹ کینٹ میں اپنے ذاتی مکان میں رہائش پذیر ہوئے۔شجاعت علی راہیؔ کے والد محترم کا نام آغا فیاض علی شاہ اور دادا کا نام آغا مقبول شاہ ہے جو بخاری سید تھے اور ان کا شجرہء نسب امام نقیؑ سے جا ملتا ہے۔آغا مقبول شاہ کے صرف دو ہی بیٹے تھے۔آغا فیاض علی شاہ اور آغا حسین شاہ جن کے بارے میں احمد پراچہ لکھتے ہیں:

''آغا مقبول شاہ پشاور سے کوہاٹ آکر یہیں رچ بس گئے تھے۔ان کے دو ہی بیٹے تھے آغا فیاض علی شاہ اور آغا حسین شاہ'' (۴)

شجاعت علی راہیؔ کے والد کا اصل نام سید فیاض علی شاہ ہے۔وہ کوہاٹ میں ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے۔نہایت وضع دار، خوش گفتار اور زندگی کے ہر شعبے میں نظم وضبط کے زبردست حامی انسان تھے۔راہیؔ اس بارے میں کہتے ہیں:

''میرے والد جس محفل میں بیٹھتے،رونق محفل بنتے۔مزاج میں بھرپور نظم وضبط تھا۔مقررہ وقت پر کھانا پینا،زیادہ خوراک سے اجتناب کرنا،اٹھتی کے پیٹے میں بھی باقاعدہ ورزش کرنا ان کی عادات میں شامل تھا۔اگر ریل گاڑی میں سفر کر رہے ہوتے اور کوئی مسافر خلاف قاعدہ کوئی کام کرتا تو اسے ڈانٹ پلانے سے نہیں چوکتے تھے۔آداب محفل اور آداب طعام وکلام کے خود بھی سختی سے پابند تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی ان قواعد وضوابط کی پابندی کریں''(۵)

فیاض علی شاہ وسیع ذوق مطالعہ رکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف زبانیں سیکھنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔موسیقی سے انہیں بے انتہا شغف تھا۔موسیقی سے نہ صرف شغف تھا بلکہ موسیقی کے اسرار و رموز سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔موسیقی کے محافل میں اکثر شوق سے شریک ہوتے اور جب کبھی کسی گویے یا قوال کی طرف سے داد وتحسین وصول کرتے تو اسے اپنے لئے سند گردانتے۔

فیاض علی شاہ باذوق انسان تھے، ہلکی پھلکی شاعری بھی کرتے تھے۔ ادبی دنیا میں انہوں نے خاموشی سے وقت گزارا، کبھی خودنمائی سے کام نہیں لیا۔ اپنے دور کے کئی مشہور علمی وادبی شخصیات اور معتبر شعراء کے ساتھ اُن کے گہرے مراسم رہے۔ وہ ادبی حلقوں میں ''ماہر نقوی'' کے قلمی نام سے پہچانے جاتے تھے۔

بقول احمد پراچہ:

> ''شجاعت کے والد بزرگوار فیاض علی شاہ نقوی موسیقی پر گہرا عبور رکھتے تھے۔ صاحب ذوق تو وہ ہمیشہ سے تھے، بڑھاپے میں سخن گو بھی ہوگئے۔ ان کا قلمی نام ''ماہر نقوی'' ہے۔(۶)

شجاعت علی راہیؔ کے مطابق بروز اتوار ۱۱ ستمبر ۱۹۹۲ء کو آغا ماہر نقوی کا انتقال ہوا۔ آغا حسین شاہ شجاعت علی راہیؔ کے چچا تھے جنہیں وہ قاقاگل کے نام سے پکارتے تھے ان کا تعارف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''قاقاگل کی شخصیت بڑی عالی شان تھی۔ چہرے پر جلال و جمال کی ملی جلی کیفیت تھی۔ گھنی بھویں اور انتہائی دل کش گھنی مونچھیں ان کے چہرے پر جچی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں ایک مقناطیسی کشش تھی۔ دیکھنے والے کو پہلی ہی ملاقات میں اپنے چہرے اور وضع قطع سے مرعوب کر دیتے تھے۔ وہ مسلم لیگ کے ایک فعال اور سرگرم رکن تھے اور پارٹی کی ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ کوہاٹ میں تاحیات وہ مسلم لیگ کے صدر رہے اور ایک باوقار سیاست دان کی حیثیت سے زندگی گزاری۔''(۷)

شجاعت علی راہی کی والدہ مرحومہ کا نام سیدہ امیر بیگم تھا۔ جو سادات خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ راہی کو اپنی والدہ سے بے پناہ محبت ہے۔ اکثر اوقات ان کی محبت میں خود کو پیر کہن سال نہیں بلکہ ایک طفیل شیر خوار سمجھتے ہیں اور اپنی والدہ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ ان کی والدہ مرحومہ نیک نیت خاتون تھیں۔ واجبی سا چہرہ اور دھیما مزاج پایا تھا، نرم گفتار تھیں۔ اُن کے چہرے پر ایک افسردہ تبسم بکھرا رہتا تھا۔ راہیؔ کے ساتھ ان کی ماں کی یادیں امربیل کی طرح چمٹی ہوئی ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں:

> ''مجھے یوں لگتا ہے کہ آج بھی بوجی (والدہ) کا دستِ محبت میرے سر پر ہے۔ آج بھی وہ میری سب سے بڑی پناہ گاہ ہے۔ آج بھی میری جنت میرے ساتھ ہے۔ میں نے اپنے شعری مجموعے ''پھول کھلے یا نہ کھلے'' کا انتساب انہی کے نام کیا ہے۔''(۸)

راہی کی والدہ کی وفات ۱۹۶۵ء میں اس وقت ہوئی جب وہ بی۔ اے کا امتحان دے رہے تھے۔ شجاعت علی راہیؔ کی والدہ مرحومہ سیدہ امیر بیگم کی دو چھوٹی بہنیں تھیں۔ صفیہ بیگم اور طلعت نشاط۔ ان کی وفات کے بعد خالہ صفیہ بیگم سال دو بعد ان کے والد کے عقد میں آئیں۔ خالہ نے والہانہ پیار دیا، والدہ کی کمی کو کبھی محسوس نہیں ہونے دیا اور اس رشتے کو بخوبی نبھا کر ایک نئی زندگی کا احساس دلایا۔

چھوٹی بہن طلعت نشاط ایک خوش مزاج اور بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کی مالک خاتون تھی، اس کے علاوہ وہ ایک بہترین افسانہ نگار تھی۔ اس بات کی تصدیق احمد پراچہ نے اپنی کتاب میں ان الفاظ میں کی ہے:

''شجاعت کی والدہ مرحومہ سیدہ امیر بیگم کا تعلق فارسی بولنے والے کاظمی خانوادے سے تھا۔ مرحومہ کی چھوٹی اور جواں مرگ بہن طلعت نشاط صاحب ذوق تھیں اور تخلیقی رجحانات رکھتی تھی۔ ان کے افسانے قیام پاکستان سے قبل کے ادبی پرچوں میں چھپا کرتے تھے۔''(۹)

مرحومہ طلعت نشاط جس زمانے میں لکھا کرتی تھی اس میں خواتین کا لکھنا تو کیا، ان کا پڑھنا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اگر زندگی نے وفا کی ہوتی تو آج شاید وہ ممتاز شیرین اور قرۃ العین حیدر جیسی ممتاز اور مایہ ناز خواتین افسانہ نگاروں کی صف میں شمار ہوتی۔

شجاعت علی راہیؔ کے بڑے بھائی میجر ریاض علی شاہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خداداد ذہنی اور انتظامی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کے مزاج میں لڑکپن سے تجسس اور شوخی کے عناصر بدرجہ اتم موجود تھے۔ انہیں بچپن سے مصوری اور فوٹوگرافی میں خاص طور پر دلچسپی تھی۔ وہ فوج میں میجر کے عہدے پر تعینات رہے۔ بعد میں وزارت خارجہ اور انٹیلی جنس کے محکمے میں اسسٹنٹ ڈپٹی ڈائریکٹر بھی رہے۔ پاک بھارت جنگ میں انہوں نے اپنی بہادری کے نمایاں جوہر دکھائے اور جنرل پرویز مشرف کے دور میں پاکستان ریلوے کے محکمے میں امتیازی عہدے پر فائز رہے۔

راہیؔ کے دوسرے بھائی اعجاز علی شاہ ہیں۔ ان کی شخصیت میں جو خصوصیت اور صفت نمایاں ہے، وہ ان کا بے مثال عجز اور صبر و تحمل ہے۔ تعلیمی لحاظ سے گو کچھ زیادہ ممتاز نہیں تھے لیکن آواز بہت اچھی پائی تھی۔ شاعرانہ طبیعت انہیں وراثت میں ملی تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ پائے اور اپنے والد کی کیمسٹ کی دوکان سنبھالی۔

شجاعت علی راہیؔ اپنی خودنوشت میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد راولپنڈی میں ٹیکنیکل کورسز کر رہے تھے۔ ہماری والدہ ان کی صحت کے بارے میں پریشان رہتی تھیں جس کی وجہ سے ہمارے والد نے انہیں کوہاٹ بلا کر اپنی کمسیٹ کی دوکان پر بٹھا دیا۔ بعد میں دوکان انہی کے سپرد کر دی۔''(۱۰)

طلعت امتیاز نقوی ان کے تیسرے بھائی ہیں۔ ہر شعبۂ ہائے زندگی میں ہمیشہ اپنے نام کی طرح امتیاز رہے۔ فن خوشخطی کے ماہر تھے۔ شعری شغف بھی رکھتے تھے اور مقامی مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ فوج میں کمیشن حاصل کر کے بھرتی ہوئے اور اپنی بہترین خدمات انجام دیں۔ بقول احمد پراچہ:

''طلعت امتیاز نقوی اور شجاعت علی راہیؔ دونوں بھائی کوہاٹ کے ادبی افق پر بیک وقت نمودار ہوئے۔ مگر طلعت کی شاعرانہ زندگی چند برسوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ فوجی ملازمت اختیار کر لینے کے بعد طلعت نے ادبی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔''(۱۱)

فوج سے بریگیڈیئر کے رینک میں سبکدوش ہونے کے بعد وہ ایک سال تک الشفاء ٹرسٹ راولپنڈی میں ڈائریکٹر آف ایڈمنسٹریشن کے عہدے پر فائز رہے۔ الشفاء ہسپتال میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد گریزن کیڈٹ کالج کے پرنسپل بنے۔ جب خیبر پختونخوا کے سابق گورنر حسین شاہ نے کوہاٹ میں تعلیمی بورڈ بنانے کا فیصلہ کیا تو طلعت امتیاز نقوی کو اس نے پوری ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیئے۔

شجاعت علی راہیؔ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے اور چھوتے نمبر پر ہیں۔ ان کے بعد ان کی چار بہنیں ہیں۔ جن کے نام بالترتیب یہ ہیں۔ (۱) فرحانہ تزئین ۲) ریحانہ تسنیم) ۳) صباحت رعنا (۴) فرزانہ نسرین۔ راہی کی تمام بہنیں بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ شجاعت علی راہیؔ اپنی خودنوشت میں اپنی بہنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہماری کم وبیش تمام بہنوں میں تخلیقی جوہر موجود تھے۔ فرحانہ تزئین نے چند غزلیں لکھیں۔ سب سے چھوٹی بہن فرزانہ نسرین نے افسانے، نظمیں اور غزلیں کہیں۔ فرحانہ کے بعد ہماری دوسری بہن ریحانہ تسنیم تھیں جسے ہم گھر میں ''رانی'' کے نام سے پکارتے تھے وہ بھی اچھا خاصا ادبی ذوق رکھتی تھی۔'' (۱۲)

راہیؔ کے والد مرحوم کا خاندان بہت مختصر تھا، گوان کی اپنی اولاد خوب پھیلی۔ والد کے مختصر خاندان کے مقابلے میں والدہ مرحومہ کا خاندان بہت وسیع ہے، یہاں تک کہ ایک قبیلے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ راہیؔ کے پانچ ماموں تھے ہر ایک کی منفرد شخصیت تھی۔ بڑے ماموں آغا فضل علی شاہ زیادہ تر پشاور میں مقیم رہے، پیشے کے لحاظ سے ہیڈ ماسٹر تھے، ذمہ داری کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ دوسرے ماموں خادم علی شاہ ایک محنتی، کفایت شعار اور ایماندار انجنیئر تھے۔ تیسرے ماموں کا نام ولایت علی شاہ تھا، جو پی ڈبلیوڈی کے محکمے میں اوورسیر رہے اور پھر ایس ڈی او (SDO) کے عہدے پر ریٹائرڈ ہوئے۔ ان کی اہلیہ ماضی کے معروف ومشہور اُمی شاعر سید شیرازی کی بیٹی تھیں۔ چھوتے ماموں میجر سجاد حیدر ایک خوش باش اور زندہ دل انسان تھے، ان کا کافی وقت برطانیہ میں گزارا۔ سب سے چھوٹے ماموں اصغر علی شاہ بھی بہت خوش گفتار انسان ہیں، اور الحمداللہ حیات بھی ہیں۔ ان کی زوجہ حمیرا ملک الشعراء ملک ناصر علی خان کی بیٹی تھیں۔

المختصر راہیؔ اور ان کے خاندان کا شعروادب سے ایک گہرا اور اٹوٹ رشتہ رہا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ کوہاٹ کے دو مشہور شعراء لازم افغانی مرحوم، سید شیرازی مرحوم اور پشاور کے فارسی زبان کے ملک الشعراء ناصر علی خان مرحوم شجاعت علی شاہ (راہیؔ) کے بزرگ رشتہ داروں میں سے تھے۔

شجرۂ نسب:

راہی صاحب سے جب میں نے ان کے شجرۂ نسب کے بارے میں دریافت کیا، تو میرے بڑے استفسار پر انہوں نے مجھے تحریری طور پر اپنا مختصر شجرۂ نسب لکھ کر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ سید مصطفیٰ شاہ بخاری کے بیٹیوں کے نام مجھے معلوم نہیں۔ اس لیے کہ ان کے بارے میں میرے والد صاحب نے مجھے تفصیل سے نہیں بتایا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کہا کہ میرے لکڑ دادا سید لعل محمدی شاہ ایران (بخارا) سے آئے تھے اور اپنا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پشاور میں چھوڑ کر جوانی ہی میں دوبارہ واپس چلے گئے تھے۔
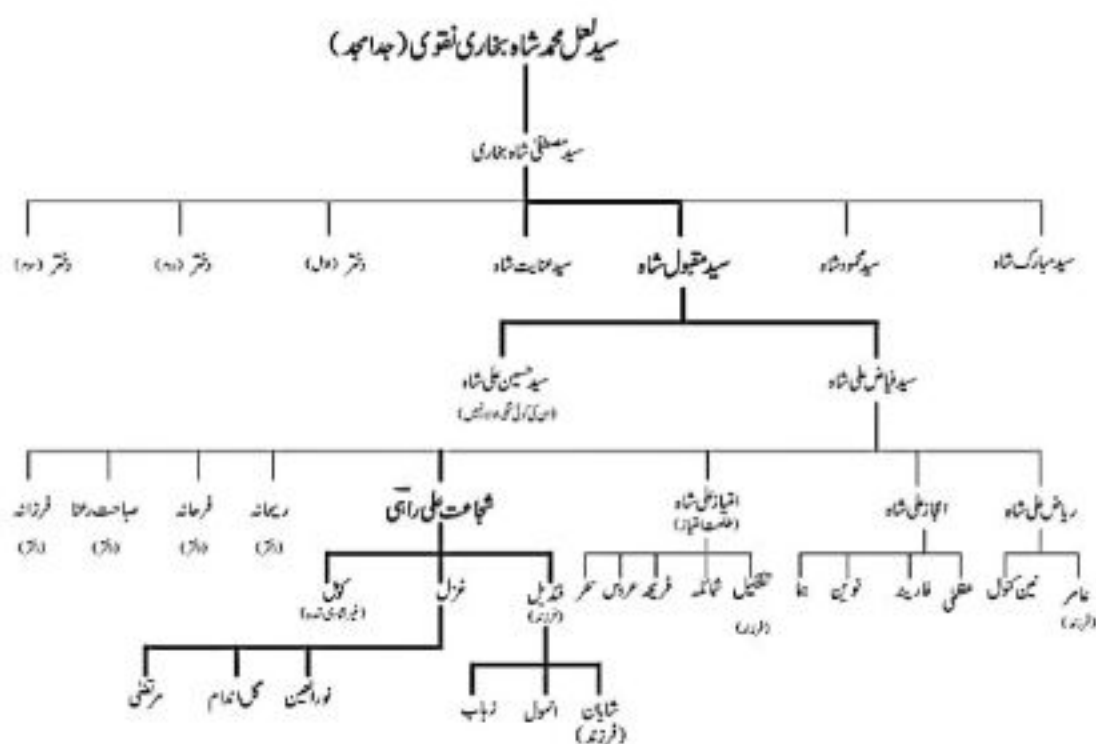
تاریخ پیدائش:

شجاعت علی شاہ (راہیؔ) ۳ جنوری ۱۹۴۵ء کو کوہاٹ شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش میں بظاہر کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔ میٹرک سرٹیفکیٹ کے مطابق بھی ان کی تاریخ پیدائش ۳ جنوری ۱۹۴۵ء درج ہے۔ شجاعت علی راہیؔ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں احمد پراچہ میں لکھتے ہیں:

> ''شجاعت علی راہیؔ ۳ جنوری ۱۹۴۵ء کو کوہاٹ میں پیدا ہوئے۔ بچپن اور حالب علمی کا کثیر حصہ نثار اسٹریٹ، محلہ میاں بادشاہ میں گزارا۔'' (۱۳)

اور یہی بات احمد پراچہ اپنی کتاب میں بھی دہراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شجاعت علی راہیؔ کوہاٹ میں ۳ جنوری ۱۹۴۵ء کو سید فیاض علی شاہ (آغا ماہر نقوی) کے گھر پیدا ہوا۔
یہیں پلا، بڑھا اور تعلیم پائی'' (۱۴)

علاوہ ازیں راہیؔ کی مذکورہ تاریخ پیدائش مقالہ نگار جانان اورکزئی اور عمران خان نے اپنے تحقیقی مقالات میں بھی یہی لکھی ہے۔ تاہم شجاعت علی راہیؔ بذاتِ خود اس تاریخ پیدائش کو مستند نہیں گردانتے۔ انہوں نے راقمہ کو اپنے ایک انٹرویو میں بتایا:

''یہ تاریخ پیدائش کچھ زیادہ مستند نہیں کیونکہ پہلے زمانے میں لوگ بچوں کو سکول میں داخل کرواتے
وقت زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیتے تھے۔ (۱۵)

بہرحال تحریری طور پر ان کی یہی تاریخ پیدائش ہی سامنے آئی ہے۔

تعلیم و تربیت:

جب راہیؔ کی عمر پانچ سال ہوئی تو انہیں گورنمنٹ تحصیل پرائمری اسکول میں داخل کیا گیا۔ ابتداء میں، جیسے بچے سکول کے ماحول سے غیر مانوس ہوتے ہیں اور سکول نہیں جاتے، اسی طرح راہیؔ کا بھی سکول میں دل نہیں لگتا تھا اور وہ اسکول جانے سے کتراتے تھے۔ اس بارے میں اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''آغاز میں میں ایک کند ذہن طالب علم تھا، سکول میں میرا دل بالکل نہیں لگتا تھا۔ استادوں سے خوف
آتا تھا۔ ایک بار سکول جانے کی بجائے بیٹھک کی ایک جمبو سائز چارپائی کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا مگر پکڑا
گیا اور سکول بھیج دیا گیا۔'' (۱۶)

یوں ادنیٰ سے جماعت چہارم تک گورنمنٹ تحصیل پرائمری سکول میں زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۵۵ء میں چوتھی جماعت کا امتحان یہاں سے پاس کیا۔ اس کے بعد پانچویں میں گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر 1 کوہاٹ میں داخل ہوئے جبکہ وزیر جانان اورکزئی اپنے ایم۔ اے کے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں:

''پرائمری کرنے کے بعد وہ ۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 کوہاٹ میں داخل ہوئے'' (۱۷)

اس بارے میں خود راہیؔ کا کہنا ہے:

''جب میں جماعت پنجم میں گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر 1 میں داخل ہوا تو میرے تینوں بھائی اسی اسکول
کے طالب علم تھے''۔ (۱۸)

غرض وہ پرائمری کرنے کے بعد نہیں بلکہ جماعت پنجم میں ہی گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر 1 میں داخل ہوئے۔ یہاں سے پانچویں کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ وہ ہر کلاس میں ہمیشہ پہلی پوزیشن لیتے تھے۔ کبھی دوسری یا تیسری پوزیشن نہیں لی۔

اس بارے میں راہیؔ رقم طراز ہیں:

> ''پنجم سے بی۔اے تک میں ہر کلاس، سکول اور کالج میں اول رہا۔ جب سالانہ امتحان کے نتائج سُن کر گھر لوٹ آتا تو گھر کا کوئی فرد بھی یہ استفسار نہ کرتا کہ میری کونسی پوزیشن ہے کیونکہ کبھی میں نے دوسری پوزیشن لی ہی نہیں۔'' (۱۹)

پانچویں سے دسویں جماعت تک راہیؔ تین برس تک کوہاٹ سے باہر رہے۔ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد وہ مانسہرہ چلے گئے اور چھٹی جماعت کا امتحان وہیں سے پاس کیا۔ مانسہرہ سے چھٹی جماعت پاس کرنے کے بعد ہفتم کا امتحان ماڑیپور کراچی سے پاس کیا اور دوبارہ کوہاٹ آ کر جماعت ہشتم میں داخلہ لیا۔ ہشتم میں امتیازی نمبر لے کر جماعت دہم کے پانچ، چھ ماہ گورنمنٹ ہائی اسکول پارہ چنار (کرم ایجنسی) میں گزارے۔ اُن دنوں ہشتم اور دہم کے امتحانات یونیورسٹی کے تحت ہوتے تھے جس میں وہ پشاور یونیورسٹی کے ٹاپ ٹین طلباء میں سے رہے اور وظائف حاصل کیے۔ راہیؔ کی تعلیم اور امتیازی پوزیشن کے بارے میں احمد پراچہ لکھتے ہیں:

> ''راہیؔ گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر 1 کوہاٹ میں داخل ہوئے، جہاں دسویں تک تعلیم حاصل کی۔ درمیان میں ایک ایک سال مانسہرہ اور ماڑی پور کراچی میں بھی پڑھا۔ جہاں بالترتیب چھٹی اور ساتویں جماعت پاس کی۔ جماعت دہم کے پانچ چھ ماہ گورنمنٹ ہائی اسکول پارہ چنار (کرم ایجنسی) میں رہے۔ پانچویں سے دسویں تک ہر جماعت میں اوّل رہے''۔ (۲۰)

میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں گورنمنٹ کالج کوہاٹ میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ داخلہ لیتے وقت ان کے پاس اتنی رقم نہیں تھی جس سے وہ داخلے کی فیس ادا کرتے، ان کے بھائی طلعت امتیاز نقوی نے اپنے کسی دوست سے قرضہ لے کر ان کے داخلے کی فیس ادا کی۔

گورنمنٹ کالج کوہاٹ میں انہوں نے چار سال گزارے، یہ دور علمی و ادبی لحاظ سے ان کی زندگی کا تابناک دور تھا۔ اس کالج میں ان کو ایسے باکمال اساتذہ ملے جنہوں نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ اس کا اعتراف شجاعت علی راہیؔ خود ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ہمیں اس زمانے میں گورنمنٹ کالج کوہاٹ میں ایسے ایسے باکمال اساتذہ یک جا مل گئے تھے جو آج شاید یونیورسٹیوں میں بھی نہ ملیں'' (۲۱)

راہیؔ کے ان اساتذہ میں ابراہیم بیگ، سید اشرف بخاری، انور حسین، سید حامد سروش، شوکت واسطی، فضل الرحمان بٹ، عبدالرؤف اُپل اور سید وصی رضا جیسی عظیم شخصیات شامل تھیں۔ راہیؔ نے کالج میں ان چار سالوں میں اپنی کامیابیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ ایک ہونہار طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین مقرر بھی رہے۔ اکیڈیمکس میں دو بار رول آف آنر وصول کیا جبکہ ہم نصابی سرگرمیوں میں ایک بار رول آف آنر حاصل کرنے کے حقدار پائے۔ کالج کے ادبی میگزین کے مدیر رہے اور سٹوڈنٹ یونین کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ اسی دوران پشاور یونیورسٹی کے اقبالیات

پر مقالہ نویسی کے مقابلے میں شرکت کی اور کئی ہزار الفاظ پر مشتمل ایک طویل مقالہ ''اقبال کا نظریۂ حیات'' تحریر کیا اور پہلا انعام حاصل کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی بین الکلیاتی مشاعروں اور مباحثوں میں بھی اپنے کالج کی نمائندگی کی اور ڈھیر سارے انعامات حاصل کئے۔

جب بی۔اے میں فائنل امتحان دینے کا وقت آیا اور انہوں نے تقریباً آدھا امتحان دیا تو ایک روز اچانک ان کی والدہ کی طبیعت خراب ہوگئی۔ سر درد کی وجہ سے ان کے دماغ کی رگ پھٹ گئی اور وہ فوت ہوگئیں۔ اتنے بڑے صدمے کے باوجود راہیؔ نے ہمت نہیں ہاری اور بقایا امتحان بھی خوب تیاری کر کے دیا۔ اور ۷۰ فیصد نمبروں کے ساتھ کالج میں اوّل پوزیشن حاصل کر کے سکالرشپ حاصل کیا۔ اس بارے میں حامد سروش لکھتے ہیں:

> ''شجاعت علی راہیؔ نے بی۔اے کا امتحان اس طرح دیا کہ اس کی والدہ بستر مرگ پر تھیں۔ خود اس کے دل کی حالت کیا ہوگی، یہ تو دل والے ہی جان سکتے ہیں۔ ان کی سانسیں گنی جا رہی تھیں اس کے باوجود اس نے بی۔اے کا امتحان دیا، بی۔اے میں اس کی پوزیشن اتنی اچھی تھی کہ اسے سکالرشپ مل گیا۔'' (۲۲)

اس طرح گورنمنٹ ڈگری کالج کوہاٹ سے بی۔اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر کے نہ صرف کالج بلکہ پشاور یونیورسٹی میں بھی اپنی نمایاں پوزیشن کو برقرار رکھا۔ بی۔اے کرنے کے بعد اگلا مرحلہ ایم۔اے کرنے کا تھا۔ راہیؔ کی یہ خواہش تھی کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کرے، لیکن اس وقت بھی ان کے مالی حالات کچھ زیادہ ٹھیک نہیں تھے۔ اس بارے میں انہوں نے راقمہ کو ایک مصاحبے میں بتایا:

> ''گورنمنٹ کالج کوہاٹ میں چار شاندار سال گزارنے کے بعد اگلا مرحلہ ایم۔اے کا تھا۔ ہماری حالت بدستور پتلی تھی۔ میں نے سوچا اگر میں ایم۔اے میں داخلہ لیتا ہوں تو میرے والد پر بوجھ پڑے گا۔ جسے سنبھالنا ان کے لئے مشکل ہوگا، اس لئے میں نے آغا جی سے کہا کہ یوں کرتے ہیں کہ پہلے میں کوئی نوکری تلاش کر لیتا ہوں، سال آدھ بعد جب کچھ رقم جمع ہو جائے گی، تو اس کے بعد داخلہ لے لوں گا۔ وہ بولے بیٹا تم داخلہ لے لو۔ اللہ کوئی سبب بنا ہی دے گا۔ (۲۳)

غرض انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کرنے کے لئے راہیؔ گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں تقریباً تین ہفتے کے بعد انہیں پاکستان نیشنل **انٹیگریشن** (موجودہ نیشنل سنٹر) کی طرف سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں سکالرشپ مل گئی اور یوں اللہ نے آخر کار سبب بنا ہی دیا اور ان کے والد پر اخراجات کا بوجھ نہیں پڑا۔

۱۹۶۸ء میں انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کیا اور ۱۹۷۰ء میں برٹش کونسل سکالرشپ پر ایڈنبرا (برطانیہ) چلے گئے وہاں ''تدریس انگریزی بحیثیت ثانوی زبان'' کا ایک سالہ ڈپلومہ حاصل کیا۔ کیمبرج، آکسفورڈ اور لندن سے لسانیات، انگریزی ادب اور تعلیمی ٹیلی وژن کے سرٹیفکیٹ حاصل کئے۔ ۱۹۷۷ء میں حکومت جرمنی کے خرچے پر برلن میں ٹیلی وژن پروڈکشن کا ایک سہ ماہی کورس بھی کیا۔ گویا ڈگریاں اور تعلیمی اسنادو

سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ان کا ایک مشغلہ بن گیا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتے 'وہاں سے کوئی نہ کوئی ڈگری اور تعلیمی سند ضرور حاصل کرتے۔ اس بارے میں مشہور ناول نگار رحیم گل (مرحوم) لکھتے ہیں:

> ''جس تیزی سے وہ شعر کہہ رہا تھا اُسی تیزی سے ڈگریاں حاصل کر رہا تھا۔ ڈگریاں حاصل کرنے کے لئے لوگ سفر طولانی اختیار کرتے ہیں لیکن شجاعت کے لئے ڈگریاں حاصل کرنا ایسا کھیل تھا گویا شریر بچہ درخت سے امرود توڑ رہا ہو''۔(۲۴)

ڈھاکہ یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کرنے کے بعد وہ ۱۹۶۸ء میں واپس مغربی پاکستان یعنی (موجودہ پاکستان) لوٹ آئے۔ چند سال بعد سقوط ڈھاکہ کا دلخراش واقعہ پیش آیا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔

شادی اور اہل عیال:

شجاعت علی راہیؔ کی شادی اس وقت قرار پائی جب وہ کیڈٹ کالج کوہاٹ میں درس و تدریس کے شعبے سے منسلک تھے۔ اُن دنوں ان کے والدین، راہیؔ اور ان کے بڑے بھائی اعجاز علی شاہ کے لئے رشتے کی تلاش میں تھے۔ راہی کی بڑی چچی حضرت جان مرحومہ نے محلہ پیر عبداللہ شاہ کے پیر مبارک شاہ سے ایک پُرانا رشتہ ڈھونڈ نکالا۔ پیر مبارک شاہ کا خاندان، شرافت میں اپنی مثال آپ تھا۔ چنانچہ کچھ ہی عرصے بعد اعجاز علی شاہ اور راہی کا رشتہ پیر مبارک شاہ کی دو بیٹیوں وحیدہ اور فرحت سے طے پایا۔ وحیدہ اعجاز علی شاہ کے عُقد میں آئی اور فرحت راہیؔ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئیں۔ شجاعت علی راہیؔ کی شادی کے بارے میں احمد پراچہ مجلہ ''نایاب'' میں یوں لکھتے ہیں:

> ''۲۴ دسمبر ۱۹۷۲ء کو آغا سید مبارک شاہ بخاری مرحوم اور سیدہ رقیہ بیگم مرحومہ کی دختر نیک اختر سیدہ فرحت بخاری سے نکاح ہوا اور ۲۰ جنوری ۱۹۷۳ء کو رخصتی ہوئی۔''(۲۵)

راہی کی شادی والدین کی مرضی سے ہوئی۔ اس سلسلے میں راقمہ کو شجاعت علی راہیؔ کے بھائی طلعت امتیاز نقوی نے بھی یہی بتایا ہے:

> ''شجاعت علی راہیؔ والدین کے فرمانبردار بیٹے ہیں اور ان کی یہ شادی والدین کی مرضی سے ہوئی۔''(۲۶)

راہی کی رفیقہ حیات سیدہ فرحت بخاری اپنی سب بہنوں میں چھوٹی اور لاڈلی تھی۔ ان کے دو ہی بڑے شوق تھے۔ ایک مطالعہ کرنا اور دوسرا کپڑے ٹانکنا۔ مطالعے کا شوق ہی وہ شوق تھا جو راہیؔ اور ان میں قدرے مشترک تھا۔ تمام بڑے ادیبوں، ناول نگاروں اور شاعروں کی کتابیں ان کی ذاتی لائبریری میں موجود تھیں۔

شادی کے ۱۰ ماہ بعد ۶ فروری ۱۹۷۳ء کو راہیؔ کے ہاں پہلی اولاد ہوئی۔ جس کا نام اردو و فارسی کی مشہور صنف سخن غزل کے نام پر ''غزل'' رکھا۔ راہی کو اپنی بیٹی ''غزل'' سے بے پناہ تھی۔ اس بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> ''مجھے غزل سے بے پناہ اُنس تھا، آپ کہیں گے کس باپ کو اپنی بیٹی سے اُنس نہیں ہوتا''(۲۷)

راہیؔ کے مطابق ''غزل'' ایک نہایت ذمہ دار بیٹی ہیں۔ اس نے ایوب میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا۔ غزل کی شادی ایبٹ آباد کے ایک سید گھرانے کے چشم و چراغ سید آفتاب حسین شاہ سے ہوئی جو ایک ذمہ دار شوہر اور لائق بینکر ہیں۔ راہیؔ اس کے بارے میں کہتے ہیں:

''غزل کا رفیق حیات آفتاب حسین شاہ ایک ذمہ دار اور لائق و فائق بینکر ہے۔ جتنی خوبی سے دفتر کے امور نبھاتا ہے، اتنی ہی خوبصورتی سے خانہ داری کے معاملے بھی نپٹاتا ہے''۔ (۲۸)

غزل کے تین بچے ہیں جن کے نام بالترتیب نورالعین، گل اندام اور مرتضیٰ ہیں۔ غزل کے بعد راہیؔ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی، جس کی پیدائش کے بارے میں وہ اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں:

''۱۲ مئی کو مجھے کوہاٹ سے برادرم لالاگل (اعجاز علی شاہ) نے جگنو (قندیل) کی ولادت کی خوشخبری سنائی۔'' (۲۹)

یعنی ''قندیل'' ۱۲ مئی ۱۹۷۶ء کو پیدا ہوا۔ قندیل کا نام راہیؔ نے ایک ہفتہ روزہ جریدے کے نام پر رکھا جبکہ وزیر جانان اورکزئی نے اپنے تحقیقی مقالے میں قندیل کی پیدائش کے بارے میں لکھا ہے:

''۱۲ اگست ۱۹۷۶ء کو بیٹے کی ولادت ہوئی۔'' (۳۰)

پس قندیل کی ولادت اگست نہیں بلکہ مئی کے مہینے میں ہوئی ہے۔ قندیل سکول کی سطح تک کوئی غیر معمولی طالب علم نہیں تھا، تاہم آگے بڑھتے بڑھتے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر کمپیوٹر سائنس میں ایم۔ ایس کیا اور بچوں کے حقوق سے متعلق ایک (NGO) سے منسلک ہو گیا اور کچھ ہی عرصے میں ملک میں بچوں کے حقوق کے سب سے بڑے اور نمایاں ادارے سپارک (SPARK) کا چیف ایگزیکٹیو بن گیا۔ شادی کے بارے میں راہیؔ اور ان کی بیگم فرحت نے قندیل کو مکمل آزادی دی کہ وہ اپنی مرضی سے لڑکی کا انتخاب کرے اور یوں اس نے راہیؔ کے بھائی طلعت امتیاز نقوی کی بیٹی عروس کو پسند کیا جو کہ راہیؔ کے مطابق ایک بہترین انتخاب تھا۔ عروس کے بارے میں راہیؔ کا کہنا ہے:

''میں عروس کو دیکھتا ہوں تو رب کریم کا شکر ادا کرتا ہوں کہ وہ اپنے بندوں کو کن کن نعمتوں سے نوازتا ہے۔ برخوردار قندیل کے ذوق انتخاب کی بھی داد دیتا ہوں کہ اس نے زندگی کے طویل سفر میں بہترین رفیق سفر کا انتخاب کیا ہے''۔ (۳۱)

قندیل کے دو بچے شایان اور انمول ہیں، جو راہی کو بہت عزیز ہیں۔ راہی کی تیسری اور آخری اولاد کومل ہے۔ جو ۱۳ جولائی ۱۹۸۶ء کو پیدا ہوئی۔ کومل کا نام راہیؔ نے ہندی گیتوں سے مستعار لے کر رکھا۔ راہی کی پہلی بیٹی غزل اور بیٹے قندیل کی پیدائش کوہاٹ میں ہوئی جبکہ آخری بیٹی ''کومل'' جدہ میں پیدا ہوئی۔ راہیؔ کی یہ خواہش تھی کہ کومل بھی اس کی طرح انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کرے، لیکن اس کا رجحان اس طرف نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے ایم۔ بی۔ اے کیا اور اپنے بھائی کی طرح حقوق اطفال کے سماجی میدان میں اپنی بہترین خدمات انجام دے رہی ہیں۔

پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز:

شجاعت علی راہیؔ نے جب ڈھاکہ یونیورسٹی میں ایم۔اے انگریزی کا فائنل امتحان دیا تو ابھی اس کا نتیجہ نہیں آیا تھا کہ اپریل ۱۹۶۸ء میں کیڈٹ کالج کوہاٹ سے بطور انگریزی استاد اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کیا۔ انہیں شروع ہی سے استاد بننے کا بے حد شوق تھا جو پورا ہو گیا۔ کیڈٹ کالج کوہاٹ جیسے منظم ادارے میں رہ کر انہوں نے یہاں دورانِ ملازمت مختلف قسم کے سکالرشپ کے لئے درخواستیں دی اور بالآخر برٹش کونسل کی طرف سے منتخب ہو کر برطانیہ (ایڈنبرا) چلے گئے، وہاں ایک سالہ انگریزی کورس کے ساتھ ساتھ تعلیمی ٹیلی وژن کا کورس بھی کیا۔ ایڈنبرا میں قیام کے دوران آپ وہاں کے لوگوں کے تہذیب، مہمان نوازی، شرافت اور شائستگی سے بہت متاثر ہوئے۔ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے ایڈنبرا میں جو وقت گزارا، وہ میری زندگی کا خوبصورت ترین سال تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ لوگ اتنے اچھے بھی ہو سکتے ہیں جو مہمان نوازی میں نے وہاں دیکھی اور کہیں نہیں دیکھی۔'' (۳۲)

۱۹۷۱ء میں واپس پاکستان آکر دوبارہ کیڈٹ کالج کوہاٹ سے منسلک ہو گئے۔ یہاں مجموعی طور پر انھوں نے پانچ سال تک پڑھایا لیکن یہاں کا ماحول انھیں سازگار نہ لگا۔ چنانچہ کیڈٹ کالج کی محدود اور بے رنگ زندگی سے خود کو نکالنے کے لئے انہوں نے پاکستان ٹیلی وژن میں ملازمت کے لئے درخواست دی جس میں وہ پروگرام پروڈیوسر منتخب ہوئے اور ایک نئے سفر کا آغاز کر کے ۱۹۷۳ء میں کیڈٹ کالج کوہاٹ کو خیر باد کہہ دیا۔

راہیؔ کے ساتھ اُس وقت پروڈیوسروں کی جو نئی کھیپ منتخب ہو کر آئی ان میں شاہد محمود ندیم، تاجدار عادل، اشرف عظیم، فہمیدہ نسرین، محمد عظیم اور مشتاق صوفی شامل تھے۔ پاکستان ٹیلی وژن میں انہوں نے تقریباً ہر نوعیت کے پروگرام پیش کئے۔ انہوں نے تعلیمی پروگراموں کے علاوہ ادبی و سماجی پروگرام بھی پیش کئے۔ پیپلز اوپن یونیورسٹی (موجودہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی) کی مشترکہ پیش کش سے جو پہلا پروگرام ''العربی سہلا'' پیش ہوا وہ بھی راہیؔ صاحب نے پروڈیوس کیا تھا، جس کے لئے وہ لاہور سے راولپنڈی منتقل کر دیئے گئے تھے۔

راہیؔ نے تقریباً پانچ سال تک پاکستان ٹیلی وژن میں کام کیا۔ ۱۹۷۷ء میں ایجوکیشنل ٹیلی وژن کی پروڈکشن کا سہ ماہی کورس کرنے کے لئے مغربی جرمنی (برلن) چلے گئے۔ اس وقت ان کے ہمراہ پروڈیوسر تاجدار عادل بھی تھے۔ برلن میں انہوں نے کئی شہروں کی سیر کی، وہاں کی ٹیکنالوجی اور معیاری نظام نے انہیں بہت متاثر کیا۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''یورپ کے لوگ ٹیکنالوجی سے جو کام لیتے ہیں وہ قابلِ داد ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی کارکردگی اور نظام کا جو معیار ہے، اُسے دیکھ کر رشک آتا ہے۔'' (۳۳)

وہاں انہوں نے کئی غیر ملکی اور خصوصاً بھارتی پروڈیوسروں کے ساتھ بھی کام کیا۔ برلن میں قیام کے دوران ہی جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کی خبر سُنی، تو کافی رنجیدہ ہوئے۔ کیونکہ ضیاء الحق کو نظریاتی طور پر ترقی پسند اور جمہوری عمل کی

حمایت کرنے والے لوگ پسند نہیں تھے۔ اس لئے برلن میں سہ ماہی کورس کے اختتام پر جب پاکستان ٹیلی وژن کی انتظامیہ کی جانب سے لندن کے راستے پاکستان جانے کا ٹکٹ دیا گیا، تو انہوں پاکستان لوٹنے کی بجائے لندن میں ہی سکونت اختیار کی اور وہاں ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ بہت جلد سپلائی ٹیچر کی حیثیت سے اُن کی تقرری ہوئی۔ یوں انہیں لندن کے مختلف کمپری ہینسیو اسکولوں میں پڑھانے اور نئے تجربات حاصل کرنے کا موقع ملا، جہاں زیادہ تر نو آباد کاروں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ لندن یونیورسٹی کی طرف سے اردو کے پرچوں کے لئے اسسٹنٹ ماڈ ریٹر بھی رہے۔ اس دوران پاکستان کے عظیم لیڈر جناب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی، اس خبر نے انہیں بہت افسردہ کیا۔ ان کے مطابق وہ دن ان کی زندگی کے اداس ترین دنوں میں سے ایک تھا۔ جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''اپریل ۱۹۷۹ء میں مجھے لیبیا سے اپنے بہنوئی زوار حسین کا نامہ موصول ہوا۔ اس نے لکھا تھا کہ ضیاء الحق نے بھٹو کو پھانسی دینے کا فیصلہ کیا ہے اور چند دنوں بعد وہ منحوس دن آیا جس کا ڈر تھا۔ تیسری دنیا کے اس عظیم رہنما کو جس پر پاکستان ہی کی نہیں، دنیائے اسلام کی نظریں گڑی ہوئی تھیں اور جس کی رہائی کا تقاضا دنیا کا ہر قابل ذکر رہنما کر چکا تھا، ایک سیاہ شب نے نگل لیا۔ اس شب سیاہ نے قائداعظم کے بعد پاکستان میں پیدا ہونے والے سب سے بلند قامت مدبر کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر روشنی کی سمت جانے والے راستوں کو بند کر دیا تھا۔'' (۳۴)

شجاعت علی راہیؔ نے اپنی سیماب فطرت طبیعت کی وجہ ایک جگہ پر مستقل کام نہیں کیا۔ چنانچہ لندن میں ملازمت کے دوران بھی انہوں نے دیگر ممالک میں نوکری کے لئے درخواستیں دی جس میں ایک دفعہ پھر قسمت نے ان کا ساتھ دیا اور انہیں سعودی عرب میں سعودی ایئر لائنز میں بطور انگریزی انسٹرکٹر ملازمت مل گئی، یوں وہ لندن سے سعودی عرب چلے گئے اور وہاں سترہ سال تک بطور انسٹرکٹر کام کیا۔ احمد پراچہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''۹ فروری ۱۹۸۰ء کو سعودی عرب چلے گئے اور سعودی ایئر لائنز جدہ میں انگریزی کے انسٹرکٹر کی حیثیت سے تعینات کئے گئے۔ (۳۵)

جب راہیؔ سعودی عرب گئے تو پہلی بار ایک طویل عرصے تک انہوں نے سعودی عرب میں قیام کیا اور ایک ہی ادارے سے منسلک ہو کر سترہ سال گزارے۔ سعودی عرب میں سترہ سال کی ملازمت کے بعد ۸ اگست ۱۹۹۶ء کو راہیؔ اپنے آبائی شہر کوہاٹ واپس لوٹے۔ اپنی واپسی کے بارے میں راقمہ کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے بتایا:

> ''میں ۱۹۷۷ء میں تین ماہ کے لئے جرمنی گیا تھا۔ پھر اڑھائی برس برطانیہ میں گزارے، سترہ برس سعودی عرب میں ملازمت کی اور آخر کار ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔'' (۳۶)
>
> کتنے حسین لوگ تھے، کیا شہر تھے مگر
> دنیا میں گھوم گھام کے میں گھر ہی آ گیا۔'' (۳۷)

وطن واپسی پر انہوں نے آٹھ سال تک مختلف تعلیمی اداروں کی سربراہی کی، جن میں آرمی پبلک سکول کوہاٹ، آرمی پبلک سکول مظفر آباد، آرمی پبلک سکول مانسہرہ کیمپ اٹک، جمال انگلش ایجوکیشن اکیڈمی چکدرہ، پی۔اے۔ایف ڈگری کالج کوہاٹ (فضائیہ کالج)، کیڈٹ کالج چکدرہ اور جمال انگلش ایجوکیشن اکیڈمی (بارد یگر) شامل ہیں۔سب سے آخر میں ۲۰۰۴ء میں انہوں نے کوہاٹ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (KUST) میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر (شعبۂ انگریزی) کام کیا۔ ۲۰۰۶ء میں اسی یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے چیئر مین بنے اور اپنی گراں قدر خدمات انجام دیتے ہوئے تقریباً گیارہ سال تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔راہیؔ نے مختلف مقامات پر مختلف ممالک میں ملازمت کی اور مختلف مقامات پر مختلف اداروں سے وابستہ رہے۔ان کے مطابق اگر وہ آغاز ہی میں کسی جامعہ سے وابستہ ہو جاتے تو غالباً بار بار پٹڑیاں بدلنے کی نوبت نہ آتی۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ راہیؔ ملازمت کے سلسلے میں جہاں بھی رہے اور جہاں بھی انتظامی عہدوں پر رہ کر اپنی خدمات انجام دیں، کسی ادارے نے بھی انہیں خود سبکدوش نہیں کیا بلکہ ہمیشہ انہوں نے خود استعفیٰ دیا ہے اور اس بات کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک اصول پرست انسان ہیں۔

بقول شاہد زمان:

> ''شجاعت علی راہیؔ ایک با اصول انسان ہیں۔اصولوں کی پاسداری پر وہ کبھی بھی سودے بازی نہیں کرتے''۔(۳۸)

تخلیقی سفر کا آغاز اور ادبی سرگرمیاں:

احمد فراز کی سرزمین کوہاٹ نے ہر دور میں بالا قد سخن وروں کو جنم دیا ہے گو کہ یہ خطہ سنگلاخ چٹانوں مشتمل ہے لیکن پھر بھی بڑے بڑے نام اس سے موسوم ہیں، جو اس کی عظمت کو بام عروج تک پہنچاتے ہیں۔اس بارے میں طاہر یوسف ہاشمی میں لکھتے ہیں:

> ''کوہاٹ کے سنگلاخ، بنجر اور طوفانی ہواؤں کی زد میں آنے والے میدان اور پہاڑ، شاعروں اور پتھروں کو جنم دیتے رہے ہیں۔لیکن اس پر جلال اور خشک لینڈ اسکیپ میں جو پتھروں اور چٹانوں پر مشتمل ہے۔خالص اور تازہ پانی کے ٹھنڈے میٹھے چشموں کی وادی بھی ہے، جہاں پھول کھلتے ہیں جو موسم گل کی رسیلی صبحوں میں نشیلی ہواؤں میں سرخوشی سے جھومتے ہیں اور سخن ور اسی غنائی جذبۂ بے اختیار کو شعر کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔(۳۹)

سو احمد فرازؔ اور شجاعت علی راہیؔ جیسے نامور شاعروں نے بھی اس خطے کی غنائیت کے زیر اثر شاعری کے میدان میں اپنا نام و مقام پیدا کیا۔فرازؔ کی طرح راہیؔ کو بھی ادبی ماحول اپنے گھر سے ہی ملا۔اس بارے میں فارغ بخاری لکھتے ہیں

> ''کوہاٹ میں فرازؔ کی طرح راہیؔ کو بھی شعری ذوق ورثے میں ملا ہے۔راہیؔ کے والد فیاض علی شاہ اور فرازؔ کے والد آغا برق کوہاٹی مرحوم بھی قدیم مکتبہ فکر کے خوش فکر شاعر ہیں''(۴۰)

راہیؔ کا پورا گھریلو ماحول ادبی تھا، نہ صرف ان کے والد آغا ماہر نقوی شعروشاعری کرتے تھے بلکہ ان کے بھائی بریگیڈیئر طلعت امتیاز نقوی بھی شاعر ہیں۔ ان کی بہنیں بھی تخلیقی صلاحیتوں کی مالک تھیں ۔ بڑی بہن فرحانہ تزئین نے غزلیں لکھیں۔ چھوٹی بہن فرزانہ شرین نے غزلیں، نظمیں اور افسانے لکھے۔ ان کی خالہ طلعت نشاط اپنے دور کی مشہور افسانہ نگار تھی جن کے افسانے دہلی اور دوسرے ادبی جریدوں میں بھی چھپے۔

راہیؔ کی تخلیقی زندگی کا آغاز زمانہ طالب علمی سے ہی ہوا۔ جب وہ چھٹی جماعت میں تھے تو انہوں نے اپنی پہلی کہانی ''بہار'' لکھی، جو ۱۹۵۷ء میں ایک فلمی جریدے ماہنامہ ''شباب'' کراچی نے شائع کی۔ بچپن سے انہیں کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اور بہت سے بڑے بڑے ناول نگاروں کے ناول پڑھے۔ سینگڑھ کی ''ضرار'' لائبریری سے ایک آنہ فی دن کے حساب سے ناول لاتے تھے اور رات بھر ان کا مطالعہ کرتے تھے یہاں تک کہ صبح ہو جاتی تھی ۔ جماعت ہشتم میں انہوں نے شعروشاعری شروع کر دی اور اپنی پہلی باقاعدہ غزل لکھی جس کا مقطع مندرجہ ذیل ہے:

جب کوئی پیار سے کہتا ہے کہ راہیؔ راہیؔ
میں سمجھتا ہوں مجھے تو نے پکارا ہو گا

ان کی پہلی غزل غلام حیدر اختر کے ہفت روزہ ''ہمدم'' کوہاٹ میں شائع ہوئی۔ پہلی مطبوعہ غزل کا مطلع تھا:

فلک پہ ہم کو ستارے نظر نہیں آتے
شب الم کے سہارے نظر نہیں آتے

شاعری کے میدان میں ان کے استاد جناب ایوب صابر (مرحوم) تھے جو جناح میونسپل لائبریری کے لائبریرین تھے اور ایک بہت ہی عالم و فاضل شخصیت اور اردو و پشتو کے بہترین شاعر تھے۔ راہیؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو نکھارنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ شاعری میں ان سے اصلاح لینے کے حوالے سے راہیؔ کہتے ہیں:

''شاعری کا آغاز کیا تو صوبہ سرحد میں بالعموم اور کوہاٹ میں بالخصوص ایوب صابرؔ مرحوم کا طوطی بول رہا تھا۔ میں نے انہی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ ان کی یادیں اب بھی میرے لئے روشنیٔ جاں ہیں۔ وہ ایک جی دار فنکار اور ایک بے ریا انسان تھے۔''(۴۱)

راہیؔ اسکول اور کالج کے زمانے سے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ بین الکلیاتی مشاعروں میں اپنے کالج کی نمائندگی کرتے ہوئے درجنوں مقامات سے انعامات اور ٹرافیاں حاصل کیں۔ گورنمنٹ کالج لائلپور (فیصل آباد) اور اسلامیہ کالج لائلپور سے دو دنوں میں چھ انعامات وصول کئے۔ ان انعامات کی تفصیل راہیؔ نے راقمہ کو اپنے مصاحبے میں یوں بتائی:

''لائلپور (فیصل آباد) سے میں نے دو دنوں میں اکیلے چھ بہترین انعامات حاصل کئے۔ گورنمنٹ کالج لائلپور سے نظم میں اوّل، غزل میں اوّل اور ٹرافی وصول کی۔ اسی طرح ایک روز کے وقفے سے اسلامیہ کالج لائلپور سے نظم میں اوّل، غزل میں اوّل اور ٹرافی انعام میں پائی۔''(۴۲)

انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور اور شیخوپورہ کے بین الکلیاتی مشاعروں میں حفیظ جالندھری اور احمد ندیم قاسمی جیسے عظیم ادبی شخصیات سے ملاقات کی، جس پر ان کو فخر ہے۔ اس بارے میں اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''اسلامیہ کالج پشاور کے ایک بین الکلیاتی مشاعرے میں قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کے ہاتھوں غزل پر انعام حاصل کیا۔'' (۴۳)

اس کے بعد بین الکلیاتی مشاعروں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ بے شمار مشاعروں میں انہوں نے اپنے فن کا جادو جگایا۔ جہاں بھی گئے سامعین محفل پر چھائے رہے اور ڈھیروں انعامات وصول کر کے واپس لوٹے۔ انہی مشاعروں میں راہیؔ کے ساتھ ریاض مجید ندیم ہاشمی، حسن سجاد سید، امجد اسلام امجد، سرمد صہبائی، خالد طور، خالد شریف، منتظر نقوی، مسرور کیفی، عون محمد رضوی، بشیر بختیار اور دیگر بڑے بڑے شعرا شریک ہوتے تھے۔ راہیؔ نے غزل کے علاوہ مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، جن میں نظم، افسانہ، ناولٹ، بچوں کے لئے مختصر کہانیاں اور ڈرامے جیسی تخلیقات شامل ہیں۔

شجاعت علی راہیؔ بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں، اس لئے ان کی پہچان شاعری کے حوالے سے زیادہ مستحکم ہے۔ لیکن انہوں نے دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے سات شعری مجموعے چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ اُنہوں نے ایک آپ بیتی اور افسانوں کا مجموعہ بھی تحریر کیا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ شجاعت علی راہیؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''برف کی رگیں'' ۱۹۷۲ء میں آئینہ ادب لاہور سے شائع ہوا جس پر انہیں آباسین آرٹس کونسل پشاور کا سالانہ ایوارڈ ملا۔

۲۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''پھول کھلے یا نہ کھلے'' ۱۹۸۵ء میں ماورا پبلشرز کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ جس کی رونمائی کی تقریب سعودی عرب (جدہ) میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب کی پوری تفصیل روزنامہ ''سعودی گزٹ'' جدہ نے شائع کی۔

۳۔ تیسرا شعری مجموعہ ''چراغ گل نہ کرو'' ۲۰۰۹ء میں ماورا پبلشرز نے ہی شائع کیا جن پر انہیں سردار عبدالرب نشتر ایوارڈ ملا۔

۴۔ چوتھا مجموعہ کلام ''ہجرت مسلسل'' بھی ماورا پبلشرز نے ۲۰۱۲ء میں شائع کیا۔

۵۔ ان کا پانچواں شعری مجموعہ ''نور علیٰ نور'' ہے یہ مجموعہ بھی ماورا پبلشرز نے ۲۰۱۲ء میں شائع کیا۔

۶۔ ان کا چھٹا مجموعہ ''نالہ شب گیر'' مناجات پر مشتمل ہے جو ۲۰۱۷ء میں شعیب سنز اینڈ بک سیلرز، سوات نے شائع کیا۔

۷۔ ساتواں مختصر شعری مجموعہ ''ابابیلیں'' (سونشتر) ہے، جو ۲۰۱۸ء میں شعیب سنز نے چھاپا۔

۸۔ ''آوازوں کا جنگل'' ان کا افسانوی مجموعہ ہے جو K&H پبلشرز نے ۲۰۱۲ء میں شائع کیا۔

۹۔ انہوں نے ''بلیک باکس'' کے نام سے اپنی ایک خودنوشت تحریر کی۔ وہ بھی K&H پبلشرز نے ۲۰۱۸ء میں چھاپی۔

شجاعت علی راہیؔ نے نہ صرف بڑوں کے لئے شاعری کی اور لکھا بلکہ بچوں کے لئے بھی بے شمار نظمیں، ناولٹ، مختصر کہانیاں اور ڈرامے لکھے اور بامقصد ادب تخلیق کیا۔ اس بارے میں احمد پراچہ لکھتے ہیں:

> ''شجاعت علی راہیؔ نے جہاں بڑوں کے لئے شاعری کی ہے، وہاں وہ مستقبل کے معماروں کے لئے بھی شاعری کرتا ہے۔ اس نے بچوں کے لئے بے شمار نظمیں لکھی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بچوں کی نفسیات کو بخوبی سمجھتا ہے''(۴۴)

بچوں کے لئے ان کی تخلیقات ملاحظہ ہوں:

۱۔ بچوں کے لئے شاعری:

۱۔	زمِ شگوفے	طفیل آرٹ پرنٹرز، ۱۹۸۳ء
۲۔	الف سے امی	K&H پبلشرز اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
۳۔	ذرا سوچو تو (قطعات)	ایضاً
۴۔	مطلب بے مطلب (نان سینس رائمز)	ایضاً
۵۔	مشاعرے	K&H پبلشرز، اسلام آباد ۲۰۱۳ء

۲۔ بچوں کے لئے ناولٹ:

۱۔	باغی چیونٹیاں	K&H پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء	
۲۔	تتلیوں کا میلہ	ایضاً	
۳۔	ڈائنا سور کیوں غائب ہو گئے؟ شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۷ء		
۴۔	بلی کی آپ بیتی	ایضاً	۲۰۱۷ء
۵۔	کبوتر	ایضاً	۲۰۱۷ء
۶۔	بولتے برگد	ایضاً	۲۰۱۸ء
۷۔	سُرخ سیارہ	ایضاً	۲۰۱۹ء
۸۔	ماں (غیر مطبوعہ)		
۹۔	قہقہہ (غیر مطبوعہ)		
۱۰۔	حیرت انگیز (غیر مطبوعہ)		
۱۱۔	عظیم لوگوں کے عظیم خواب (غیر مطبوعہ)		
۱۲۔	بچے: ڈوریمان، جاپان اور پاکستان (غیر مطبوعہ)		

۳۔ مختصر کہانیاں (مجموعے)

۱۔ ہم نے زردہ کھایا — K&H پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

۲۔ چڑیوں کی چہکار — شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز سوات، ۲۰۱۸ء

۴۔ بچوں کے لئے ڈرامے:

۱۔ شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا — شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز سوات، ۲۰۱۸ء

۲۔ بچے ہوں تو ایسے ہوں — شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز سوات، ۲۰۱۹ء

یوں بڑوں کے ساتھ بچوں کے لئے بھی ان کی تخلیقات کی ایک لمبی فہرست بن جاتی ہے۔ شجاعت علی راہیؔ نے اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی شاعری کی۔ ان کی انگریزی نظمیں بین الاقوامی ویب سائٹس پر موجود ہیں اور اس کے علاوہ ان کی نظموں پر کئی بین الاقوامی تبصرے بھی شائع ہوتے ہیں۔ ادبی مجلہ ''نایاب'' کوہاٹ نے شجاعت علی راہیؔ نمبر جنوری ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔

پاکستان ٹیلی وژن اور ریڈیو پاکستان سے ان کی غزلیں، نظمیں گیت، سلام، تبصرے، بچوں کی کہانیاں اور انٹرویوز بھی نشر ہو چکے ہیں۔ کوہاٹ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے کیمپس ریڈیو نے بھی ان کا انٹرویو نشر کیا ہے۔

اس کے علاوہ راہی کی تخلیقات مختلف ملکی وغیر ملکی رسائل و جرائد میں شائع ہوئیں ہیں۔ جن میں ''فنون''، ''افکار''، ''اوراق''، ''سیپ''، ''ماہِ نو''، ''نصرت''، ''سویرا''، ''نیا دور''، ''ادب لطیف''، ''ابلاغ''، ''قند''، ''احساس''، ''نیرنگ خیال''، ''شاعر''، ''تخلیق''، ''تجدید نو''، ''قندیل''، ''اجرائ''، ''قرطاس''، ''اقدار''، ''ادبی دنیا''، ''نئی قدریں''، ''اردو انٹرنیشنل تحریریں''، ''دوشیزہ''، ''اخبارِ جہاں''، ''اخبار خواتین''، ''سٹی میگ''، ''سیارہ ڈائجسٹ''، ''اردو ڈائجسٹ''، ''رابطہ''، ''ادبی ڈائجسٹ''، ''نایاب''، ''راوی''، ''بیسویں صدی''، اور کئی دوسرے اخبارات و رسائل و جرائد شامل ہیں۔

راہیؔ کے اس تخلیقی سفر میں اُن کے احباب اور ہم فن ساتھیوں کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ المختصر ان کا تخلیقی سفر ہنوز جاری ساری ہے اور اسی آب و تاب سے آگے بھی جاری رہنے کا قوی امکان ہے۔

۲۔ شخصیت:

شخصیت بنیادی طور پر علم نفسیات کی ایک شاخ ہے۔ یہ انسان کے ظاہری خدوخال، افعال و اعمال، حرکات و سکنات، عادات و اطوار، خیالات و تصورات اور داخلی کیفیات و تاثرات سے تشکیل پاتی ہے۔ اس میں انسان کے میلانات، رجحانات، عقائد و نظریات اور پسند و ناپسند تمام چیزیں شامل ہوتی ہیں۔

یوں شخصیت سے مراد ظاہری حسن، خوب صورتی اور دیدہ زیب خدوخال نہیں بلکہ اس سے مراد وہ صفات اور خصوصیات ہیں جو کسی فرد میں خاص طور پر پائی جاتی ہیں۔ ہر فرد اپنی مخصوص صفات کی بناء پر انفرادی شخصیت کا مالک ہوتا

ہے۔حتیٰ کہ ایک معصوم بچہ جس کا عملی زندگی میں کوئی حصہ و کردار نہیں ہوتا، وہ بھی چند منفرد خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وہ بچہ پروان چڑھتا ہے، اس کے خیالات و تصورات اور تجربات اس کی شخصیت میں نکھار پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ کرامت حسین جعفری اس حوالے سے میں لکھتے ہیں:

''شخصیت کسی فرد کے منفرد خصائص کی تنظیم ہوتی ہے، جس پر افراد کے کردار کا خصوصی پیہم انداز مختصر ہوتا ہے۔''(۴۵)

مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر عبدالرؤف شخصیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''انسان کے تمام محاسن اور مصائب کی مکمل تصویر کا نام شخصیت ہے۔ شخصیت ان تمام جسمانی، ذہنی، جذباتی، معاشرتی اور تمدنی اوصاف کا نام ہے جو کسی شخص میں ایک اکائی کی حیثیت سے کام کرتے ہیں''۔(۴۶)

شجاعت علی راہیؔ حلیے کے اعتبار سے دبلے پتلے باریک نقوش اور تیکھے خدوخال رکھتے ہیں۔ وہ پتلے پتلے ہونٹ، کشیدہ قامت رکھنے والے ایک خوش شکل اور شریف النفس انسان ہیں۔ عموماً کلین شیو بناتے ہیں۔ گندمی رنگت اور کشادہ پیشانی کے مالک ہیں۔ ہاتھ پاؤں متناسب ہیں۔ چہرے سے شرافت اور ذہانت ایک ساتھ ٹپکتی ہے۔

عام طور پر شلوار قمیص پہنتے ہیں۔ تاہم تری پیس سوٹ، اور پینٹ شرٹ میں بھی ملبوس نظر آتے ہیں۔ شاید اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ دیارِ غیر میں بھی طویل عرصہ تک ملازمت سے منسلک رہے ہیں۔ راہیؔ انتہائی نرم گفتار اور دھیما لب و لہجہ رکھتے ہیں کہ دیکھنے اور سننے والا آپ کے لہجے کی شیرینی اور گھلاوٹ سے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ ایک گداز دل اور شائستہ مزاج رکھتے ہیں۔ محسن احسان ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شجاعت علی راہیؔ پتھروں اور چٹانوں کی سرزمین میں جنم لینے کے باوجود ایک گداز دل اور سبک سوچ کا مالک ہے۔ اس کے مزاج کی شائستگی اور اس کی طبیعت کی سادگی کی جھلک اس کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔''(۴۷)

شجاعت علی راہیؔ اپنے تخلص، راہیؔ کی طرح اگرچہ ہر وقت پابہ رکاب رہے اور مختلف ممالک کی سیر کی، لیکن اس کے باوجود ان کی گفتگو اور رکھ رکھاؤ میں سادگی کا عنصر غالب ہے۔ نمائش اور شیخی بگھارنے والے لوگوں میں سے نہیں اور نہ ہی اپنی تعریف خود کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو کے بارے میں طاہر یوسف ہاشمی لکھتے ہیں:

''وہ ایک خاموش طبع لیا دیا رہنے والے اور سنجیدہ شخص ہیں جنہیں اپنی تعریف آپ کرنے کا عارضہ لاحق نہیں ہے۔ ان کی قلندرانہ صفت، ان بہت سے شیخی بگھارنے والوں کے انداز سے سراسر مختلف ہے جو اپنی صفات کا ڈھنڈورا پیٹنا ضروری سمجھتے ہیں''۔(۴۸)

راہیؔ چونکہ عہد طفولیت سے خود محنتی تھے، یہاں تک کہ ان کی پیشہ ورانہ زندگی بھی مسلسل محنت اور کوشش سے عبارت ہے، اس لئے دوسروں کی بھی سفارش کرنے اور سننے کے روادار نہیں۔ ان کے ایک دوست سید مشیر حیدر نقوی

صاحب نے راقمہ کو اس حوالے سے ایک انٹرویو میں بتایا:

''راہیؔ صاحب کو سفارش سے سخت نفرت ہے۔ کسی کی سفارش ماننے کی بجائے انھوں نے استعفیٰ دینا قبول کیا ہے نہ کہ سفارش ماننا''۔(۴۹)

اس بارے میں خود راہیؔ صاحب کا کہنا ہے:

''اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہو کہ میں نے اُس کی سفارش کی ہے اور اس کے ساتھ بے جا رعایت سے کام لیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے''۔(۵۰)

راہیؔ ایک سچے اور کھرّے انسان ہیں۔ ایک فرض شناس، مردم شناس، با اُصول اور ایک پُر اعتماد دوست بھی ہیں۔ یہاں تک کہ ضرورت کے وقت دوستوں کے لیے تکالیف برداشت کرنے والوں میں سے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں ان کی اصول پرستی ان کی دوستی سے متضاد ہوتی ہے تو وہاں جیت صرف ان کے اصولوں کی پاسداری کی ہی ہوتی ہے۔ ان کے ایک دوست محترم شاہد زمان صاحب اس بارے میں کہتے ہیں:

''جہاں اصول اور دوستی میں سے کسی ایک کی قربانی دینی پڑے تو وہاں راہی صاحب اُصولوں کے بجائے ہمیشہ دوستی کی قربانی دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔''(۵۱)

اسی طرح مشیر حیدر نقوی ہفت روزہ ''انقلاب'' میں راہیؔ صاحب کی شخصیت اور ان کے با اُصول ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''سید شجاعت علی راہیؔ صاحب کی شخصیت عناصر ہفتہ کا مجموعہ ہے۔ کردار میں، گفتار میں، صلہ رحمی واصول پرستی میں، ایثار و قربانی میں، ملنساری و تواضع میں، خوش لباسی و خوش خلقی میں اور خندہ پیشانی اور خندہ روئی میں آپ کی مثال نہیں ملتی۔ با اُصول ایسے کہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے، حق گوئی وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، اس کے عوض انہیں چاہے کتنی بڑی سے بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔''(۵۲)

راہیؔ کے قول و فعل میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا، جو بات ان کے دل میں ہوتی ہے وہی ان کی زبان پر ہوتی ہے۔ گویا شعر اور عملی زندگی میں وہ ایک جیسے ہیں۔ وہ عزت کرنے اور دینے والے انسان ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ دوسروں کو عزت دینا گویا اپنی عزت کرنے کے برابر ہے وہ گھر والوں سے لے کر اپنے طالب علموں، رشتہ داروں اور یہاں تک کہ گھر کے نوکروں کو بے حد عزت دینے والے انسان ہیں۔ کیونکہ وہ ایک ہمدرد اور محبت بھرا دل رکھتے ہیں۔

راہیؔ کی شخصیت میں تعصب نام کی کوئی چیز نہیں۔ وہ نہ کسی رشتہ دار سے تعصب رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی شاعر سے۔ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شاعر اپنے آپ کو ایک بڑا شاعر گردانتا ہے اور تعصب کی بناء پر کسی کی عظمت کو تسلیم نہیں کرتا لیکن راہیؔ کے ہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ برملا ان شخصیات، ادیبوں اور شعراء کے نام لیتے ہیں جن کے کلام اور فن سے وہ متاثر ہوئے۔

بقول ان کے:

''میں ہر چھوٹے بڑے ادیب اور شاعر سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوں۔ جہاں بھی مجھے لفظ وخیال کا جگنو ملا، میں نے اس کی روشنی سے اپنا من اُجالا۔ تاہم گنوانا شاید میرا فرض ہے۔ غالبؔ، فیضؔ، فرازؔ، ندیمؔ، قرۃ العین حیدرؔ، اے حمیدؔ، جمیلہ ہاشمیؔ، ممتاز مفتیؔ، قاضی عبدالستارؔ۔'' (۵۳)

راہیؔ منافقت جیسی اخلاقی برائی سے بالکل بھی پاک ہیں۔ دوستوں کے لیے جتنے نرم خو ہیں تو دشمنوں کے لئے اُتنے ہی درشت خو ہیں وہ ان دونوں جذبوں میں شدت کے قائل ہیں۔ ان کے دوست نسیم سحرؔ اس بارے میں لکھتے ہیں:

''شجاعت علی راہیؔ منافقت پر یقین نہیں کرتے۔ اگر وہ دوست ہے تو دشمنی نہیں کریں گے اگر وہ دشمن ہے، تو ان سے کسی دوستانہ لب ولہجے کی توقع مت رکھیے گا۔ وہ جب اور جہاں جس کسی کے بارے میں جس طرح کے احساسات رکھتے ہیں ان کا برملا اظہار کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ جلال کے عالم میں ان کی تیسری آنکھ بند ہو جاتی ہے اور وہ مدِ مقابل کی کوئی دلیل، کوئی صفائی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ مدِ مقابل کو موسم خوشگوار ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے''۔ (۵۴)

راہی کو کھانے میں میٹھا بہت پسند ہے۔ اس لئے اکثر اوقات کھانے کا آغاز سویٹ ڈش سے ہی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پھلوں میں بھی انھیں کھجور زیادہ پسند ہے۔

راہیؔ نے بطور پرنسپل کئی اچھے اداروں میں اپنی خدمات انجام دیں۔ اس دوران جن اساتذہ نے آپ کے ساتھ کام کیا اور جو طالب علم آپ کے زیر سایہ تحصیل علم میں مشغول رہے، سب نے آپ کی اصول پسندی، ایمانداری، باقاعدگی، فرض شناسی، اور انسان دوستی کا اعتراف کیا ہے۔

ہر انسان میں جہاں اللہ تعالیٰ نے کچھ صفات اور خوبیاں ودیعت کی ہوتی ہیں وہاں کچھ خامیاں بھی ضرور ہوتی ہیں۔ شجاعت علی راہیؔ نے ریڈیو پاکستان کوہاٹ کو ایک انٹرویو میں اپنے کردار کی کچھ خامیوں کے بارے میں اس طرح بتایا:

''میں اپنے کرم فرماؤں، بہی خواہوں اور دوستوں کا انتہائی ممنون ہوں کہ وہ میرے بارے میں حسن ظن رکھتے ہیں۔ لیکن ریکارڈ درست رکھنے کے لیے یہ میرا فریضہ بنتا ہے کہ میں بتاتا چلوں کہ مجھ میں وہ ساری خرابیاں موجود ہیں جو ایک عام انسان میں پائی جاتی ہیں یا جو فنکاروں یا شاعروں کی طبیعت کا خاصہ ہیں۔ بلکہ شاید یہ خرابیاں مجھ میں دوسروں سے کہیں زیادہ ہیں۔ میں بچپن ہی سے انتہائی بھلکڑ ہوں، ضدی ہوں، انا پرست ہوں، اپنے جذبات کا بھرپور طریقے سے اظہار کرنے سے قاصر ہوں''۔ (۵۵)

اس کے علاوہ راہی کی طبیعت اور مزاج میں ایک اور چیز جو دیکھنے کو ملی ہے اور جس کی تصدیق رحیم گل نے بھی کی ہے، وہ اس کی تیز رفتاری اور سیماب صفتی ہے۔ وہ زندگی کے سارے کام جلدی جلدی کرنے اور اپنی راہیں تبدیل کرتے رہنے کے عادی ہیں۔ جس تیزی سے وہ شعر کہتے تھے اس تیزی سے اُنہوں نے ڈگریوں پہ ڈگریاں بھی حاصل کیں اور اسی

طرح پیشہ ورانہ زندگی میں بھی مختلف پیشوں کو اپناتے گئے۔ رحیم گل ان کی شخصیت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''وہ ہر کام وقت سے پہلے کرنے کا بھی عادی ہے۔ اس نے شادی کرنے میں بھی جلدی دکھائی، اگر فطرت آڑے نہ آتی تو وہ نو ماہ کی بجائے چھ ماہ میں باپ بننے کا شوق پورا کر لیتا۔ بہر حال شکر ہے کہ یہاں اس نے وقت کی پابندی کو ملحوظ رکھا۔ اور دو سال میں غزل اور قندیل کا باپ بنے پر اکتفا کیا۔ مگر اس کی جلد بازی کا باب بند نہ ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے ٹی وی کا پروڈیوسر بن گیا۔(۵۶)

راہیؔ نے مختلف زبانیں سیکھی، لیکن بقول ان کے کسی بھی زبان پر انہیں مکمل عبور حاصل نہیں ہوا۔ ہر زبان کے لکھنے اور بولنے میں اُن سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، جس کی تصحیح کے لئے انھیں اکثر اوقات ڈکشنریوں اور حوالوں کی کتابوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ کوئی بھی تحریر لکھتے وقت وہ ہر صفحے پر بہت ساری غلطیاں کر جاتے ہیں جن کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں اور ہزار تقریریں اور لیکچرز دینے کے باوجود بھی بھری محفل میں بولنے سے کتراتے ہیں۔ تقاریب اور مشاعروں سے دور بھاگتے ہیں۔ اس بارے میں اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے زندگی میں اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں صفحات لکھ لکھ کر کالے کئے ہیں۔ سینکڑوں تقریریں کی ہیں، ہزاروں لیکچر دیئے ہیں۔ مگر اب تک وہی بے چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی۔ سو اب بھی ہے۔ آج بھی لکھتے اور بھری محفل میں بولتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے''۔(۵۷)

راہیؔ کے نزدیک اُن کی سب سے بڑی خامی ان کا کمزور حافظہ ہے جس کی بناء پر وہ ہر قسم کی انتظامی ذمہ داریاں سنبھالنے پر ہچکچاتے ہیں۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے کئی اداروں میں کام کیا، اور بہت اہم ذمہ داریاں نبھائیں۔ مگر آج بھی انتظامی امور نبھاتے ہوئے خائف رہتا ہوں اور میری ہر ممکن کوشش رہتی ہے کہ مجھے ذمہ داریوں سے دور ہی رکھا جائے۔ اس خوف کی ایک اور وجہ میرا کمزور حافظہ ہے۔ میرا حافظہ بچپن سے بہت کمزور رہا ہے جبکہ زندگی کے ہر کام میں حافظہ کا عمل دخل رہتا ہے۔''(۵۸)

راہیؔ حافظے کی کمزوری کے ساتھ ساتھ غیر حاضر دماغی کا بھی گلہ کرتے ہیں۔ اُنہوں نے راقمہ کو اپنے ایک انٹرویو میں بتایا:

> ''غیر حاضر دماغی میرے مزاج کا حصہ ہے۔ میں نے آج تک موٹر کار ڈرائیو نہیں کی کیونکہ میں اس چیز کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا کہ گاڑی چلاتے وقت میرا دھیان بٹ جائے اور میری گاڑی کسی پر چڑھ دوڑے''۔(۵۹)

راہیؔ خط مستقیم پر سفر کرنے کے عادی ہیں۔ کسی بھی مشن میں اُن کی نظر صرف اپنے مقصد پر ہی فوکس رہتی ہے۔ راہیؔ کے مطابق بہت سے لوگ ان سے ناراض ہو جاتے ہیں، کیونکہ انہوں نے کبھی کسی کا کوئی کام نہیں کیا۔ اپنی اس عادت

کا خود اعتراف کرتے ہوئے اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے زندگی میں کسی کا کوئی کام کیا ہو۔اس معاملے میں بالکل کورا،نکھٹو، بے حس بلکہ بے درد ہوں۔ میں نے عزیزوں اور دوستوں کے کچھ کام تو اصول کی پاسداری کی وجہ سے نہیں کئے لیکن کئی بار ایسا بھی ہوا ہوگا کہ ایک کام نیکی کا تھا اور مجھے تعاون کرنا چاہیے تھا،لیکن میں نے اپنی سہل انگاری کی وجہ سے یہ کام نہیں کیا۔''(۶۰)

راہیؔ کے مطابق کچھ یار دوستوں نے اسے ان کی اصول پسندی سمجھ کر معاف بھی کر دیا، تاہم ان کی ہمیشہ سے یہ دلی خواہش رہی ہے کہ وہ ویسا ہی بن جائیں جیسا لوگ ان کے بارے میں گمان کرتے ہیں، مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔

المختصر راہیؔ گوشت پوست کے ایک چلتے پھرتے انسان ہیں۔ شاعر اور ادیب ہونے کے ناطے ایک حساس دل رکھتے ہیں۔ان کی زندگی کا چوہترواں سال رواں دواں ہے۔ چوہتر سال کی عمر میں بھی اُن کے اندر چُستی اور اصول پسندی ہے جو دور جدید کے نوجوان طبقہ کے لئے ایک روشن مثال اور قابل رشک بات ہے۔ وہ معاشرے میں اعلیٰ اقدار کی پاسداری کے لیے جینے اور مرنے والے لوگوں میں سے ہے۔ گویا ایک فرض شناس انسان کی تمام خوبیاں ان کی ذات میں بدرجہء اتم موجود ہیں۔ بلاشبہ یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا کہ راہیؔ جیسے عظیم معتبر لوگ دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا خصوصی ذین ہوتے ہیں۔

ے ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے۔
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا(۶۱)

۳۔ ادبی خدمات:

الف۔ شاعری:

ا۔ غزل:

اردو ادب کے فروغ میں جہاں پاکستان کے دیگر صوبوں نے اپنا اہم کردار ادا کیا۔ وہاں خیبر پختونخوا نے بھی اس میں اپنا حصہ ڈالا اور اردو ادب کے دامن کو بیش قیمت خزائن سے مالا مال کیا۔

اردو ادب کے دیگر اصناف کی طرح غزل کی صنف کو بھی اس خطے نے رونق بخشی۔غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول اور قدیم صنف ہے۔غزل کا ماخذ عربی قصیدے کا ابتدائی حصہ ''تشبیب'' ہے جس میں شاعر موضوع سے ہٹ کر محبت کی داستان اور ہجر و وصال کا قصہ چھیڑ کر اپنی محبوبہ کو یاد کرتا ہے،لیکن آج غزل جس شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اُس کی یہ صورت ایرانی شاعری میں ملتی ہے۔اس بارے میں گوہر نوید کا ٹلنگ لکھتے ہیں:

''غزل ایرانی مرغزاروں میں پلی بڑھی اور جواں ہوئی اور وہیں سے اردو کے خیابانوں میں آئی۔اور یہاں کے مرغانِ چمن نے شعراء کو نغموں پر اکسا کر غزل کو عروج عطا کیا۔''(۶۲)

فارسی شعراء کے ہاں غزل میں معاملات حسن وعشق نے غزل کو انسانی جذبات واحساسات کا آئینہ دار بنایا۔ اس طرح اس میں ہر طرح کے مضامین سماتے گئے اور یہ دل کی ہر کیفیت، وقت کی ہر ضرورت اور حالات کی ہر گردش کا ترجمان بنتی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ اُردو شعرا کی مقبول ترین صنف بن گئی۔

اردو غزل، ولی دکنی کی غزل گوئی سے لے کر آج کے غزل گو شعراء تک بتدریج نت نئے تجربات سے گزر کر ترقی کرتے ہوئے اور بھی نکھرتی چلی گئی۔ اس صنف نے جمود کو کبھی قبول نہ کیا۔ بیسوی صدی کے نصفِ آخر میں اردو شاعری میں غزل کے لب ولہجہ میں واضح تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوگئی۔ غزل اپنے مخصوص اور دلفریب مضامین، استعارت، تشبیہات اور تراکیب سے باہر نکل آئی۔ غزل کے اس انقلابی سفر میں خیبر پختون خوا کی سرزمین نے بھی اپنا بھر پور حصہ ڈالا۔ اُردو غزل کا وہ دور جو ۱۹۳۵ء کے بعد آتا ہے، اسے فارغ بخاری نے دورِ جدید کا نام دیا ہے، جبکہ اس دور جدید میں خیبر پختونخوا کا نام ۱۹۴۷ء کے بعد آتا ہے۔ پہلے دور میں ضیاء جعفریؔ، فارغ بخاری، رضا ہمدانیؔ، قتیل شفائی اور شوکت واسطیؔ جیسے نامور شعراء کے نام آتے ہیں۔ دوسرے دور میں احمد فرازؔ، محسن احسانؔ، خاطر غزنوی، جلیل حشمی، سعدی احمد اختر، ایوب صابر، اور سلطان سکونؔ جیسے اہم شعراء شامل ہیں۔

جبکہ تیسرے دور کے اہم شعراء میں غلام محمد قاصر اور سجاد بابرؔ کے نام آتے ہیں، اسی دور سے تعلق رکھنے والوں میں دو اہم نام شجاعت علی راہیؔ اور سورج نرائن بھی شامل ہیں۔ خیبر پختونخوا میں پشاور کے بعد یہ شرف شہر سنگ وخشت ''کوہاٹ'' کو ہی حاصل ہے کہ اس خطے کے ادیبوں اور سخن وروں نے ادبی میدان میں قابل قدر خدمات انجام دیں ہیں۔ کوہاٹ سے تعلق رکھنے والے دیگر شعراء میں جان عاطف، انکل ریاض، اسلم فیضیؔ، انجم یوسف زئی اور شاہد زمان شامل ہیں۔ ان تمام شعراء نے اپنے خیال اور فکر کی بلندی سے اردو غزل کو ایک نئے رنگ وآہنگ اور جدت سے روشناس کیا۔ تاہم احمد فرازؔ کے بعد جو نام ومقام کسی شاعر کو نصیب ہوا۔ وہ یقیناً شجاعت علی راہیؔ ہی ہیں۔

شجاعت علی راہیؔ بیک وقت ایک شاعر اور ایک نثر نگار ہیں۔ انہیں زمانۂ طالب علمی سے ہی شعر وشاعری سے والہانہ شغف تھا اور اس وقت سے ہی اُن کے تخلیقی سفر کا آغاز ہوا، آج اُن کا شمار جدید دور کے ترقی پسند شعراء اور نثر نگاروں میں ہوتا ہے کیونکہ وہ صرف ادب برائے ادب کے قائل نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے پیروکار ہیں۔

راہیؔ چونکہ ملازمت اور مختلف کورسز کے حوالے سے اندرون ملک اور بیرون ملک کئی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ سفر اور مطالعے نے اُن کے مشاہدہ کو وسیع کیا اور کچھ انگریزی ادبیات نے بھی اُن کے ذہن کو وسعت اور جلا بخشی۔ اس لئے اپنے وسیع مشاہدات اور جذبات واحساسات کے اظہار کے لئے اُنہوں نے شاعری کا انتخاب کیا۔ شاعری میں انہوں نے نظم اور غزل دونوں کو برتا لیکن بنیادی طور پر غزل اُن کی پہچان کا سبب بنی۔ غزل میں انہوں نے ہر قسم کے مضامین کو جگہ

دی اور یہی اُن کے جذبات و احساسات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئی۔ بحیثیت شاعر شجاعت علی راہیؔ کے بارے میں قتیل شفائی یوں لکھتے ہیں:

> ''یوں تو کوہاٹ نے ہر دور میں بڑے نامور لوگ پیدا کئے ہیں، لیکن شجاعت علی راہیؔ کا ظہور ایک مجتہدانہ شان سے ہوا۔ وہ قدامت کے صحرا میں نئے پن کا خودرو پھول ہے۔ وہ لفظوں کے غوغا میں فکر کا خوبصورت نغمہ ہے۔ اس نے اپنے فن کا وہ افق تلاش کیا ہے جس پر مستقبل کے ان دیکھے چاند کی رسیلی کرنیں پھیل رہی ہیں۔'' (۶۳)

شجاعت علی راہیؔ جدید دور کے شاعر ہیں۔ ترقی پسند سوچ کے ساتھ زندگی کے حقائق دیکھنے اور پرکھنے کی حس رکھتے ہیں، جو ایک ادیب اور شاعر کا اصل منصب ہے۔ احمد ندیم قاسمیؔ ان کے بارے میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''شجاعت علی راہیؔ جدید دور کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو زندگی کے حسن اور رنگینی میں فنکار کا منصب کسی صورت فراموش نہیں کرتے۔ وہ اس معاشرے کے ایک ذمہ دار فرد ہیں۔ اُن کی غزلوں میں حقائق حیات کی چمک اس حقیقت کی شاہد ہے۔ (۶۴)

اب تک راہیؔ کے سات شعری مجموعے چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اُن کا پہلا مجموعہ ''برف کی رگیں'' ہے۔ جس نے ادبی دنیا میں دھوم مچائی، جس کا اعتراف فارغ بخاری نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''شجاعت علی راہیؔ نئے طرز احساس کا نوجوان شاعر ہے۔ اس کے پہلے شعری مجموعے ''برف کی رگیں'' ہی نے ادبی حلقوں کو چونکا دیا۔'' (۶۵)

راہیؔ کو اپنے شعری مجموعے ''برف کی رگیں'' پر آباسین آرٹس کونسل پشاور کا سالانہ ایوارڈ ملا۔ راہیؔ کا دوسرا شعری مجموعہ ''پھول کھلے یا نہ کھلے'' کی تقریب رونمائی سعودی عرب میں ہوئی۔ تیسرا مجموعہ ''چراغ گل نہ کرو'' ہے۔ جس پر انہیں شریف کنجاہی ایوارڈ اور سردار عبدالرب نشتر ایوارڈ ملا۔ اس کے بعد دو اور مجموعہ ہائے کلام ''ہجرت مسلسل'' اور ''نورٌ علیٰ نور'' ماورا پبلشرز کے زیر اہتمام شائع ہوئے۔ اُن کی شعری تخلیقات کا سلسلہ یہیں پر رکا نہیں اور مزید دو اور شعری مجموعے نالۂ شب گیر (مناجات) اور ابابیلیں (سونشتر) کے نام سے شعیب سنز پبلشرز کے زیر اہتمام شائع ہوئے۔ اپنے منفرد لب و لہجے اور اچھوتے مضامین کی بدولت راہیؔ کے تمام شعری مجموعوں نے اہل ذوق سے داد و تحسین وصول کی اور وہ اُن کے انداز بیان اور طرز سُخن کے گرویدہ بن گئے۔

راہیؔ کی شاعری، داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہے۔ وہ قدیم الفاظ کے استعمال سے جدید خیال کی آبیاری کرتے ہیں، جس سے قاری کو بیک وقت روایت اور جدت کے ایک ساتھ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کے مضامین نئے اور اچھوتے ہیں۔ ان کے کلام میں الفاظ کی بلندی کے ساتھ خیال کی بلندی بھی نظر آتی ہے۔ بہترین الفاظ و تراکیب کا چناؤ اور شعور کی فکر و رفعت انگیزی راہیؔ کی شاعری خصوصاً اُن کی غزل کا خاصہ ہے۔ اُن کی غزل کلاسیکیت، موسیقیت اور غنائیت سے بھرپور ہے، یہی وجہ ہے کہ کئی نامور گلوکاروں نے اُن کی غزلیں سروں کے ساتھ گائی ہیں۔

اُن کی ابتدائی دور کی غزلوں میں رومانیت کا جذبہ زوروں پر ہے۔ جو غزل چاہنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ندرت خیال، تصورات اور تخیلاتی دنیا کی سیر اُن کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں۔ راہیؔ رومانیت کے جذبے سے سرشار ہوکر چاند کی چاندنی میں کھو جاتے ہیں اور پھر چاندنی رات انہیں تخیل کی دنیا میں اس طرح لے جاتی ہے کہ اُسے محسوس ہوتا ہے:

چاندنی کو دیکھ کر یاد آ گیا وہ سیم تن
پھر بدن جلنے لگا، پھر جاگ اُٹھا درد کہن"۔(۶۶)

راہیؔ کے کلام کی ایک اہم خصوصیت ان کا رجائی پہلو ہے۔ امید، حوصلے اور رجائیت کا پیغام اُن کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ گوہر نوید رحمان اس بارے میں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"راہیؔ کے ہاں زندگی کا ایک ہمدردانہ اور رجائیت بھرا تصور موجود ہے، اس لئے اپنی کوتاہ قسمتی اور اہل وطن کی حرماں نصیبی پر کڑھنے کا دکھ اپنی جگہ، لیکن امید کی بادِ نسیم کی ایک ہلکی سی لہر ان کی غزل میں تیرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔(۶۷)

راہیؔ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس طبقے کے دکھ درد کو اچھی طرح محسوس کرتے ہیں، وہ اس امر کا شعور رکھتے ہیں کہ ہر شخص کسی نہ کسی دکھ میں مبتلا ہے۔ سجاد احمد حیدر لکھتے ہیں:

"راہیؔ کے کلام میں سماجی شعور کی جھلکیاں آسانی سے دیکھی جاسکتی ہیں کیونکہ یہ ان کے ہاں جا بجا پھیلا ہوا ہے اور اس کا اظہار انھوں نے بڑی خوبصورتی اور مہارت سے کیا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش میں پھیلی ہوئی حق تلفیوں اور ناانصافیوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں"(۶۸)

کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

پتھرا گئی ہے آنکھ اسی انتظار میں
شاید کوئی خلوص کا پتلا دکھائی دے (۶۹)
اس شہر سنگ وخشت میں رہتے ہیں آپ بھی
کیوں چپ ہیں آپ، آپ بھی پتھر اٹھایئے۔(۷۰)

راہیؔ کے کلام میں وطن دوستی کا پیغام بھی موجود ہے۔ اپنی مٹی کو ماں کی طرح چاہنا اور دھرتی کی گود میں ماں کی گود جیسا سکون پانا وہی بہتر سمجھ سکتا ہے جس نے پردیس کی ہوا کھائی ہو۔ راہیؔ نے چونکہ زندگی کا بیشتر حصہ بیرونِ ملک میں گزارا۔ اس لئے اسے دیس کی ہواؤں، دریاؤں، پھولوں اور لوگوں سے والہانہ محبت ہے۔ عمران خان اپنے ایم۔فل کے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں:

"یوں تو اپنی مٹی سے انسان کو فطرتی محبت ہوتی ہے، لیکن پرائے وطن میں اپنی دھرتی سے محبت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وطن کے ساتھ محبت اور اپنی مٹی کی سوندھی خوشبو کی دل کشی شجاعت علی راہیؔ کے کلام میں اس واسطے بھی زیادہ جوش کے ساتھ موجود ہے کہ آپ نے کئی ممالک کا سفر کیا اور بالآخر اپنی مٹی کی محبت انہیں کھینچ لائی"۔(۷۱)

میں خاک کے نشے کا مزا جان گیا ہوں

اب میرا سفر سوئے پرستاں نہیں ہوگا (۷۲)

راہیؔ چاند ستاروں کے رسیا معلوم نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی مٹی، دھرتی اور اپنے گھر کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنی قسمت پر خوش اور مطمئن ہیں:

مرے ستارے یہی ، ماہ و آفتاب یہی

یہ میرے گھر کا پُرانا چراغ گُل نہ کرو (۷۳)

اور شاعروں کی طرح راہیؔ کے ہاں بھی دنیا کے بے ثباتی اور فنا کے مضامین دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ زندگی کی بے ثباتی کو شمع کہتے ہیں کہ پگھلنا اور ختم ہونا اُس کی قسمت ہے۔

شمع کی طرح یہ چپ چاپ پگھل جاتی ہے

عمر جتنی بھی ہو، شام آتے ہی ڈھل جاتی ہے (۷۴)

زندگی موت کا دروازہ ہے

لوگ جانے کے لئے آتے ہیں (۷۵)

راہیؔ ایک حساس طبع شاعر ہیں۔ معاشرے میں چارسو پھیلی ہوئی ناہمواریوں، طبقاتی کشمکش اور اونچ نیچ، انسان پر انسان کے ظلم اور مذہب کے نام پر لوگوں کو گمراہ کرنے کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا اور اپنی شاعری کے ذریعے اس سے نفرت کا اظہار کر کے اُمید کا پیغام بھی دیا۔ اُن کی غزل میں جمالیاتی عناصر، وطن دوستی، درد وغم کے ساتھ ہجر وصال کی کیفیات، خودی، تصوف، روایت پسندی، تمثال نگاری اور سماجی شعور کا گہرا احساس پایا جاتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اپنی غزل کو فکری آفرینی بخشی بلکہ فنی لحاظ سے بھی آراستہ و پیراستہ کیا۔ ظاہری خوبصورتی دینے کے ساتھ ساتھ معنوی خوبیوں سے بھی مالا مال کیا۔

شاعری کو جو چیز انتہائی دلکش اور حسین بناتی ہے، وہ مختلف صنعتوں یعنی تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور امیجری کا خوب صورت اور باقرینہ استعمال ہے۔ راہیؔ چھوٹی اور لمبی مترنم بحریں، ہندی الفاظ کا برمحل خوب صورت استعمال، منفرد اسلوب بیان سے غزل کو گلدستہ بنانے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

گرتے رہے ہیں آنکھ سے یاقوت رات بھر

ڈھونڈ تا رہا ہوں درد کے تابوت رات بھر (۷۶)

(استعارہ)

شکھ کی نعمت سے تو سرشار ہیں ہم صبح ، مسا

تو جو دکھ بھیجے تو وہ بھی ہیں عطا، اے جاناں! (۷۷)

(صنعت تضاد)

احساس تفخر سے سبھی پھول رہے ہیں
چیونٹی بھی سلیمان ہے جاناں کی گلی میں(۷۸)
(صنعت تلمیح)

ریشم ریشم ، شبنم شبنم ، پونم پونم
ان نظروں کی چاندی برسے ہولے ہولے
وہ سویا ہے، چندا نکلو بھیتر بھیتر
چپکے چپکے، دھیرے دھیرے، ہولے ہولے (۷۹)
(صنعت تکرار)

غرض راہیؔ کی غزلوں میں کلاسیکیت بھی ہے اور جدت بھی۔ روایت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق روایت میں بھی جدت پیدا کرتے ہیں۔

۲۔ نظم:

غزل خالصتاً مشرق کی پیداوار اور نظم مغرب کی پروردہ ہے۔ مغرب میں نظم کو فروغ وہاں کے مخصوص ماحول کی بدولت حاصل ہوا۔ چونکہ مغرب میں مشترکہ زندگی کی بجائے انفرادی زندگی کو اہمیت حاصل ہے، اس لئے وہاں کی تہذیب کی اس انفرادی صورت کا اظہار نظم ہی بہتر طور پر کرسکتی تھی۔ لہٰذا نظم کو وہاں اظہار کا بہترین وسیلہ سمجھا گیا اور اپنایا گیا۔

نظم کو مشرق میں بھی اپنے تمام تر خصوصیات کے ساتھ اسی طرح اپنایا گیا جس صورت میں یہ مغرب میں موجود تھی۔ کیونکہ یہاں بھی بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کے مطابق اظہار کے لئے نظم سے بڑھ کر کوئی اور صنف نہیں ہو سکتی تھی۔ مشرق کے ہر بڑے شاعر نے نظم میں طبع آزمائی کر کے اپنا زورِ قلم دکھایا۔ یہاں تک کہ اگر کبھی قافیہ اور ردیف کی پابندی آڑے آئی تو آزاد نظم میں خیالات کا اظہار برتا گیا۔ یوں یہ صنف اب پورے مشرق پر چھائی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''نظم شخصیت کا والہانہ اظہار ہے اور یہ شخصیت سماجی اور سیاسی انقلابوں کے باوجود قائم رہتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس شخصیت کے پس پشت اجتماعی لاشعور کا وہ سمندر بھی ہے جس میں نسل انسانی کا سارا ذہنی اور جذباتی سرمایہ سمٹا ہوا ہے۔ نظم اسی سمندر کی تخلیق ہے اور اسی سے قوت اور نکھار حاصل کرتی ہے''(۸۰)

راہیؔ ترقی پسند سوچ کے ایک رجائیت پسند شاعر ہیں۔ وہ انگریزی ادبیات کے استاد ہیں اور انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ کر چکے ہیں اور طویل عرصے تک بیرون ملک میں بھی مقیم رہے ہیں۔ نظم جو مغرب کی پیداوار ہے اور اس معاشرے میں پلی بڑھی، جہاں راہیؔ خود رہے ہیں، اس لئے وہ نظم کے مزاج، اس کی ساخت اور ہیئت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے مشرقی معاشرے سے تعلق رکھنے کے باوجود نظم کو انفرادیت تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے خارجی اثرات کے

امتزاج سے جدید روایات کا آئین بنایا۔ غزل کے ساتھ ساتھ شجاعت علی راہیؔ نے نظم میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی نظمیں اردو ادب کا بہترین سرمایہ ہیں جن کے بارے میں سید فیضیؔ لکھتے ہیں:

''راہیؔ کی نظمیں ایک ابھرتے ہوئے نوجواں شاعر کے جدید فکری رجحانات کی آئینہ دار ہیں''(۸۱)

حامد سروش راہیؔ کی نظموں کے بارے میں کچھ یوں فرماتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ راہیؔ کی تمام شاعری بالخصوص نظمیں ادب میں مزاحمتی رویے کی اعلیٰ ترین تشریح پیش کرتی ہیں۔''(۸۲)

یوں تو راہیؔ کے تمام شعری مجموعوں میں نظمیں موجود ہیں، لیکن ''نورٌ علیٰ نور'' کا شعری مجموعہ مکمل طور پر نظموں پر مشتمل ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے ''برف کی رگیں'' میں کل ۱۱ نظمیں ہیں۔ جن میں زیادہ تر نظمیں آزاد ہیئت میں لکھی گئی ہیں مثلاً نظم ''ڈراما''، '' آواگون'' ، '' خرافہ کی ڈائری کا ایک ورق''، ''زمین کا دودھ جل گیا ہے'' اور ''سوانح حیات'' وغیرہ۔

دوسرے شعری مجموعے ''پھول کھلے یا نہ کھلے'' میں ۱۳ نظمیں، ۳ قطعات، ایک رباعی، ۲ گیت اور ۷ ماہیے شامل ہیں۔ اس کتاب کے تیسرے حصے میں پانچ نثری نظمیں ہیں۔ جن میں ''۳۱ دسمبر اور برف باری''، ''پرندے''، ''کنویں سے ایک آواز''، ''چمگادڑ اور جنگل میں ایک رات'' شامل ہیں۔ اس حصے کا عنوان سمندری ریشم ہے، جو ایک نئی ترکیب ہے جس کے بارے میں پروفیسر منور رؤف لکھتی ہیں:

''سمندر کا ریشم ایک نئی اصطلاح ہے۔ سمندری طوفان، سمندری جانور، سمندری مچھلی، سمندری گھونگے اور سمندری جھاگ وغیرہ سنتے رہے ہیں۔ لیکن سمندر کا ریشم کبھی نہیں سنا تھا''(۸۳)

ان کے تیسرے مجموعے ''چراغ گل نہ کرو'' میں کل ۲۱ نظمیں ہیں، جس میں انہوں نے نظم کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے مثلاً اس مجموعے میں ۴ حمدیہ نظمیں، ۲ نعتیں، ایک منقبت، ایک سلام، ۱۰ قطعات، ۳۶ دوہے ۲۳ ہائیکو اور ایک گیت شامل ہے۔ اسی طرح ان کے شعری مجموعے ہجرت مسلسل کے دوسرے حصے میں ۱۱ نظمیں، ۲ گیت، اور ۷ قطعات شامل ہیں۔ اس مجموعے کے دوسرے حصے میں ۵۵ ہائیکو، اور ۳ ثلاثیاں شامل ہیں اور چوتھے حصے میں ۷۱ دوہے لکھے گئے ہیں۔ ''نورٌ علیٰ نور'' جو ان کی نظموں کا مجموعہ ہے، چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ۷ حمدیں اور چند مناجات ہیں، دوسرے حصے میں حضور ﷺ عزت مآب کی منظوم سوانح حیات اور ۳ نعتیں ہیں۔ تیسرے حصے میں منقبت اور چوتھے حصے میں کل ۱۲ سلام اور مرثیے شامل ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''نالہ ءشب گیر'' مناجات پر مشتمل ہے جو قطعات کی صورت میں لکھا گیا ہے۔

راہیؔ کی نظمیں اور ان کے موضوعات ان کے جدید فکر و خیال اور ترقی پسندانہ سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہیں۔ راہیؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نظم کو صرف ایک صنف تک محدود نہیں رکھا بلکہ نظم کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کر کے حسین معرکوں سے نظم میں جدیدیت کی روایت قائم کی۔ انہوں نے بیک

وقت حمد، نعت، منقبت، ہائیکو، دوہے، گیت، قطعات، مرثیے اور سلام لکھے۔

ان کے اس فن کے بارے میں محسن احسان کہتے ہیں:

''شجاعت علی راہی نے تین مختلف اسالیب اختیار کر کے اپنے فنی شعور کی پختگی کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ وہ نظم، غزل اور گیت میں یکساں مہارت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور تینوں اصناف میں اس کے احساس کی نئی سمتوں اور حسیت کی نئی جہتوں کا سراغ ملتا ہے۔'' (۸۴)

راہی کی نظموں کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

راہی رجائیت کے شاعر ہیں۔ وہ ہر قسم کے حالات میں نہ کبھی خود مایوس ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے قاری کو مایوس ہونے دیتے ہیں:

''مرے ساتھیوں کو یہ ڈر ہے
کہ موجوں پر کتبے لکھے ہیں
وہ ماہی نما کشتیاں، ان کی بیساکھیاں
سب کی سب کھو چکی ہیں
مرے ساتھیوں کو گماں ہے
کہ وہ کالی راتوں کے اندھے جزیرے میں اب زندگی بھر مقید رہیں گے
ہوا اور پانی کے راستے اب تک مقفل رہیں گے
مرے چشم بستہ رفیقو!
یہ راتیں نہیں ہیں
یہ کالے گلابوں کے لشکر ہیں
جن کی جڑیں روشنی کے ہرے موسموں میں پیوستہ ہیں۔'' (۸۵)

راہی کے مطابق زندگی مسلسل دکھوں اور غموں سے عبارت ہے۔ کبھی غم دوراں اور کبھی غم جاناں، کبھی کسی کے بچھڑنے کا غم، اور انسان کو ان ساری کیفیات سے نمٹنا پڑتا ہے جب تک سانس رہتی ہے:

دوستو، ہم نفسو، اب مجھے آواز نہ دو
تھک کے سویا ہوں، مجھے چین سے سونے دو
زندگی جیسے کسی زخمی پرندے کی اڑان
ایک بے سمت سفر ایک مسافت کی تھکان
حوصلے کم ہیں بہت سلسلۂ زلف دراز
زندگی درد کے ریشے سے ہے گوندھا ہوا ساز

بار دیگر مجھے یہ درد بھرا ساز نہ دو
دوستو، ہم نفسو، اب مجھے آواز نہ دو۔(۸۶)

شاعر کو اپنے وطن اور دھرتی سے بے پناہ محبت ہے۔ ''نظم آنگن'' جو معریٰ ہیت میں لکھی گئی ہے پوری طرح آنگن کی محبت میں رچی بسی ہے:

اپنے آنگن کی پاک مٹی میں
چاندنی نرم خواب بُنتی ہے
روشنی نرم گرم پوروں سے
دھیرے دھیرے گلاب چُنتی ہے۔''(۸۷)

جنرل ضیاء الحق پر بھی ایک نظم لکھی گئی ہے کہ کس طرح ایک غاصب نے آمریت کے نشے میں چور ہو کر وطن عزیز کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا:

چراغ پانی سے جل رہے ہیں ، گلاب پتھر پہ پل رہے ہیں
جو باوفا ہے وہ بے وفا ہے، جو بے ہنر ہے وہ با ہنر ہے
شجر کو '' سیراب'' کرنے والے جڑوں سے اپنی نظر ہٹا لیں
ذرا سنبھل کے، یہ میری چھاؤں ہے، میری ماں ہے، یہ میرا گھر ہے۔(۸۸)

راہیؔ نے درجنوں حمدیہ قطعات لکھے ہیں جو ان کی مناجات کی کتاب ''نالۂ شب گیر'' میں موجود ہیں۔ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

کیسی کیسی قیامتیں ٹوٹیں
ہاں، تجھے حالِ دل سنائیں گے
چند لمحے ہیں ہجر کے، مولا!
پھر ترے پاس لوٹ آئیں گے (۸۹)

راہیؔ نے بڑی تعداد میں دوہے اور ماہیے بھی تخلیق کئے ہیں۔ایک ماہیا دیکھیے:

کچھ کہہ بھی نہیں سکتے
اور ان کو بتائے بن
ہم رہ بھی نہیں سکتے ۔''(۹۰)

غرض راہی کی نظمیں خیال وفکر کی بلندی کے ساتھ معنی آفرینی سے بھر پور ہیں اور ایک نئے جذبے اور آہنگ سے سرشار دکھائی دیتی ہیں۔ان کی جدید نظموں نے ادب میں نئی روایتوں اور جہتوں کو جنم دیا ہے اس لئے اپنے منفرد اسلوب کی بدولت وہ اپنے ہم عصر شعراء میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

(ب) افسانہ نگاری:

راہی کو چونکہ مختلف اصناف میں طبع آزمائی کا شوق تھا، چنانچہ انہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ نثر میں انہوں نے افسانے تخلیق کئے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''آوازوں کا جنگل'' کے نام سے موسوم ہے۔ جس میں کل اٹھارہ (۱۸) افسانے ہیں۔ جن کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) چڑیا کا بچہ	(۲) یا عباس علمدار	(۳) عدے
(۴) چنبیلی کا سانپ	(۵) بھوری بھینس	(۶) قفس
(۷) تھوڑی سی اسٹابری	(۸) بے آبرو	(۹) میاں مٹھو، چوری کھاؤ گے
(۱۰) رشتے	(۱۱) آہوئے حرم	(۱۲) باپ
(۱۳) کفارہ	(۱۴) بارش	(۱۵) مل گیا! مل گیا
(۱۶) بس میں ایک قتل	(۱۷) بکریوں کا ہڑتال	(۱۸) خضر راہ

راہیؔ کی نظم ونثر کے متعلق ماہنامہ اقدار کے مدیر شبنم رومانی لکھتے ہیں:

> ''شاعری اور افسانہ نگاری ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ نیاز اور مجنون اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ شجاعت علی راہیؔ نے بھی یہ دونوں اوسط سنجیدگی سے اختیار کئے ہیں۔ نظم ونثر پر یکساں عبور ان کی تخلیقی ذہانت کا ثبوت ہے۔''(۹۱)

راہیؔ اس معاشرے کے ایک جیتے جاگتے انسان ہیں۔ انہوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن کا تعلق اسی معاشرے سے ہے، جس میں وہ خود رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع اور بیان میں روانی اور سلاست ہے۔ انہوں نے سماجی رویوں اور ناہمواریوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور عام آدمی کے مسائل، خواتین کے استحصال، ان کی تعلیم اور جنسی مسائل، نفسیاتی، غربت، معاشرتی زوال اور اقدار کی تنزلی اور طبقاتی کشمکش کو موضوع بنایا ہے۔

ترقی پسند مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر انہوں نے ادب کا رشتہ زندگی سے جوڑا، ایک ایسی زندگی سے جس میں ایک طرف عیش وعشرت سے زندگی گزارنے والے اعلیٰ طبقے کے لوگ ہیں تو دوسری طرف وہ غریب لوگ جنہیں ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہیں ہوتی، ایسے ماحول میں نہ صرف انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف لکھا بلکہ علامات کا استعمال کر کے سیاسی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔

منٹو کے بعد بہت کم ایسے افسانہ نگار ہوں گے جنہوں نے جنسی مسائل پر اس بے باکی سے قلم اٹھایا ہو جیسے شجاعت علی راہی نے اٹھایا۔ راہیؔ سچائی کے علمبردار ہیں۔ جھوٹ اور منافقت پر یقین نہیں رکھتے، چنانچہ بلا خوف وخطر ان چیزوں کو بے نقاب کرتے ہیں جو منافقت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ظاہر میں کچھ اور ہوتے ہیں اور باطن میں کچھ اور۔

غرض راہیؔ دور جدید کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ ان کے افسانے معاشرے کے بہترین عکاس ہیں اور اردو ادب بالخصوص خیبر پختون خوا کے اردو ادب کے ارتقاء میں ایک خوب صورت اضافہ ہیں۔

(ج) بچوں کے لئے خدمات:

بچے ہماری قوم کا مستقبل ہیں، لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں بچوں کے ادب کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ جس کی وجہ سے بچوں کے لیے لکھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ شجاعت علی راہیؔ وہ نامور شاعر ہیں جس نے بچوں کے ادب پر بھی خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے جہاں بڑوں کے لیے شاعری کی اور لکھا، وہاں بچوں کے لئے بھی اپنی بہترین تخلیقات پیش کیں، جو ان کی نفسیات کے عین مطابق ہیں۔

بچوں کے لیے انہوں نے پانچ شعری مجموعے تخلیق کیے ہیں جن میں تصاویر اور اشکال کی مدد سے بچوں کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ معلومات اور زبان دانی کا بہترین درس موجود ہے۔ ان میں ''زمِ شگوفے'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے، جو شجاعت علی راہیؔ نے خود ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا، اس حوالے سے احمد پراچہ لکھتے ہیں:

> ''زمِ شگوفے کے علاوہ بچوں میں علم و ادب سے لگاؤ پیدا کرنے کے لیے اس نے کہانیاں اور منظوم پہیلیاں بھی لکھی ہیں۔ گویا کوہاٹ میں ایسا ادیب شاعر صرف راہیؔ ہی ہے جس نے بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے کی طرف توجہ دی ہے'' (۹۲)

راہیؔ کا یہ مجموعہ ۱۹۸۳ء میں لکھا گیا ہے لیکن گوہر رحمان نوید نے اپنی کتاب ''صوبہ سرحد میں اردو ادب'' میں بچوں کے ادب کے زمرے میں شجاعت علی راہیؔ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے اور اس حوالے سے ان کی خدمات کو اپنے صفحات میں جگہ نہیں دی ہے۔ اس کے علاوہ ۲۰۰۹ء میں شعبہء اردو جامعہء پشاور کی ایم۔ اے اردو کی طالبہ نوشین وودو نے بھی اپنے تحقیقی مقالے ''اردو میں بچوں کے ادب کا ارتقاء اور صوبہ سرحد'' میں بھی شجاعت علی راہیؔ کی خدمات کو نظر انداز کیا ہے۔ حالانکہ اس وقت راہیؔ ایک طویل عرصے سے لکھنے والے شاعر اور ادیب تھے اور ادبی حلقوں میں معروف و مشہور شخصیت مانے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں بچوں کے لیے بھی لکھ رہے تھے۔ اس وجہ سے راقمہ نے اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع ''ادب اطفال کے فروغ میں شجاعت علی راہیؔ کی شعری و نثری خدمات'' منتخب کیا کہ راہیؔ جیسے سنجیدہ لکھاری کی تخلیقات کو ہر خاص و عام تک پہنچایا جائے اور خیبر پختون خوا میں بچوں کے ادب کی تنقید و روایت میں انہوں نے جو حصہ ڈالا ہے، اُسے اُجاگر کیا جائے۔

''زمِ شگوفے'' کے بعد راہیؔ نے بچوں کے لیے چار مزید شعری مجموعے تحریر کیے جن کے نام بالترتیب ''ذرا سوچو تو''، ''الف سے ای''، ''مطلب بے مطلب''، اور ''مشاعرے'' ہیں۔ ان تمام مجموعوں میں بچوں کے لیے نظمیں اس انداز سے لکھی گئی ہیں کہ وہ کھیل ہی کھیل میں مختلف اشیاء کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کے لیے بارہ (۱۲) ناولٹ لکھے ہیں جو باقاعدہ تحقیق کر کے لکھے گئے ہیں۔ ان میں ''باغی چیونٹیاں''، ''تتلیوں کا میلہ''، ''ڈائناسور کیوں غائب ہو گئے''، '' بلّی کی آپ بیتی''، ''کبوتر''، ''بولتے برگر''،

''سرخ سیارہ''، ''ماں''، ''قہقہہ''، ''حیرت انگیز''، ''عظیم لوگوں کے عظیم خواب''، ''اور بچے (ڈوریمان، جاپان اور پاکستان)'' شامل ہیں۔ جن میں پہلے سات ناولٹ مطبوعہ اور باقی پانچ ناولٹ تا حال غیر مطبوعہ ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کے لیے مختصر کہانیوں کے دو مجموعے ''ہم نے زردہ کھایا'' اور ''چڑیوں کی چہکار'' کے نام سے قلم بند کیں۔ راہیؔ نے بچوں کے لیے ڈرامے بھی لکھے جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ راہیؔ نے نہ صرف بڑوں کے لیے مختلف اصناف کو اختیار کیا بلکہ وہ بچوں کے لیے بھی مختلف اصناف میں لکھنے پر قادر ہیں۔ بچوں کے لیے دو ڈرامے ''شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا اور'' بچے ہوں تو ایسے ہوں'' لکھے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بچوں کے لیے تفریح کے ساتھ ساتھ مقصدیت کے بہترین شاہکار ہیں۔ غرض شجاعت علی راہیؔ نے ایک مشنری جذبے کے ساتھ بچوں کے لیے ایک مفید اور با مقصد ادب تخلیق کیا اور اس حوالے سے ان کا نام ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ احمد پراچہ: کوہاٹ کا ذہنی ارتقاء: ضیاء آرٹ پریس، پشاور، ۱۹۸۶ء، ص ۲۲

۲۔ رضا ہمدانی: روزنامہ "مشرق" ۱۰ مارچ ۱۹۸۶ء: مشمولہ مجلہ "نایاب"، شجاعت علی راہی نمبر، ناز کو آرٹ پرنٹرز، راولپنڈی، جنوری ۱۹۸۷ء، ص ۲۹

۳۔ شجاعت علی راہی: بلیک باکس: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات ۲۰۱۸ء، ص ۱۰۸

۴۔ احمد پراچہ: شجاعت علی راہی سوانحی خاکہ: مشمولہ مجلہ "نایاب"، ص ۲۳

۵۔ شجاعت علی راہی سے راقمہ کی گفتگو: بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد، بتاریخ ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۸ء

۶۔ احمد پراچہ: شجاعت علی راہی سوانحی خاکہ: مشمولہ مجلہ "نایاب"، ص ۲۳

۷۔ شجاعت علی راہی سے راقمہ کا مصاحبہ: بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد، بتاریخ ۱۹ اکتوبر ۲۰۱۸ء

۸۔ شجاعت علی راہی سے راقمہ کا مصاحبہ: بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد، بتاریخ ۲۶ اکتوبر ۲۰۱۸ء

۹۔ احمد پراچہ: شجاعت علی راہی سوانحی خاکہ: مشمولہ مجلہ "نایاب"، ص ۲۳

۱۰۔ شجاعت علی راہی: بلیک باکس: ص ۱۲۶۔۱۲۷

۱۱۔ احمد پراچہ: کوہاٹ کا ذہنی ارتقا: ص ۱۸۵

۱۲۔ شجاعت علی راہی: بلیک باکس: ص ۱۳۸۔۱۳۹

۱۳۔ احمد پراچہ: شجاعت علی راہی سوانحی خاکہ: مشمولہ مجلہ "نایاب"، ص ۲۴

۱۴۔ احمد پراچہ: کوہاٹ کا ذہنی ارتقا، ص ۱۷۱

۱۵۔ شجاعت علی راہی سے راقمہ کا مصاحبہ: بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد، بتاریخ ۵ نومبر ۲۰۱۸ء

۱۶۔ شجاعت علی راہی: بلیک باکس: ص ۱۹۲

۱۷۔ وزیر جانان اورکزئی: شجاعت علی راہی: احوال و آثار (تحقیقی مقالہ): شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء، ص ۵

۱۸۔ شجاعت علی راہی: بلیک باکس: ص ۱۹۵

۱۹۔ شجاعت علی راہی: بلیک باکس: ص ۱۹۶

۲۰۔ احمد پراچہ: شجاعت علی راہیؔ سوانحی خاکہ: مشمولہ مجلہ ''نایاب''، ص ۲۴

۲۱۔ شجاعت علی راہیؔ: بلیک باکس: ص ۲۱۷

۲۲۔ حامد سروش: میں اور وہ: مشمولہ مجلہ ''نایاب''، ص ۱۰۳

۲۳۔ شجاعت علی راہیؔ سے راقمہ کی نجی ملاقات: بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد، بتاریخ یکم نومبر ۲۰۱۸ء

۲۴۔ رحیم گل مرحوم: جدہ میں راہی کے شعری مجموعے کی تقریب رونمائی: مشمولہ مجلہ ''نایاب''، ص ۳۳

۲۵۔ احمد پراچہ: شجاعت علی راہیؔ سوانحی خاکہ: مشمولہ مجلہ ''نایاب''، ص ۲۵

۲۶۔ بریگیڈیر طلعت امتیاز نقوی سے راقمہ کی گفتگو: بمقام اسلام آباد، بتاریخ ۱۰ نومبر ۲۰۱۸ء

۲۷۔ شجاعت علی راہیؔ: بلیک باکس: ص ۱۷۴

۲۸۔ ایضاً ص ۱۷۶

۲۹۔ ایضاً ص ۱۷۷

۳۰۔ وزیر جانان اورکزئی: شجاعت علی راہیؔ: احوال و آثار: (تحقیقی مقالہ) ص ۴

۳۱۔ شجاعت علی راہیؔ: بلیک باکس: ص ۱۸۳

۳۲۔ ایضاً ص ۳۱۲

۳۳۔ ایضاً ص ۳۵۴

۳۴۔ ایضاً ص ۳۶۷

۳۵۔ احمد پراچہ: شجاعت علی راہیؔ سوانحی خاکہ: مشمولہ مجلہ ''نایاب''، ص ۲۵

۳۶۔ شجاعت علی راہیؔ سے راقمہ کا مصاحبہ: بمقام کوہاٹ کینٹ، بتاریخ ۲۰ نومبر ۲۰۱۸ء

۳۷۔ شجاعت علی راہیؔ: پھول کھلے یا نہ کھلے: ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۳

۳۸۔ شاہد زمان سے راقمہ کی نجی ملاقات: بمقام کوہاٹ، بتاریخ ۲۷ دسمبر، ۲۰۱۸ء

۳۹۔ طاہر یوسف ہاشمی: شاہ صاحب اور ان کا فن: مشمولہ مجلہ نایاب، ص ۱۲۴

۴۰۔ فارغ بخاری: تبصرہ: پھول کھلے یا نہ کھلے: مشمولہ مجلہ نایاب، ص ۲۸

۴۱۔ نسیم سحر: راہی سے گفتگو: مشمولہ سہ ماہی ''ابلاغ''، پشاور اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص ۲۴

۴۲۔ شجاعت علی راہیؔ سے راقمہ کا انٹرویو: بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد، بتاریخ ۲۸ نومبر، ۲۰۱۸ء
۴۳۔ شجاعت علی راہیؔ: بلیک باکس: ص ۲۳۲
۴۴۔ احمد پراچہ: کوہاٹ کا ذہنی ارتقا: ص ۱۷۴
۴۵۔ کرامت حسین جعفری: مبادیات نفسیات: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء: ص ۱۰۹
۴۶۔ عبدالرؤف: ڈاکٹر: جدید تعلیمی نفسیات: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۰
۴۷۔ محسن احسان: جدہ میں راہیؔ کے شعری مجموعے کی تقریب رونمائی: مشمولہ مجلہ نایاب، ص ۳۵
۴۸۔ طاہر یوسف ہاشمی: شاہ صاحب اور ان کا فن: مشمولہ مجلہ نایاب، ص ۱۲۴
۴۹۔ سید مشیر حیدر نقوی سے راقمہ کا مصاحبہ: بمقام کوہاٹ، بتاریخ ۱۴ دسمبر، ۲۰۱۸ء
۵۰۔ شجاعت علی راہیؔ سے راقمہ کی نجی ملاقات: بمقام بحریہ ٹاؤن اسلام آباد بتاریخ ۳۱ دسمبر، ۲۰۱۸ء
۵۱۔ شاہد زمان سے راقمہ کی نجی ملاقات: بمقام کوہاٹ، بتاریخ ۵ جنوری، ۲۰۱۹ء
۵۲۔ سید مشیر حیدر نقوی: شجاعت علی راہیؔ کے فن اور شخصیت کا ذاتی مطالعہ: مشمولہ ہفت روزہ ''انقلاب''، کوہاٹ، ۲۵ اگست، ۲۰۱۸ء، ص ۳
۵۳۔ نسیم سحر: راہیؔ سے گفتگو: مشمولہ سہ ماہی ''ابلاغ'' ص ۲۹
۵۴۔ نسیم سحر: پھول کھلے یا نہ کھلے اور اُس کے مصنف پر ایک نظر: مشمولہ مجلہ نایاب، ص ۱۰۷
۵۵۔ شجاعت علی راہیؔ سے انٹرویو: ریڈیو پاکستان کوہاٹ، بتاریخ ۲۴ اپریل، ۲۰۰۶ء
۵۶۔ رحیم گل: جدہ میں راہیؔ کے شعری مجموعے کی تقریب رونمائی: مشمولہ مجلہ ''نایاب'' ص ۳۴
۵۷۔ شجاعت علی راہیؔ: ''بلیک باکس'': ص ۱۶۲
۵۸۔ ایضاً ص ۱۶۲
۵۹۔ شجاعت علی راہیؔ سے راقمہ کا انٹرویو: بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد بتاریخ ۳۰ نومبر ۲۰۱۸ء
۶۰۔ شجاعت علی راہیؔ: بلیک باکس: ص ۱۶۵
۶۱۔ محمد اقبال: علامہ: بانگ درا: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۸ء، ص ۲۸۶

۶۲۔ گوہر نوید کاٹلنگ: روحِ ادب: یونیورسٹی پبلشرز، پشاور، ۲۰۰۷ء، ص ۳۰۲

۶۳۔ قتیل شفائی: اہل قلم کی آراء: مشمولہ مجلہ ''نایاب'' ص ۲۱

۶۴۔ احمد ندیم قاسمی: کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا: ہجرت مسلسل: ۲۰۱۲ء، ص ۱۴۳

۶۵۔ فارغ بخاری: تبصرے: پھول کھلے یا نہ کھلے: مشمولہ مجلہ نایاب، ص ۲۷

۶۶۔ شجاعت علی راہیؔ: برف کی رگیں: آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۰

۶۷۔ گوہر رحمان نوید: صوبہ سرحد میں اردو ادب (پس منظر و پیش منظر): یونیورسٹی پبلشرز قصہ خوانی، پشاور، ۲۰۱۰ء، ص ۴۲۔۴۳

۶۸۔ سجاد احمد حیدر: کوہاٹ کی علمی و ادبی خدمات: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۳۰

۶۹۔ شجاعت علی راہیؔ: برف کی رگیں، ص ۵۶

۷۰۔ شجاعت علی راہیؔ: ابابیلیں (سونشتر): شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۸ء، ص ۲۲

۷۱۔ عمران خان: شجاعت علی راہیؔ کی ادبی جہات (تحقیقی مقالہ): ناردرن یونیورسٹی، نوشہرہ، ۲۰۱۳ء، ص ۲۴

۷۲۔ شجاعت علی راہیؔ: پھول کھلے یا نہ کھلے: ص ۲۷

۷۳۔ شجاعت علی راہیؔ: چراغ گل نہ کرو: ماورا پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۴۹

۷۴۔ شجاعت علی راہیؔ: ہجرت مسلسل: ماورا پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۴۶

۷۵۔ ایضاً ص ۴۵

۷۶۔ شجاعت علی راہیؔ: برف کی رگیں: ص ۴۰

۷۷۔ شجاعت علی راہیؔ: نالۂ شب گیر (مناجات): شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۷ء، ص ۴۴

۷۸۔ شجاعت علی راہیؔ: چراغ گل نہ کرو: ص ۱۷۸

۷۹۔ ایضاً ص ۲۰۲

۸۰۔ وزیر آغا: ڈاکٹر: نظم جدید کی کروٹیں: سنگت پبلشرز، ۲۵ سی لوئر مال، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۴

۸۱۔ سید فیضیؔ: برف کی رگیں کا شاعر: مشمولہ مجلہ نایاب، ص ۶۴

۸۲۔ حامد سروش: راہی کی نظمیں: مشمولہ سہ ماہی ''ابلاغ''، پشاور، اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص ۲۳

۸۳۔ منور روف: پروفیسر: پرندوں کا شاعر: مشمولہ، مجلہ ''نایاب''، ص ۸۶۔۸۷

۸۴۔ محسن احسان: جدہ میں راہیؔ کے شعری مجموعے کی تقریب رونمائی: مشمولہ مجلہ ''نایاب''، ص ۲۵

۸۵۔ شجاعت علی راہیؔ: پھول کھلے یا نہ کھلے: ص ۱۷

۸۶۔ شجاعت علی راہیؔ: چراغ گل نہ کرو: ص ۱۰۸۔۱۱۱

۸۷۔ شجاعت علی راہیؔ: ہجرت مسلسل: ص ۵۱

۸۸۔ ایضاً ص ۶۰

۸۹۔ شجاعت علی راہیؔ: نالہ شب گیر (مناجات): ص ۳۳

۹۰۔ شجاعت علی راہیؔ: پھول کھلے یا نہ کھلے: ص ۴۳

۹۱۔ شبنم رومانی: اداریہ: مشمولہ ماہنامہ ''اقدار'': کراچی، س۔ن، شمارہ نمبر ۷۔۸، جلد نمبر ۳، ص ۳

۹۲۔ احمد پراچہ: کوہاٹ کا ذہنی ارتقا: ص ۱۷۴

باب سوم

شجاعت علی راہیؔ کی بچوں کے لئے شاعری:
فکری وفنی جائزہ

شجاعت علی راہیؔ کی بچوں کے لئے شاعری: فکری وفنی جائزہ

شجاعت علی راہیؔ ادبی حلقوں میں ایک معروف شاعر کی حیثیت سے جانے اور مانے جاتے ہیں۔ بڑوں کے لئے شاعری میں انہوں نے نظم اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کی۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آکر اہل ذوق سے داد وتحسین وصول کر چکے ہیں۔ انہوں نے جہاں بڑوں کے لئے شاعری کی، وہاں بچوں کے لئے بھی بہترین اور سبق آموز شاعری کرکے ادب اطفال کو اپنی بہترین تخلیقات سے نوازا۔ اس بارے میں احمد پراچہ میں کہتے ہیں:

> ''شجاعت علی راہیؔ نے جہاں بڑوں کے لئے شاعری کی ہے، وہاں وہ مستقبل کے معماروں کے لئے شاعری کرتا ہے۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بچوں کی نفسیات کو بخوبی سمجھتا ہے''۔(۱)

راہیؔ نے بچوں کے لئے شاعری میں جو نظمیں پہیلیاں اور قطعات لکھے ہیں، وہ ملکی وغیر ملکی معیاری رسائل وجرائد میں بارہا چھپی ہیں۔ جن میں ماہنامہ ''کھلونا'' دہلی،، ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کراچی، ہفت روزہ ''اخبار خواتین'' کراچی، ماہنامہ ''جگنو'' لاہور، ماہنامہ ''نونہال'' کراچی، ماہنامہ ''تعلیم وتربیت'' لاہور اور ماہنامہ ''بچوں کی دنیا'' لاہور وغیرہ شامل ہیں۔

راہیؔ نے بچوں کے لئے کل پانچ شعری مجموعے تخلیق کئے ہیں جن میں ''زمِ شگوفے''، ''الف سے امی''، ''ذرا سوچو تو''، ''مطلب بے مطلب'' اور ''مشاعرے'' شامل ہیں۔ راہیؔ کے یہ شعری مجموعے ادب اطفال کے باب میں بیش قیمت اور گراں قدر اضافہ ہے، جس میں بچوں کے لئے معلومات، اخلاقیات، تربیت اور دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

ا۔ زمِ شگوفے:

''زمِ شگوفے'' بچوں کے لئے شجاعت علی راہیؔ کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ جو ۱۹۸۳ء میں طفیل آرٹ پرنٹرز لاہور کی وساطت سے راہیؔ نے خود چھاپا۔ راہیؔ کا بچوں کے لئے تخلیق کردہ اس مجموعے میں کل ۱۸ نظمیں شامل ہیں۔ یہ نظمیں بچوں کی ذہنی استعداد، عمر، اور دلچسپیوں کو مدنظر رکھ کر تخلیق کی گئی ہیں، جن میں اخلاقی تربیت کے پہلو کے ساتھ ساتھ بیک وقت دلچسپی کا سامان بھی موجود ہے۔

ان نظموں میں ''چڑیا اور بچی''، ''پہیلیاں''، ''اچھے بچے، گندے بچے''، ''بلی کا بچہ''، ''تارے بچو''، ''چڑیا کا بچہ''، ''گرمی''، ''سردی''، ''خزاں''، ''بہار''، ''چوزہ''، ''دو چوہے''، ''سورج''، ''تتلی''، ''گلاب کا پھول''، ''ہوائی جہاز''، ''پیاری بلی''، اور ''جگنو کی سالگرہ'' شامل ہیں۔ بڑوں کے مقابلے میں بچوں کے لئے لکھنا قدرے زیادہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ بچوں کے لئے خود بچہ بن کر لکھنا پڑتا ہے اور ان کی نفسیات کو سمجھنا ہوتا ہے۔ شجاعت علی راہیؔ بچوں کی نفسیات کو بخوبی جانتے اور سمجھتے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ بھی انھوں نے چھوٹے بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیا ہے۔ یہ مجموعہ پلے گروپ

کے بچوں کے لئے زیادہ مناسب اور موزوں ہے کیونکہ اس عمر میں بچے پڑھنے لکھنے کے قابل نہیں ہوتے لیکن زبانی طور پر رائمز پڑھ کر آہنگ سے پڑھنے کے شوقین ضرور ہوتے ہیں۔مختلف چیزوں کی آوازوں پر توجہ دے کر انہیں سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔زیادہ تر پرندوں جانوروں اور گردوپیش میں موجود اشیاء کی آوازوں کو نہ صرف سیکھتے ہیں بلکہ سیکھ کر انہیں اسی طرح بولنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

مثلاً ''ہوائی جہاز'' کے نام سے لکھی گئی نظم میں راہیؔ نے جہاز اڑنے کی آواز کو بہترین طریقے سے پیش کیا گیا ہے:

؎ گھر گھر بولے، غر غر بولے
اُڑنے کو جب یہ پَر تولے
پُھر پُھر پُھر پُھرناک گمائے
اڑتا جائے ، شور مچائے (۲)

اسی طرح اُنھوں نے نظم ''خزاں'' میں خزاں کے موسم میں سوکھے پتوں کے گرنے کی آواز کو کس خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے:

؎ پَت جُھڑ
پَت جُھڑ
کھڑ کھڑ
کھڑ کھڑ
پیلے پتے
گرتے جائیں
سُوکھے پتے
شُور مچائیں (۳)

گویا الفاظ کی تکرار سے مختلف اشیاء اور اُن کی حرکات وسکنات کی آوازیں تخلیق کر کے دلچسپی اور تفریح کا سامان بہم پہنچایا گیا ہے جو راہیؔ کے فنی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اسی طرح نظم ''چوزہ'' میں چُوزے کی آواز کی حقیقی نقل پیش کر کے دلچسپی کے عنصر پر زور دیا گیا ہے اور بلی کی آہٹ سے چوزے کے ڈرنے کو دلچسپ ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ملاحظہ ہو:

؎ نرم سا کوزہ
جوں خربوزہ
زرد سا چوزہ
چیں چیں، چوں چوں، چاں چاں کرتا

بلی کی آہٹ سے ڈرتا

نرم سا کوزہ

جوں خربوزہ

زرد سا چوزہ(۴)

''نرم شگوفے'' میں راہیؔ نے موضوعات کے اعتبار سے بھی اپنی زیرک طبعی دکھائی ہے کہ بچے عنوانات کو دیکھ کر نہ صرف اس کی طرف مائل ہو کر مسرور ہوں، بلکہ ان کی خلاقی تربیت بھی ہو۔ چنانچہ وہ نظم ''اچھے بچے، گندے بچے'' میں کچھ ایسا ہی کرشمہ دکھاتے ہیں۔ موضوع دیکھ کر ہی بچوں میں تجسس پیدا ہو جاتا ہے کہ اچھے بچے کیسے ہوں گے اور گندے بچے کیسے ہوتے ہیں؟ یہ نظم بچوں میں صفائی کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے ایک بہترین اور عمدہ تخلیق ہے۔ چھوٹے بچوں کی ذہنی استعداد اور نفسیات کو مدنظر رکھ کر انتہائی سادہ اور آسان اسلوب کو اپنایا گیا ہے کہ نظم کے اشعار آسانی سے زبان پر چڑھ جاتے ہیں اور فوراً ازبر ہو جاتے ہیں۔

جو اچھے بچے ہوتے ہیں وہ سچے بچے ہوتے ہیں

جو سچے بچے ہوتے ہیں وہ اچھے بچے ہوتے ہیں

جو گندے بچے ہوتے ہیں وہ جھوٹے بچے ہوتے ہیں

جو جھوٹے بچے ہوتے ہیں وہ گندے بچے ہوتے ہیں

جو اچھے بچے ہوتے ہیں وہ ستھرے بچے ہوتے ہیں

جو ستھرے بچے ہوتے ہیں وہ اچھے بچے ہوتے ہیں

جو گندے بچے ہوتے ہیں وہ میلے بچے ہوتے ہیں

جو میلے بچے ہوتے ہیں وہ گندے بچے ہوتے ہیں(۵)

اس نظم میں راہیؔ نے صنعت عکس کو بہت خوب صورت انداز میں استعمال کیا ہے۔ نظم کا کمال یہ ہے کہ اس میں کل آٹھ مصرعے ہیں۔ ہر مصرعے میں ۱۰ الفاظ ہیں یعنی پوری نظم ۸۰ الفاظ پر مشتمل ہے۔ لیکن نظم کا ذخیرہ الفاظ بہت ہی مختصر ہے یعنی اس میں صرف چودہ الفاظ ہیں۔ ننھے منّے بچوں کے لئے اتنے کم الفاظ کو سیکھنا اور یاد رکھنا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے۔ راہیؔ، جو بچوں کے ادب کے راہی بھی ہیں۔ ان کے بارے میں سراج احمد تنولی روزنامہ ''سرگرم'' میں لکھتے ہیں:

''بچوں کے ادب کے لئے جو شجاعت صاحب تخلیق کرتے ہیں وہ بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت کے لئے ہوتا ہے جسے پڑھ کر بچوں کو اپنے مستقبل کے لئے بہترین راہ تجویز کرنے میں آسانی ہوتی ہے''(۶)

راہیؔ، بچوں کے لئے ایک مفید اور با مقصد ادب تخلیق کرتے ہیں۔ جس طرح دین اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ کسی گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں، اسی طرح راہیؔ نے بھی اپنی ایک نظم ''دو چوہے'' میں ایک گورے اور ایک کالے چوہے کی کہانی سنا کر یہی درس دیا ہے:

گھسے جا ایک بل میں
نہ کوئی گورا چوہا تھا
نہ کوئی کالا چوہا تھا
نہ کوئی ادنیٰ چوہا تھا
نہ کوئی اعلیٰ چوہا تھا (۷)

'' بزم شگوفے'' میں بچوں کے لئے کچھ معلوماتی نظمیں اور پہیلیاں بھی موجود ہیں۔ ان پہیلیوں میں کچھ جانوروں ، پرندوں اور حشرات الارض کی عادتوں، جبلتوں اور خصلتوں کو بیان کر کے انہیں پہچاننے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس طرح بچوں میں سوچ وبچار اور تجسس کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور ان میں غور وفکر کی صلاحیت پروان چڑھتی ہے:

ایسا کالا جیسا توا
کوا کوا کوا

اس کے پیٹ سے بچہ جھانکے
کنگرو کنگرو کنگرو

دن کو سوئے رات کو جاگے
اُلو اُلو اُلو (۸)

چھوٹے بچے غیر رسمی طور پر ماں کی گود سے لے کر اپنے گردو پیش کے ماحول کا مشاہدہ کرتے ہیں اور محسوس کر کے سیکھتے ہیں۔ بچوں کو مختلف موسموں اور ان کی کیفیات اور خصوصیات سے آشنا کرنے کے لئے راہیؔ نے گرمی، سردی، خزاں اور بہار کے عنوانات سے نظمیں لکھی ہیں اور اُن کے معلومات میں اضافے کے لئے سورج، تتلی، ہوائی جہاز کے نام سے ہلکی پھلکی اور مختصر نظمیں تحریر کی ہیں جو بہت آسان اور عام فہم ہیں۔ احمد پراچہ اُن کی نظموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''راہیؔ کی بچوں کے لئے لکھی ہوئی نظمیں عام فہم، سادہ اور سلیس ہوتی ہیں۔ جنہیں بچے باآسانی پڑھ سکتے ہیں۔''(۹)

''بزم شگوفے'' کی دیگر نظموں میں ''چڑیا کا بچہ''، ''گلاب کا پھول''، ''میری پیاری بلی''، ''بلی کا بچہ'' اور ''جگنو کی سالگرہ'' شامل ہیں۔ جگنو کی سالگرہ ایک ایسی نظم ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ اس لحاظ سے بھی کہ بچے سالگرہ کی تقریب سے آشنا ہوتے ہیں اور اس میں دلچسپی بھی لیتے ہیں۔ جب جگنو کی سالگرہ دھوم دھام سے منائی جاتی ہے تو راہیؔ اس منظر میں خوب صورت الفاظ سے حقیقت کا کیا خوب رنگ بھرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

سالگرہ جگنو کی آئی
تحفے لائی خوشیاں لائی
ابو چند غبارے لائے
کاغذ کے کچھ تارے لائے
گجری نے سارے گھر کو سجایا
جگنو نے بھی ہاتھ بٹایا
امی نے پکوان پکائے
اور ڈھیروں مہمان بلائے (۱۰)

اسی طرح جگنو کی سالگرہ کی تقریب میں شرکت کے لئے مختلف رشتہ داروں کی آمد کی تصویر بھی راہیؔ نے بہت خوب صورت انداز میں کھینچی ہے اور مناسب قافیوں اور ردیفوں کی مدد سے نظم کی موسیقیت اور ترنم کو دوبالا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

خالہ آئیں خالو آئے
ناچنے والا بھالو لائے

چچی آئیں چچا آئے
بلی کا ایک بچہ لائے

پپو اپنا بستہ لایا
بستے میں گل دستہ لایا (۱۱)

راہیؔ چونکہ چھوٹے بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں، اس لئے ان کی دیگر سرگرمیوں کے ساتھ اس سرگرمی کو بھی نگاہ میں رکھتے ہیں کہ بچے رات کے وقت آسمان پر چاند ستاروں کو بڑے شوق اور انہماک سے دیکھتے ہیں اور اکثر اوقات تو چندا ماموں سے باتیں کرنے میں بھی مگن ہو جاتے ہیں۔ راہیؔ انہیں تاروں کی زبانی بچوں کو ایک نصیحت آموز پیغام

دیتے ہیں کہ اگر تم دنیا میں نیک اور اچھے کام کروگے تو شہرت اور ناموری پاؤ گے اور اعلیٰ مقام حاصل کروگے:

؎ رات اندھیری ، تارے چمکے
روشن روشن ، ہیرے دمکیں
زیر لب کچھ گاتے جائیں
ہم کو کچھ سمجھاتے جائیں

اچھے بچو! پیاروں بچو!
روشن بچو ! تارے بچو!
تم جو اچھے کام کرو گے
جگ میں پیدا نام کرو گے

تم جو اچھے بچے ہو گے
ہم سے بڑھ کر روشن ہو گے(۱۲)

غرض ''زمِ شگوفے'' راہیؔ کی بہترین معلوماتی ، اخلاقی اور تربیتی نظموں سے مزین ایک دلکش مجموعہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے آسان مصرعوں میں شاعری کی گئی ہے۔ انتہائی سادہ اور سلیس زبان اور الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے اور عام فہم اسلوب اپنا کر ننھے قاریوں کی دلچسپی اور توجہ کو مکمل طور پر گرفت میں لینے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ الف سے امی:

شجاعت علی راہیؔ نے ''الف سے امی'' کی کتاب کے ذریعے ننھے مُنے بچوں کو وہ تعلیم دینے کی کوشش کی ہے جو عموماً اسکول اور مدرسوں میں رسمی طور پر دی جاتی ہے تاکہ بچے اسکول میں داخل ہونے سے پہلے شعوری طور پر ان معلومات کا ادراک کر سکیں جو انہوں نے پرائمری کی سطح پر سیکھنی ہوتی ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے سادہ ، رواں اور عام فہم زبان کا استعمال کر کے بچوں کی نفسیات کے عین مطابق باتصویر نظمیں تخلیق کی ہیں کیونکہ چھوٹے بچے عموماً تصویروں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ کتاب بچوں کو کھیل کھیل میں معلومات پہنچانے کی ایک عمدہ کاوش ہے۔

کاظم رشید کاظم کتاب کے حرفِ اوّل میں لکھتے ہیں:

> ''الف سے امی'' جیسی گراں قدر آسان اردو کی کتابیں لکھ کر شجاعت علی راہیؔ نے بچوں کا تخصص اُجاگر کرنے کی جو سعی کی ہے وہ حوصلے اور جرأت کی بات ہے۔ کیونکہ انہوں نے نظم کے ذریعے اردو کو عام فہم، سادہ اور سلیس کر دیا ہے۔ (۱۳)

کتاب میں بچوں کے لئے گنتی، قاعدہ، پہاڑے، مختلف آوازوں اور رنگوں کے بارے میں خوب صورت منظوم تخلیقات موجود ہیں۔ کتاب کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے کیا گیا ہے، جس میں بچوں کے لئے یہ نصیحت موجود ہے کہ ہر کام کا آغاز اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کرنا چاہئے۔ ''حمد'' میں اللہ تعالیٰ کی ذات کی مختلف صفات کو بہت خوب صورت، مختصر ترین اور جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

تیرا	میرا
سب کا	سچا
اونچا	اعلیٰ
عالی	والی
قائم	دائم
خالق	رازق (۱۴)

''زمِ شگوفے'' میں راہیؔ نے ''اچھے بچے، گندے بچے'' کے عنوان سے ایک مختصر نظم لکھی ہے۔ جس میں اچھے بچوں کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ ہمیشہ صاف ستھرے رہتے ہیں اور گندے بچے صاف ستھرے نہیں رہتے۔ زیرِ نظر مجموعے میں بھی راہیؔ نے ''اچھے بچے'' کے عنوان سے ایک اور نظم لکھی ہے۔ لیکن اس نظم میں راہیؔ نے قدرے تفصیل سے اچھے بچوں کی خصوصیات کو بیان کیا ہے کہ اچھے بچے نہ صرف صاف ستھرا رہتے ہیں، بلکہ جلدی سوتے ہیں اور جلدی جاگتے ہیں۔ بے جا ضد کر کے روتے نہیں اور بڑوں سے ادب سے پیش آتے ہیں:

؎ صاف اور ستھرے	اُجلے اُجلے
ان کی ساری	باتیں پیاری
جلدی جاگیں	دوڑیں بھاگیں
ضد نہ کریں وہ	رب سے ڈریں وہ
بولیں سب سے	بڑے ادب سے
اچھے بچے	نیک اور سچے (۱۵)

''الف سے امی'' کے مجموعے میں چھوٹے بچوں کو گنتی سکھانے کے لئے راہیؔ نے دلچسپ اور مؤثر انداز اختیار کیا ہے جس سے بچے آسانی کے ساتھ جلدی گنتی سیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً:

بولو ایک	کھاؤ کیک
بولو دو	یوں مت رو
بولو تین	جاؤ چین

بولو چار پہنو ہار
بولو پانچ ہلکی آنچ (۱۶)

اسی طرح پہلے سو ۱۰۰ تک کی گنتی اور پھر ہزار، لاکھ، کروڑ، ارب اور کھرب تک کی گنتی کو منظوم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بچوں کو پرائمری کی سطح پر عموماً پہاڑے بھی سکھائے جاتے ہیں جو ریاضی کے مضمون میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں، بلکہ اس کی بنیاد ہیں۔ راہیؔ نے بھی اس کتاب میں بچوں کو منفرد اور انوکھے انداز میں پہاڑے سکھانے کا کام بخوبی انجام دیا ہے۔ جس کے لئے آسان، دلچسپ اور معنی خیز اشعار کا سہارا لیا ہے۔ دس تک کے پہاڑوں کو تین تین مصرعوں کی صورت میں بیان کیا ہے۔ ہر تین مصرعوں میں ایک قصے اور خیال کو بھی باندھا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر یہ پہاڑے ملاحظہ ہوں:

ایک دونا دونا
دیواریں ہیں کالی
کر لو گھر میں چونا

ایک تیا تیا
گانے گاتی جائے
مُنی سی ایک چڑیا

ایک چوکا چوکا
ٹوکا اس کو سب نے
سب نے اس کو روکا (۱۷)

چھوٹی عمر کے بچے چونکہ پرندوں اور جانوروں کو بہت پسند کرتے ہیں اور ان کی حرکات وسکنات کو دیکھ کر نہ صرف خوش ہوتے ہیں بلکہ ان کی آوازیں سیکھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ زیرِ نظر شعری مجموعے میں راہیؔ نے مختلف پرندوں ،جانورں، اور اشیاء کی آوازوں کو شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے، کیونکہ انہیں ذاتی طور پر خود بھی پرندوں میں بہت دلچسپی ہے۔ پروفیسر منور رؤف نے انہیں پرندوں کا شاعر کہا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''شاعر کو پرندوں سے بہت دلچسپی ہے۔ ان کے کلام میں جا بجا پرندوں کا ذکر آتا ہے۔ کہیں وہ کبوتر کی بات کرتا ہے اور کہیں فاختہ کی، کبھی وہ جگنو کی تلاش میں نکلتا ہے اور کبھی وہ تتلیوں کے شانوں پر اڑنے لگتا ہے۔''(۱۸)

مثلاً:

قمری بولے اللہ ہو
فاختہ بولے کو کوکو

چڑیا بولے چوں چوں چوں
مرغا بولے ککڑوں کوں

طوطا بولے ٹیں ٹیں ٹیں
بطخا بولے قیں قیں قیں

بادل گرجیں گڑ گڑ گڑ
بجلی کڑکے کڑ کڑ کڑ

پتے کھڑکیں کھڑ کھڑ کھڑ
اولے برسیں تڑ تڑ تڑ (۱۹)

عموماً چھوٹے بچوں کو حروف تہجی سکھانے کے لئے قاعدہ پڑھایا جاتا ہے جس سے وہ حروف تہجی سیکھنے کے ساتھ ساتھ حروف کو جوڑ کر نئے الفاظ بنانے کا گر بھی سیکھتے ہیں اور توڑ جوڑ سے نئے الفاظ وتراکیب اور جملے بنانے کے عمل سے بھی گزرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے راہیؔ نے بھی ''ا'' سے ''ی'' تک کے حروف پر مشتمل قاعدہ اشعار کی صورت میں ترتیب دیا ہے جو باتصویر بھی ہے۔ یہ ایک طرح سے راہیؔ کا منفرد طریقہ تدریس ہے، جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ موثر بھی ہے۔ چند حروف پر مشتمل اشعار:

''ا''

ا سے امی املی کھائیں
ا سے ابو انڈے لائیں

''ب''

ب سے باجی باجا بجائے
ب سے بندر تجھے بلائے

"پ"

پ سے پتا پیلا ہے

پ سے پنکھا نیلا ہے (۲۰)

ان حروف تہجی کے بعد بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، کھ، گھ کی آوازوں کو سکھانے کے لئے ان حروف پر بھی اشعار لکھے گئے ہیں:

"بھ"

بھ سے بھالو بھنڈی کھائے

بھ سے بھیڑیا بھاگا جائے

"ڈھ"

ڈھ سے ڈھولک کون بجائے

میرا ابو ڈھاکہ جائے (۱۲)

کتاب کے آخر میں بچوں کو مختلف رنگوں سے آگاہ کرنے کے لئے کالا کوا، ہرا سا طوطا، پیلا پتا، سُرخ ٹماٹر کے عنوان سے چھوٹے چھوٹے اشعار قلم بند کئے گئے ہیں جو سہل ممتنع کی بہترین مثالیں ہیں:

کالا کوا

ے کالا کوا!

پیڑ پہ بیٹھا

شور مچائے

ہرا طوطا

ے ہرا طوطا!

سر کو جھکائے

چوری کھائے

پیلا پتا

ے پیلا پتا

پیڑ سے جھڑ کر

اڑتا جائے (۲۲)

غرض بچوں کے لئے راہی کا اٹھتہر (۷۸) صفحات پر مشتمل ''الف سے امی'' کا یہ چھوٹا سا شعری مجموعہ دیدہ زیب ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیمی لحاظ سے مفید معلومات کا خزانہ ہے۔

۳۔ ذرا سوچو تو:

بچے ہمارے مستقبل کے معمار ہیں، لیکن اس کے باوجود اُن کے ادب کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ ہر بڑا شاعر اور ادیب بچوں کے لئے لکھنے کو کم تر خیال کرتے ہوئے اس سے اجتناب برتتے ہوئے نظر آتا ہے۔ اگر بچوں کے لئے لکھنا اتنا ہی غیر ضروری اور غیر اہم ہوتا، تو علامہ اقبال اور غالب جیسے شعراء بچوں کے لئے ہرگز نہ لکھتے۔ بچوں کے ادب میں خصوصاً اردو شاعری کو وہ اہمیت نہیں دی گئی ہے، جس کی وہ مستحق ہے۔ چنانچہ بچوں کے لئے لکھی گئی شاعری بہت محدود ہے۔ خاص طور پر خیبر پختونخوا میں بچوں کے لئے نثری ادب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن شعری ادب کی روایت کچھ خاص مستحکم نہیں ہے۔ نوشین وِدودؔ اپنے تحقیقی مقالے میں اس بارے میں لکھتی ہیں:

> ''صوبہ سرحد میں بچوں کے لئے نثری قصے تو بہت سارے لکھے گئے لیکن ان کے لئے نظمیں لکھنے کا رجحان پنپ نہ سکا۔ جس کی بنیادی وجہ یہاں بچوں کے لئے رسائل کا نہ ہونا تھا۔ (۲۳)

خیبر پختونخوا میں شہر کوہاٹ سے تعلق رکھنے والے شجاعت علی راہیؔ کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے نہ صرف بچوں کے ادب کی طرف خاص توجہ دی بلکہ ان کے لئے شاعری بھی کی۔ اس بارے میں احمد پراچہ لکھتے ہیں:

> ''گویا کوہاٹ میں ایسا ادیب و شاعر صرف راہیؔ صاحب ہی ہے جس نے بچوں کے لئے ادب تخلیق کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔'' (۲۴)

راہیؔ نے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے بھی شاعری کی اور یہ بات باعث مسرت ہے کہ انہوں نے بچوں کے لئے شاعری میں قطعات پر مشتمل ''ذرا سوچو تو'' کے عنوان سے ایک مفید شعری مجموعہ تخلیق کیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ راہیؔ نے بچوں کے لئے بھی شاعری میں مختلف اصناف کو برتا ہے۔

قطعہ، اصنافِ نظم کی ایک مقبول صنف ہے۔ اردو ادب میں میر تقی میرؔ سے لے کر تقریباً تمام اہم شعراء نے ہر قسم کے موضوعات پر سیاسی، طنزیہ، اور مزاحیہ قطعات کہے ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی قطعہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''قطعہ (ق ط ع ہ) کے لغوی معنی ''ٹکڑا'' یا ''جزو'' کے ہیں۔ اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں، جس میں کوئی خیال یا واقعہ مسلسل بیان کیا گیا ہو۔'' (۲۵)

اس کتاب کا انتساب راہیؔ نے اپنے اساتذہ کرام کے نام کیا ہے۔ اس میں کل ۵۲ قطعات ہیں جو سہل ممتنع کی بہترین مثالیں ہیں۔ اس کتاب میں عام فہم اور سادہ انداز میں بچوں کو اسلام کے بنیادی ارکان سکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اخلاقی اقدار و صفات مثلاً والدین اور اساتذہ کی عزت و احترام، اُمید، ایثار، خدا ترسی، اتفاق، صبر، صفائی اور وفا کے

شعار کو اپنانے کے لئے خوب صورت انداز میں شاعری کے ذریعے ان کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے اور اخلاقی برائیوں جیسی غیبت، جھوٹ اور جہل سے بچنے کے لئے محاورات کا استعمال کیا گیا ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر منور علی شاہ بنوری لکھتے ہیں:

> ''راہی صاحب نے اسلام کے بنیادی ارکان اور ان تمام دینی اور اخلاقی اقدار کا احاطہ کیا ہے جو کسی بھی آدمی کو ایک اچھا انسان اور معاشرے کا مفید رکن بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا سادہ اور دل نشین انداز میں ذکر کیا گیا ہے اور ان نقائص کی بھی نشان دہی کی ہے جن سے اجتناب انسانی معاشرے کو حیوانی معاشرے میں بدلنے سے روکتا''۔ (۲۶)

شجاعت علی راہیؔ نے بھی ''ذرا سوچو تو'' میں مختلف موضوعات پر مبنی قطعات لکھے ہیں۔ کتاب کا آغاز ''حمد'' اور ''نعت'' پر مشتمل قطعات سے کیا گیا ہے۔ راہیؔ نے بچوں کے لئے اپنے دو شعری مجموعوں ''نرم شگوفے'' اور ''الف سے امی'' میں صرف ''حمد'' پر مبنی نظمیں لکھی تھیں، لیکن زیر نظر شعری مجموعے میں ''حمد'' کے بعد ''نعت'' کی صنف کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وہ امانت کا ، صداقت کا سلیقہ دے گیا
وہ عدالت ، امامت کا سلیقہ دے گیا
وہ سخاوت اور شفقت کا سلیقہ دے گیا
دشمنِ جاں سے محبت کا سلیقہ دے گیا۔ (۲۷)

اس کے بعد ارکانِ اسلام یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے موضوع پر بالترتیب چار قطعات لکھے گئے ہیں، جس میں بتایا گیا ہے کہ نماز پڑھنے سے انسان کا رتبہ بلند ہوتا ہے اور نماز ہی وقت کی قدر و قیمت، صفائی اور سادگی کی اہمیت بتاتی ہے۔ اسی طرح بھوک و پیاس کا احساس صرف وہی بندہ کر سکتا ہے جو خود بھوکا پیاسا رہے اور صرف روزہ کی صورت میں ہی انسان اس بات کا احساس اچھی طرح سے کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ ہمسائیوں کا انسان پر بڑا حق ہوتا ہے، اگر کسی شخص کا ہمسایہ بھوکا رہے اور وہ حقوق اللہ کی ادائیگی کی غرض سے حج ادا کرنے چلا جائے۔ تو ایسے آدمی کا حج مقبول نہیں ہوتا۔ راہیؔ نے اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ دنیا میں کوئی بھی شخص بھوکا نہ سوئے گا، اگر ہر بندہ زکوٰۃ ادا کرنے کا فریضہ سرانجام دے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

نماز

خاک پر سر کو جھکاتی ہے نماز
عرش پر ہم کو اٹھاتی ہے نماز

وقت کیا شے ہے، صفائی کیا ہے
سادگی کیا ہے، بتاتی ہے نماز(۲۸)

روزہ

تم شکم سیر ہو، یہ کیا جانو
بھوک و پیاس کس کو کہتے ہیں تم کیا جانو
روزہ رکھو تو جان جاؤ گے
بھوکے پیاسے بھی لوگ رہتے ہیں(۲۹)

زکوٰۃ

حسن خوبی سے کام چلتا رہے
کوئی فتنہ رہے نہ جھگڑا رہے
سب نکالیں اگر زکوٰۃ تو پھر
کوئی بھوکا نہ کوئی ننگا رہے(۳۰)

اسی طرح راہیؔ نے اپنے قطعات میں ماں باپ اور استاد کی عزت واحترام کو خوب صورت انداز میں باور کرایا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ماں کی مثال ٹھنڈی چھاؤں والے درخت کی سی ہے:

ماں ہو زندہ تو سمجھو بیٹھے ہو
ایک برگد کی ٹھنڈی چھاؤں تلے
آسمانوں میں ڈھونڈتے ہو تم
اور جنت ہے ماں کے قدموں تلے(۳۱)

قطعہ ''استاد کی عزت'' میں لکھتے ہیں کہ عزت کا تاج صرف وہی شخص پہنتا ہے جو استاد کی عزت واحترام کرنا جانتا ہے:

علم ملتا ہے، حلم ملتا ہے
اہل دل کا خراج ملتا ہے
جو بھی کرتا ہے عزتِ استاد
اس کو عزت کا تاج ملتا ہے(۳۲)

راہیؔ ''ذرا سوچو تو'' کے قطعات میں اخلاقی اقدار وصفات کو اپنانے، ہر حالت میں سچ کا ساتھ دینے اور صبر و امید کا دامن تھامے رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وقت کی قدر و قیمت اور دشمنی میں بھی با اصول رہنے کا درس عظیم

دیتے ہیں۔ اسی طرح سچ کی اہمیت اور جھوٹ کی حقیقت کو ان الفاظ میں عیاں کرتے ہیں:

لاکھ تالے لگا کے اس کو رکھو
جھوٹ کا پول کھل ہی جا تا ہے
سچ کو پردے چھپا نہیں سکتے
یہ تو سورج ہے، جگمگا تا ہے(۳۳)

اس قطعے میں راہیؔ نے سچ کو سورج کہہ کر خوب صورت استعارہ تخلیق کیا ہے۔

صبر (جو ایک اچھی صفت ہے) کی مثال اس سواری کی سی ہے جو اپنے سوار کو گرنے سے بچا کر خیر و عافیت سے منزل تک پہنچاتی ہے۔ قرآن کریم میں بار بار اس کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ صبر کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا پھل بہت میٹھا ہوتا ہے۔ دیر سے ہی سہی، لیکن ملتا ضرور ہے۔ اس حوالے سے راہیؔ نے بہت پُر اثر قطعہ تحریر کیا ہے، لکھتے ہیں:

جس زمین میں بھی اس کو کاشت کرو
پھول اس پر ضرور کھلتا ہے
دیر ہی سے سہی مگر، راہیؔ
صبر کا پھل ضرور ملتا ہے۔(۳۴)

راہیؔ نے اس قطعہ میں اپنا تخلص استعمال کر کے اس کا مزہ دوبالا کر دیا ہے۔

راہیؔ رجائیت پسند شاعر ہیں۔ ان کے ہاں نا امیدی، یاس اور قنوطیت نام کی کوئی چیز نہیں۔ وہ ہمیشہ امید اور حوصلے کا پیغام دیتے ہیں:

''اُمید''

کئی چاند سورج تیرے منتظر ہیں
مگر تو گپھاؤں سے نکلے تو جانے
بلاتی ہیں تجھ کو دھنک کی صدائیں
اگر تو گھٹاؤں سے نکلے تو جانے(۳۵)

اس کے علاوہ راہیؔ نے وقت کی اہمیت اور قدر و قیمت پر قطعہ لکھ کر بچوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے، تو وقت بھی ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ وقت ہمیشہ ان لوگون کا ساتھ دیتا ہے۔ جو اس کی قدر کرتے ہیں:

"وقت"

وقت دیتا نہیں ہے اس کا ساتھ
جس کو ہوتا نہیں ہے وقت کا پاس
وقت دیتا ہے اس کے ہاتھ میں ہاتھ
جس کو ہوتا ہے وقت کا احساس(۳۶)

راہیؔ ایک اصول پسند انسان ہیں۔ اس لئے دشمنی بھی اصولوں کے ساتھ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ دوستوں کے حق میں نرم خو اور دشمنوں کے لئے انتہائی سخت مزاج واقع ہوئے ہیں۔ اپنے شعری مجموعے "پھول کھلے یا نہ کھلے" میں لکھتے ہیں:

میں دوستوں کے واسطے کپاس سے بھی نرم تر
پہ دشمنوں کے واسطے درخت سے بھی سخت ہوں (۳۷)

اسی مضمون کو انہوں نے بچوں کے لئے عام فہم اور آسان الفاظ میں ایک قطعے کی صورت میں بیان کیا ہے۔ دوستی اور دشمنی کے عنوان سے لکھے گئے اس قطعہ میں راہیؔ بچوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دوستوں کے لئے ہمیشہ محبت کا ایک مہکتا ہوا پھول بنو اور دشمنی میں بھی با اصول بن کر رہو! دشمن پر پیچھے سے وار کرنے کی بجائے اسے للکار کر اور مخاطب کرتے ہوئے وار کرو۔ ملاحظہ ہو:

دوستوں کے لئے محبت کا
اک مہکتا ہوا سا پھول بنو
وار للکار کر کرو، راہیؔ
دشمنی میں بھی با اُصول بنو(۳۸)

اس قطعے میں بھی راہیؔ نے خود کو مخاطب کر کے اپنے تخلص کا بخوبی استعمال کیا ہے۔ اس کتاب کے کئی قطعات میں انہوں نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے جس نے اشعار کی خوب صورتی میں ہر چند اضافہ کیا ہے۔

راہیؔ نے جس طرح اخلاقی اقدار وصفات کو اپنانے پر زور دیا ہے، اسی طرح اخلاقی برائیوں اور خامیوں مثلاً جھوٹ اور غیبت سے بچنے کی تلقین بھی کی ہے۔ جھوٹ جو تمام اخلاقی برائیوں کی جڑ ہے۔ راہیؔ نے اس سے بچنے کا سبق اس انداز سے دیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ کیونکہ عموماً جب انسان ایک دفعہ جھوٹ بولتا ہے، تو اسی جھوٹ کو چھپانے کے لئے وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتا چلا جاتا ہے۔ راہیؔ نے اس مضمون کو پُر اثر انداز میں نظم کر کے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

جھوٹ بولو گے ایک بار تو
درجنوں جھوٹ اور بولو گے

جھوٹ کے پاؤں کس نے دیکھے ہیں
آخرش اپنے راز کھولو گے(۳۹)

اس قطعے میں محاورہ ''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے'' کو بامعنی انداز میں استعمال کیا گیا ہے کہ جھوٹ کبھی چھپتا نہیں، ایک نہ ایک دن ضرور اس کا پتہ چل جاتا ہے اور ذلت و رسوائی کے سوا انسان کو کچھ نہیں ملتا۔ اخلاقی برائی ''غیبت'' سے بچنے کے لئے راہیؔ نے ایک حدیث کو نقل کر کے قطعے کے روپ میں ڈھالا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ غیبت کرنے والا شخص ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے مسلمان بھائی کا گوشت کھائے اور ایسا کرنا کوئی بھی مسلمان پسند نہیں کرے گا۔

ہاتھ تو اس کے کچھ نہیں آتا
مفت میں اپنا جی جلاتا ہے
جو بھی کرتا ہے غیبتیں، راہیؔ
مردہ بھائی کا لحم کھاتا ہے(۴۰)

راہیؔ جب بڑوں کے لئے شاعری کرتے ہیں تو ان کی شاعری میں بالغ نظری جھلکتی ہے لیکن بچوں کے لئے لکھتے وقت وہ اپنے آپ کو ان کی سطح پر لا کر ان کی نفسیات، دلچسپیوں، رجحانات اور ذہنی استعداد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کیونکہ بڑوں کی نسبت بچوں کے لئے لکھنا قدرے مشکل ہوتا ہے۔ اس بارے میں راہیؔ خود کہتے ہیں:

''جب میں چھوٹا تھا تو بڑوں کے لئے لکھتا تھا اور اب جا کر کہیں اس قابل ہوا ہوں کہ بچوں کے لئے لکھ سکوں''(۴۱)

بچوں کے لئے لکھتے وقت راہیؔ اپنے اندر کے بڑے شاعر کو سلانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ بایں ہمہ ان کے زبان کی چاشنی، رفعت خیال اور منظر کشی کا حسن کہیں کہیں اپنی جھلک دکھا جاتا ہے۔ ان کا ایک قطعہ ''وفا'' ملاحظہ ہو، جو شامل کتاب ہے:

وفا

رُتوں نے بر ف بھی اوڑھی، غبار چادر بھی
یہ لہلہاتا چمن اب بھی ہے وہی کہ جو تھا
ہزار بدلے زمین وزمن نے پیراہن
مگر وفا کا چلن اب بھی ہے وہی کہ جو تھا (۴۲)

راہیؔ اپنے تخلیقی سفر میں ہر چھوٹے بڑے شاعر اور ادیب سے متاثر ہوتے ہیں اور اس بات کا اعتراف وہ خود ایک

انٹرویو میں کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں ہر چھوٹے بڑے ادیب اور شاعر سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوا ہوں جہاں بھی مجھے لفظ وخیال کا جگنو ملا، میں نے اس کی روشنی سے اپنا من اُجالا'' (۴۳)

زیر نظر مجموعے میں ''روح ایماں'' کے عنوان سے لکھے گئے قطعہ میں وہ شاعر مشرق علامہ اقبال کی تقلید میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

لاکھ قرآن پڑھو، نمازیں پڑھو
دل مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں
لاکھ روزے رکھو، زکوٰتیں دو
روح ایماں نہیں تو کچھ بھی نہیں(۴۴)

یہ علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل شعر سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے:

؎ خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل ونگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں (۴۵)

راہیؔ نے چند ایک قطعات میں تلمیحات کا استعمال بھی کیا ہے جو آسان اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہیں۔ مثلاً سچ اور دنیا کی بے ثباتی کے عنوانات پر لکھے گئے قطعات پر ایک نظر ڈالیے:

''سچ''

جانے کیا لطف سچ میں ہے سقراط
زہر پی کر بھی مسکراتا رہا
اور قرآن کی آیتیں شبیر
نوک نیزہ پہ بھی سناتا رہا (۴۶)

''سقراط'' اور ''شبیر'' کی خوب صورت تلمیحات کو استعمال کر کے مشہور واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ساتھ میں ہر حال میں سچ بولنے کی اہمیت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ ایک اور قطعہ جو دنیا کی بے ثباتی پر لکھا گیا ہے۔ اس میں بھی چند اہم تلمیحات کو استعمال کیا گیا ہے مثلاً:

جو سر بسر غرور تھا، وہ سر کہاں گیا
قاروں کہاں، وہ سیم کہاں ،زر کہاں گیا
رستم سا شاہ زور و دلاور کہاں گیا
مٹی سے پوچھ تاج سکندر کہاں گیا(۴۷)

''سقراط''، ''شبیر''، ''قارون''، ''رستم'' اور ''تاج سکندر'' مشہور تاریخی شخصیات سے متعلق تلمیحات ہیں۔ اس کے

علاوہ ''رستم ساشاہ زور'' تشبیہ اور ''تاج سکندر'' مرکب اضافی بھی ہے۔ اپنے وطن اور شہر سے ہر انسان کو فطرتاً محبت اور انس ہوتا ہے۔ راہی کو بھی اپنے آبائی شہر ''کوہاٹ'' سے والہانہ محبت ہے، کہتے ہیں کہ شہر کوہاٹ نے ہمیں پیار اور وفاداری کا جو درس دیا ہے۔ وہ ہم ساری عمر لوگوں میں بانٹ رہے ہیں:

بانٹتے پھرتے ہیں ہم سارے زمانے میں اسے
تو نے بخشی ہے ہمیں پیار کی دولت کوہاٹ
قرض یہ جتنا چکاتے ہیں تو بڑھتا ہے کچھ اور
کیسے لوٹائیں وفاؤں کی امانت کوہاٹ(۴۸)

کتاب کے آخر میں ٹائٹل ''ذرا سوچو تو'' پر بھی قطعہ باندھا گیا ہے۔ جس میں زندگی کے فانی ہونے کے حوالے سے راہیؔ کہتے ہیں:

کون کب تک رہا سلطان ، ذرا سوچو تو
تم بھی دو دن کے ہو مہمان ، ذرا سوچو تو

اگلے پل کون جیئے ، کون مرے، کس کو خبر
اس پہ اک عمر کا سامان ، ذرا سوچو تو(۴۹)

کتاب کے ٹائٹل پر قطعہ باندھنا راہیؔ کے فن کی انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کے علاوہ شجاعت علی راہیؔ نے اس کتاب میں نہج البلاغہ، امام حسینؓ، رب زدنی علماً، باپ کا ادب، صراطِ مستقیم، کار خیر، سچ اور جھوٹ، لطف سحر خیزی، کسان، انسان اور آدمی، ایثار، پیڑ، شجر، حالات، خدا ترسی، خزینہ علم، دکھ اور سکھ، اتفاق، روشن دماغی، صفائی، علم، علم اور جہل، سستی محنت، قرض، کتاب، انسانوں سے پیار اور نشہ آخرت جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

خوب صورت موضوعات، زبان کی گھلاوٹ اور معانی کی گہرائی کے لحاظ سے راہیؔ کی تحریر کردہ یہ کتاب پرائمری جماعت سے لے کر جماعت دہم تک کے بچوں کے لئے مناسب اور موزوں ہے۔ بچوں کی عمر اور ذہنی استعداد کے لحاظ سے اس کی درجہ بندی کر کے یہ قطعات اردو مضمون کے نصاب میں بھی شامل کئے جا سکتے ہیں، تا کہ راہیؔ جیسے سنجیدہ لکھاری کے پیغام کو نئی نسل کی ایک بہت بڑی تعداد تک پہنچایا جا سکے۔

۴۔ مطلب بے مطلب (نان سینس رائمز):

شجاعت علی راہیؔ نے بچوں کے ادب میں چونکہ مختلف اصناف کو برتا ہے، اس لئے بچوں کے لیے شاعری میں انہوں نے ''نان سینس رائمز'' لکھنے میں بھی کمال کا ہنر اور اپنی مہارت دکھائی ہے۔ ''مطلب بے مطلب'' ان کا نان سینس

رائمز پر مشتمل ایک شعری مجموعہ ہے۔اس بارے میں طاہر یوسف ہاشمی لکھتے ہیں:

''یہاں میں نونہالوں کے لئے ان کی مطبوعہ نظموں کے مجموعے ''زم شگوفے'' کا تذکرہ بھی مناسب سمجھتا ہوں۔اور غیر مطبوعہ منظومات ''مطلب بے مطلب'' کا ذکر بھی نامناسب نہیں ہوگا۔موخرالذکر کی بعض نظمیں اپنے خالص اور مکمل نان سینس (NON SENSE) کی وجہ سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔لوئیس کیرل کے بعد ایسی نظمیں بہت کم پڑھنے کو ملتی ہیں۔کئی لکھاریوں نے اس مشکل صنف سخن میں اپنی مہارت کا مظاہرہ کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔لیکن ان کی کاوشیں سینس (SENSE) اور نان سینس (NON SENSE) کا ایسا مایوس کن ملغوبہ بن کر رہ گئی ہیں جو سینس اور نان سینس دونوں کے تاثر سے عاری ہے۔(۵۰)

شجاعت علی راہی کا بچوں کے لئے تخلیق کردہ یہ مجموعہ کل ۴۹ چھوٹی چھوٹی نظموں پر مشتمل ہے۔کتاب کا سرورق دلچسپ تصویروں اور کارٹونز سے مزین ہے۔جو''مطلب بے مطلب'' کی صحیح عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔یہ نظمیں موزوں اور مناسب تصاویر کے ساتھ بہت سادہ،رواں اور عام فہم زبان میں لکھی گئی ہیں۔مختلف جانوروں اور پرندوں کے بارے میں معلومات اور ان کی عادات وخصائل کا ذکر مزاحیہ انداز میں کیا گیا ہے۔

چھوٹی عمر میں بچے عموماً مختلف رنگوں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔نہ صرف ان کی آوازیں ان کو بھلی لگتی ہیں بلکہ ان کی حرکات وسکنات کا بھی بغور سے مشاہدہ کرتے ہیں۔راہی نے اپنی کتاب ''مطلب بے مطلب'' میں چند رائمز پرندوں کے بارے میں لکھے ہیں۔مثلاً مرغابی،مرغی،طوطا اور کوا وغیرہ،ملاحظہ ہوں:

''ٹھگنی مرغابی''

اک ٹھگنی مرغابی تھی
جو سارس کی بھابی تھی
مٹک مٹک کر چلتی تھی
ناچنا اس کی بابی تھی(۵۱)

''بھوکی مرغی''

بھوکی سی اک مرغی جب
کھانے پر آجاتی تھی
کھاتے کھاتے آخر کار
خود کو بھی کھا جاتی تھی(۵۲)

راہیؔ نے لفظ 'بابیٔ' (جس کو اردو میں مشغلہ کہتے ہیں) انگریزی زبان کا لفظ استعمال کر کے بچوں کو انگریزی حروف سکھانے کی بھی کوشش کی ہے، جو راہی کی وسیع النظری ہے کہ بچے اردو زبان کے الفاظ سیکھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ بھی سیکھ جائیں اور ان کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ مزید برآں کچھ افعال اور حرکات وسکنات یعنی ''ناچنا'' اور ''مٹک مٹک کر چلنا'' کے استعمال سے راہیؔ نے نہ صرف اشعار کی خوب صورتی میں اضافہ کیا ہے بلکہ ان دو افعال کے ذریعے تفریح کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ'' ناچنا'' خوشی کی کیفیت کا اظہار ہے اور'' مٹک مٹک کر چلنا'' بھی ایک ادا اور اسی کیفیت کا دوسرا نام ہے۔

پرندوں کی طرح راہیؔ نے کچھ جانوروں کو بھی موضوع بنا کر ان پر نان سینس رائمز لکھی ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ نہ صرف بچوں کی ذہنی صلاحیتوں ک جلا بخشتے ہیں بلکہ اس میں بچوں کے لئے تفریح کا بھی بہترین مواد موجود ہے۔ مثلاً ''خوش فہم گیدڑ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

اِک خوش فہم سا گیدڑ تھا
خود کو دلیر سمجھتا تھا

کاٹ کے مردہ ریچھ کی دم
خود کو شیر سمجھتا تھا (۵۳)

بچوں کو یہ بتانے کے لئے کہ گیدڑ ایک ڈرپوک اور بزدل جانور ہے۔ راہیؔ نے بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر گیدڑ کی بہادری کو اس کی خوش فہمی سے تعبیر کیا ہے کہ وہ ایک مردہ ریچھ کی دم کو کاٹ کر خود کو بہادر و دلیر کہہ کر شیر سمجھتا ہے۔

ہاتھی جو جسامت کے اعتبار سے ایک موٹا جانور ہے اور کیڑے مکوڑے یا پکوڑے کھانا اس کے مزاج کے خلاف ہے لیکن راہیؔ نے مزاح پیدا کرنے کے لئے ایک ایسے ہاتھی کا تذکرہ کیا ہے جو یہ چیزیں بھی کھایا کرتا تھا۔ لفظ خوش خوراک سے اس مختصر نظم میں مزید لطف پیدا کیا گیا ہے اور پیاس لگنے پر گرم پکوڑے کھانا گویا مزاح در مزاح ہے:

اک ہاتھی تھا خوش خوراک
کیڑے مکوڑے کھاتا تھا

جب لگتی تھی پیاس اسے
گرم پکوڑے کھاتا تھا (۵۴)

اسی طرح ایک ''بتاشے خور بندر'' کے بارے میں راہیؔ کہتے ہیں کہ وہ ہر روز ڈھیر سارے بتاشے کھاتا تھا اور بتاشے کھانے کے بعد خوشی سے لوگوں کو کھیل تماشے دکھاتا تھا۔ بندر چونکہ نقالی اور کرتب دکھانے کے لئے مشہور ہے، اس

لئے یہاں بھی اس کی اس عادت کا ذکر کیا گیا ہے:

اک تھا بندر بتاشے خور
خوب بتاشے کھاتا تھا
روز بتاشے کھا کر وہ
کھیل تماشے دکھاتا تھا(۵۵)

''کالا بھینسا'' کے عنوان سے بھی ایک نظم لکھی گئی ہے۔ کالے بھینسے کا خود کو آئینہ میں دیکھنا، فلمی غزلیں گانا اور خود کو ہیرو سمجھنا منفرد مزاح نگاری ہے:

کالا سا اک بھینسا تھا
آئینہ دیکھتا رہتا تھا
فلمی غزلیں، گاتا تھا
خود کو ہیرو کہتا تھا(۵۶)

اسی طرح ''ہوشیار کتے''، ''بہادر بلی''، ''بہری گلہری''، ''شیطان چوہا''، ''جواں مرگ مگر مچھ''، ''عجیب چیتا''، ''کچالو خور بھالو''، ''بدصورت گینڈا''، ''گویا اونٹ'' اور ''جاپانی بلی'' کے عنوان سے مختلف جانوروں کے بارے میں ہلکی پھلکی آسان، دلچسپ اور مزاحیہ انداز میں نظمیں لکھی گئی ہیں۔

زیر نظر کتاب ''مطلب بے مطلب'' میں راہیؔ نے کچھ ایسی مزاحیہ نظمیں بھی لکھی ہیں جو نان سینس ہونے کے باوجود معاشرے کے کچھ حقائق کو پیش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جیسے کہ نظم ''ڈرپوک شوہر'' ملاحظہ ہو:

اک ڈرپوک سا شوہر تھا
بیوی سے گھبراتا تھا
اکثر شیر کے پنجرے میں
ڈر کر وہ چھپ جاتا تھا(۵۷)

اس نظم میں اس حقیقت پر سے پردہ اُٹھایا گیا ہے کہ آج کل کے شوہر اپنی بیویوں سے بہت ڈرتے ہیں۔

اب ایک نظم ''باتونی بیوی'' کے بارے میں بھی ملاحظہ ہو:

میرے ایک پڑوسی نے
بیچ دیا ہے ٹی وی کو
پہلے ٹی وی سنتا تھا
اب سنتا ہے بیوی کو(۵۸)

اس کے علاوہ راہیؔ کی اس کتاب میں چند ایک ایسی نظمیں بھی ہیں جو انتہائی سادہ، آسان اور رواں بحروں میں

لکھی گئی ہیں، جس کے فقرے سُر اور لَے میں پڑھنے سے زبان پر از خود چڑھ جاتے ہیں اور بچے حد درجہ محظوظ ہو کر پُر مسرت ہو جاتے ہیں:

''کچالو خور بھالو''

کالا سا اک بھالو تھا
کھاتا روز کچالو تھا
اک دن جاگا نیند سے جب
سارے کا سارا آلو تھا(۵۹)

''شہد کی مکھی''

ہم سے ملنے باغ میں اک
شہد کی مکھی آئی تھی
بھر کر ایک کٹورے میں
پھولوں کا رس لائی تھی(۶۰)

نظم ''شہد کی مکھی'' کی امیجری بہت ہی دلفریب اور شعریت سے بھرپور ہے۔

المختصر بچے نان سینس رائمز کو بہت پسند کرتے ہیں، کیونکہ سُر اور لے میں کسی چیز کو پڑھنے سے زیادہ خوشی اور مسرت محسوس کرتے ہیں۔ نان سینس رائمز تفریح کے علاوہ بچوں میں زبان دانی کی مہارتیں پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس سے بچوں میں اپنے اردگرد کے حالات کی سمجھ بوجھ، ذہنی ترقی، ثقافتی شعور اور خیالی دنیا کے تصور کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور نظموں کی موسیقیت و ہم قافیہ الفاظ سے آوازوں کا لطف پیدا کر کے بچوں کی دلچسپی اور مسرت دونوں کا باہم حصول ممکن ہوتا ہے۔ انہی مقاصد کو مدِ نظر رکھ کر راہیؔ نے بھی بچوں کے لئے اپنا نان سینس رائمز پر مشتمل مجموعہ ''مطلب بے مطلب'' تخلیق کیا۔ یہ شجاعت علی راہیؔ کا پرائمری کی سطح پر پڑھنے والے بچوں کے لئے انمول تحفہ ہے۔ تمام نظموں میں زبان، ذخیرہ الفاظ کا چناؤ، کردار، جملے اور اسلوب بیان چھوٹے بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ اردو ادب میں نان سینس رائمز پر مشتمل اس نوعیت کا مجموعہ پہلے کسی شاعر کے ہاں نہیں ملتا، اس اعتبار سے اس مجموعے کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔

۵۔ مشاعرے:

شجاعت علی راہیؔ کا بچوں کے لئے پانچواں شعری مجموعہ ''مشاعرے'' کے نام سے موسوم ہے جس میں انہوں نے پرندوں، جانوروں اور حشرات الارض کے مابین مشاعرے، ان کی خصوصیات اور جبلتوں کو مدِ نظر رکھ کر منعقد کروائے ہیں۔ راہیؔ نے ان مشاعروں کے ذریعے بچوں کو جانوروں اور پرندوں کے متعلق معلومات دلچسپ اور منظوم انداز میں پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مشاعرے کے ذریعے عموماً شعروادب کی مشرقی تہذیب کے خدوخال کو اجاگر کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اخلاقی و روحانی اقدار اور معلومات کو نئی نسل تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ جسے راہیؔ نے منفرد انداز میں اپنا کر ثابت بھی کر دیا ہے اور اپنا شعری مجموعہ ''مشاعرے'' لکھ کر دنیا کو محبت، محنت، ذمہ داری اور حُسن وخیر کا درس دیا ہے۔ انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ستر ہزار مخلوقات کو پیدا کیا، گو کہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے سبب سب پر فوقیت اور اوّلیت کا درجہ ضرور رکھتا ہے اور باقی مخلوقات اپنے عقل وشعور میں انسان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ انسانوں سے زیادہ نظم وضبط، محنت، اور جدوجہد کی حامل زندگی گزار رہے ہیں اور ان سے زیادہ باعزت، پروقار اور وفادار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اکرام اللہ اس بارے میں کہتے ہیں:

> ''بے شک انسان اشرف المخلوقات ہے کیونکہ ربِ کائنات نے اُس کو عقل وشعور سے نوازا ہے اور اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اُسے زبان عطا کی ہے، لیکن دیگر مخلوقات انسان کی طرح عقل وشعور نہ رکھتے ہوئے بھی انسان سے زیادہ نظم وضبط، امن، محبت اور جدوجہدِ مسلسل کی حامل ہیں۔'' (۶۱)

راہیؔ نے بچوں کو مختلف جانوروں اور پرندوں سے متعارف کروانے کے لئے اس سے پہلے مختلف شعری مجموعوں میں بھی بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن زیرِ نظر مجموعے میں انھوں نے ان جانوروں اور پرندوں پر شاعری کرنے ساتھ ساتھ اخلاقی وروحانی قدروں کو باور کرانے کی سعی کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ قدیم انسانی تہذیب سے لے کر دورِ جدید کے بوقلمونیوں اور رنگینیوں کی زندگی تک جانور، پرندے اور حشرات الارض انسانی زندگی کا اہم حصہ رہے ہیں اور انسان کی بہت ساری ضرورتوں کو پورا کرنے، ان کے فنون کی پیش رفت اور رہنمائی میں یہ تمام جانور کسی نہ کسی طرح شریک سفر رہے ہیں۔ اس بارے میں شجاعت علی راہی کتاب کے افتتاحیہ میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> ''جانور، پرندے اور حشرات الارض ہماری زندگی میں کچھ اس طرح سے شریک رہے ہیں کہ انہیں ہم اپنی زندگی سے خارج کرنے کا کوئی تصور ہی نہیں کر سکتے۔ ہماری ساری ضروریات پوری کرنے کے علاوہ ان سب کا ہماری روح اور فکر سے جو تعلق ہے اور جس بے نام انداز میں وہ ہمیں ایک اچھی اور معیاری زندگی بسر کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، وہ نہایت اہم ہے۔ ہماری سوچوں کے عمل، ہماری روحانی ترقی اور ہمارے فنون کے پیش رفت میں پرندے، جانور اور کیڑے مکوڑے ہمیشہ سے ہمارے ہم سفر رہے ہیں، جس کے لئے ہم ان کے ممنونِ احسان ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس خالق کی بے پناہ نعمتوں کا شکر بھی ہم پر واجب ہے، جس نے ہمیں کونجوں کی ڈاریں، جگنوؤں کی جھرمٹ، رنگا رنگ مچھلیوں کے غول شہ زور گھوڑوں کے دل عطا کئے اور ان کے ذریعے ہماری رہنمائی کی۔ (۶۲)

یوں راہیؔ نے ہماری زندگی میں ان جانوروں اور پرندوں اور حشرات الارض کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس امر کی بھی نشاندہی کی ہے کہ ان میں پائے جانے والی صلاحیتیں، جبلتیں اور خصوصیات ہمارے لئے مشعل راہ ہیں جن سے رہنمائی حاصل کر کے ہم اپنی اصلاح کر سکتے ہیں کیونکہ روئے زمین پر شرف و امتیاز صرف اُن لوگوں کو ہی حاصل ہے جو اپنی ان صلاحیتوں سے (جو اللہ نے ان میں ودیعت کی ہوتی ہیں) نہ صرف خود فائدہ اٹھاتے ہیں بلکہ مخلوق خدا کو بھی اس سے مستفید کراتے ہیں۔ اسی طرح یہ طرۂ امتیاز جانوروں کو بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی ذات، صلاحیتوں اور جبلتوں سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ ۱۰۹ صفحات پر مشتمل یہ کتاب "مشاعرے" دیدہ زیب سرورق کے ساتھ کل چار مشاعروں پر مشتمل ہے جس کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ پرندوں کا مشاعرہ:

اس مشاعرے میں مختلف قسم کے پرندے مثلاً طوطا، چڑیا، کوا، بطخ، مرغ، کبوتر، اُلو، چیل اور مور شامل ہیں، ناظم مشاعرہ طوطا ہے۔

۲۔ خشکی کے جانوروں کا مشاعرہ:

اس مشاعرے میں خشکی کے جانور، کتا، خرگوش، گلہری، گدھا، بھینس، زرافہ، بندر، گھوڑا، چیتا، بلی اور اُونٹ شامل ہیں۔ ناظم مشاعرہ "کتا" ہے۔

۳۔ پانی کے جانوروں کا مشاعرہ:

اس میں پانی کے کچھ جانور مثلاً مینڈک، مچھلی، کچھوا اور مگرمچھ شامل ہیں۔ یہ مشاعرہ چونکہ ہنگامی بنیادوں پر اچانک ترتیب دیا گیا ہوتا ہے، اس لئے اس میں صرف گنے چُنے جانوروں (شعرا) کو ہی شامل کیا گیا ہے۔ اس میں ناظم مشاعرہ مینڈک ہے۔

۴۔ حشرات الارض اور رینگنے والے جانوروں کا مشترکہ مشاعرہ:

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ حشرات الارض اور رینگنے والے تمام جانوروں کا مشترکہ مشاعرہ ہے لہٰذا اس میں تمام کیڑے مکوڑے اور رینگنے والے جانور شامل ہیں۔ مثلاً تتلی، مکھی، مچھر، ریشم کا کیڑا، بچھو، مکڑی، سانپ، شہد کی مکھی اور چیونٹی وغیرہ۔ ناظم مشاعرہ تتلی ہے۔

۱۔ پرندوں کا مشاعرہ:

سب سے پہلے راہیؔ پرندوں کا مشاعرہ منعقد کرواتے ہیں جس میں صدارت مور کے حصے میں آتی ہے۔ مہمان خصوصی چیل ہے اور نظامت طوطے کے حوالے ہوتی ہے۔ شعرائے کرام میں مور، چیل اور طوطے کے علاوہ چڑیا، کوا، بطخ،

مرغ، کبوتر اور اُلو شامل ہیں۔ راہیؔ نے بڑی ہنر مندی سے انسانوں کے ہاں منعقد مشاعرے کا حال ایک جنگلی طوطے کی زبانی بیان کیا ہے جو جنگل واپس جا کر سب پرندوں کو اس جیسا مشاعرہ منعقد کرانے کی ترغیب دیتا ہے، جس پر سب جانور اتفاق کرتے ہیں۔ چنانچہ مشاعرے کے لئے ایک شاندار اور سایہ دار برگد کو منتخب کیا جاتا ہے۔ تقریب کا آغاز طوطا چند شعرائے کرام (پرندوں) کی تعریف، ان کی صلاحیتوں اور خصوصیات کو نمایاں کر کے کرتا ہے:

> ''دوستو! آپ کی کیا بات ہے! نہ کوئی بلندی پرواز میں آپ جیسا ہے اور نہ خوش رنگی میں، نہ کسی نے آپ کی طرح انسانوں کو صبح سویرے خواب خرگوش سے جگایا۔ یہ اعزاز بھی آپ ہی کو حاصل ہے کہ پیڑ پر بیٹھ کر گوتم بدھ کی طرح گیان دھیان کریں۔ جھیل کی سطح پر آپ کا چلنا جھیل کی خوب صورتی کو چار چاند لگاتا ہے اور جب آپ پَر پھیلا کر اُڑتے ہیں تو فضا میں گویا پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ (۶۳)

پھر ''طوطا'' ناظمِ مشاعرہ کی حیثیت سے مشاعرے کی روایت کے مطابق سب سے پہلے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرتا ہے:

میں سبز سا اک شہزادہ ہوں
میں چوری کا دلدادہ ہوں
میں میٹھی چوری کھاتا ہوں
اور ٹیں، ٹیں کر کے گاتا ہوں (۶۴)

اس نظم میں راہیؔ نے طوطے کے سبز رنگ، چوری کھانے کی عادت، اور اس کی آواز ٹیں، ٹیں، ٹیں یعنی تین مختلف خصوصیات کو ایک شعر میں سمویا ہے۔ طوطے کے بعد چڑیا، جس کے بغیر کوئی درخت یا فضا پر رونق نہیں لگتی، فضا میں ہلکا پھلکا رقص کر کے اپنا کلام سناتی ہے:

میں چوں چوں چوں چوں کرتی ہوں
خالہ بلی سے ڈرتی ہوں
میں دانہ دنکا کھاتی ہوں
اور صبح سویرے گاتی ہوں (۶۵)

گویا راہیؔ نے اس نظم کے چار مصرعوں میں چڑیا کی چار خصوصیات اور عادات کو بیان کیا ہے۔ یعنی پہلے اس کی آواز چوں، چوں، چوں کا ذکر کیا گیا ہے، پھر بلی سے ڈرنے کے عمل اور دانہ چگنے کا بتایا گیا ہے اور صبح کے وقت اس کے چہچہانے کو گانا گانے سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعد ناظمِ مشاعرہ ''کوّے'' کو اپنے اشعار سنانے کے لئے دعوت دیتا ہے اور کوا خوشی سے کائیں کائیں کر کے یوں نغما سرا ہوتا ہے:

میں رات سے بڑھ کر کالا ہوں
پَر اپنے گھر کا اُجالا ہوں
میں کائیں کائیں کرتا ہوں
بُوٹی کے پیچھے مرتا ہوں(۶۶)

اسی طرح کوّے کی خصوصیات کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس کا رنگ رات سے بڑھ کر کالا ہے۔ چھوٹے بچوں کو کالے رنگ سے واقفیت دلانے کے لئے رات کی مثال بہت سادہ، عمدہ اور عام فہم ہے۔ جس سے وہ واقف بھی ہوتے ہیں۔ پھر کوّے کی آواز ''کائیں کائیں'' اور ''گوشت کی بوٹی'' جو اس کی پسندیدہ خوراک ہے، کا ذکر کیا گیا ہے۔ کوّے کا کلام سُننے کے بعد ناظم ِ مشاعرہ بطخ کو اپنا کلام سُنانے کی دعوت دیتا ہے اور اس کی خوب صورتی اور چال کی خاص طور پر تعریف کرتا ہے۔ اس لئے بطخ پہلے اپنی چال کا بھر پور مظاہرہ کرتی ہے اور پھر ''قیں قیں'' کرتے ہوئے اپنے اشعار سُناتی ہے۔

بطخ کے بعد مرغ کو جو دنیا میں اپنی سحر خیزی کی وجہ سے مشہور ہے، اپنا کلام سُنانے کی اجازت ملتی ہے، ناظم مشاعرہ اس کی تعریف بہت خوب صورت انداز میں یوں کرتا ہے:

''آپ کی سحر خیزی کی ایک دنیا داد دیتی ہے آپ انسانوں کی بستی میں ہماری سب سے اہم سفیر ہیں۔(۶۷)

''مرغ'' اپنا کلام سُنانے کے لئے اپنی کلغی کو ہلا کر سامعین کو غرور بھری نظروں سے دیکھتا ہے پھر اپنے اشعار سُناتا ہے:

میں اپنے پَروں کو کھولتا ہوں
اور ککڑوں ککڑوں بولتا ہوں
ہوں کلغی پر مغرور بہت
میں جگ میں ہوں مشہور بہت(۶۸)

یہاں راہیؔ نے مُرغ کی کلغی کو غرور کی علامت بنا کر موثر انداز سے نمایاں کیا ہے اور مرغ کی اس ادا اور انداز کو حقیقت کے قریب ہو کر دیکھا اور سمجھا ہے۔ اس کے بعد کبوتر کی باری آتی ہے اور اس کے خوب صورت پَروں اور اس میں چھپے دھنک رنگوں کی بات چھڑتی ہے۔ راہیؔ نے کبوتر کے پروں کی خوب صورتی اور اس پر پڑنے والی دھوپ سے مختلف رنگوں کے کِھل جانے کو بہت حسین اور دلکش پیرائے میں طوطے کی زبانی بیان کیا ہے۔ اس دوران اُلو جو بہت خاموشی سے کسی گہری سوچ میں غرق ہوتا ہے، اس کی باری آجاتی ہے وہ چونک کر اپنا کلام سُناتا ہے:

دانائی میں بے مثل ہوں میں
بینائی میں بے مثل ہوں میں

شاخوں پر گم سُم بیٹھا ہوں
مت پوچھو ! کیا کیا سوچتا ہوں(۶۹)

گوراہیؔ نے دانائی اور بینائی کے ہم قافیہ الفاظ کے استعمال سے اُلو کی دو خصوصیات کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔خصوصاً اس کے ہروقت سوچنے کی عادت کو بڑی خوب صورتی سے شعر کا حصہ بنایا ہے۔اس کے بعد چیل (ایک بلند پرواز اور گہری نگاہ رکھنے والا پرندہ) اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہے:

میں اونچی فضا میں اُڑتی ہوں
ننھی چڑیوں پر جھپٹتی ہوں
مرغی مجھ سے گھبراتی ہے
چوزوں کو پروں میں چھپاتی ہوں(۷۰)

ویسے تو چیل، چڑیا، مرغی اور اس کے چوزوں کو جھپٹ کر کھاتی ہے،لیکن یہاں راہیؔ نے اس مشاعرے میں ان سب پرندوں کو ایک برگد کے سائے تلے اکٹھا کیا ہے اور بہت پُر اثر طریقے سے دنیا کو امن و آشتی کا پیغام دیا ہے کہ جس طرح جنگل میں پرندے امن و آمان سے رہ سکتے ہیں،تو ہم انسان بحیثیت اشرف المخلوقات اور زمین پر اللہ کے نائب کے امن و آشتی اور پیار و محبت سے کیوں نہیں رہ سکتے؟

اس کے بعد طوطا مشاعرے کے صدر مور کو اپنا تازہ کلام سنانے کی دعوت دیتا ہے اور مور اپنے خوب صورت پروں کو پھیلا کر کہتا ہے:

رنگین سی ایک پتنگ ہوں میں
دیکھو کیسا خوش رنگ ہوں میں
جنگل میں ناچ دکھاتا ہوں
منگل جنگل میں مناتا ہوں(۷۱)

مور کی زبانی اس شعر میں راہیؔ نے ایک انوکھی تشبیہ استعمال کی ہے۔تشبیہ میں ہمیشہ کم مشہور چیز کو زیادہ مشہور چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے لیکن یہاں ’’رنگین سی پتنگ‘‘ کی تشبیہ میں مور کو اپنے سے کم تر چیز سے تشبیہ دی گئی ہے جو راہیؔ کے افتادِ طبع کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے۔

پرندوں کے اس مشاعرے کے ذریعے راہیؔ نے مختلف پرندوں کی خصوصیات ، عادات و خصائل ، انداز اور آوازوں کو منظوم کر کے پیش کیا ہے۔سادہ، سلیس اور عام فہم الفاظ ،تشبیہات ، کردار اور مانوس اشیاء کا ذکر کیا ہے۔جو بچے اپنے گرد و پیش کے ماحول میں ہر روز دیکھتے ہیں اُنہوں نے چھوٹی اور آسان بحروں میں ایسی رواں نظمیں لکھی ہیں جو سہل ممتنع کے علاوہ زود فہمی میں اپنی مثال آپ ہیں۔

راہیؔ نے اس مشاعرے کا مدعا طوطے کی زبانی بیان کر کے نہ صرف بچوں بلکہ بڑوں کو بھی اپنا یہ پیغام دیا ہے کہ دنیا بہت حسین اور خوب صورت ہے، اسے اور بھی زیادہ حسین ودلکش بناؤ۔ اس دنیا میں امن وامان، چین اور آشتی سے رہنے کا ڈھنگ سیکھو، اسی میں سب کی بھلائی کا عنصر پوشیدہ ہے۔ اس کے علاوہ پرندوں کی صفات اور صلاحیتوں سے بھی سبق ورہنمائی حاصل کرنے کا درس دیا ہے اور کہا ہے کہ دنیا کو مور کی طرح خوب صورت ودیدہ زیب بناؤ۔ چیل کی طرح بلند پروازی سے کام لو اور اپنی سوچ وفکر کو بلند رکھو۔ اپنے ماحول کو کبوتر کے حسین پروں کی طرح رنگوں سے بھر کر سنوارو۔ بطخ کی طرح ہر جگہ پانی اور خشکی میں اپنا حسن بکھیرو اور ہر قسم کے حالات میں زندگی گزارنے کا ہنر سیکھو۔ دنیا کے معاملات میں جلد بازی دکھانے کی بجائے اُلو کی طرح سوچ وبچار سے کام لو۔ صبح جلد بیدار ہونے والے لوگوں کو چڑیا کی طرح سُریلا اور میٹھا گیت سُنا کر خوشیوں کا پیغام دو اور سوئے ہوئے لوگوں کو مرغ کی طرح خواب غفلت سے بیدار کرو۔ نادانی سے بچو اور کوّے سے ہوشیاری اور دانائی کا سبق لو، دنیا جو آزمائشوں اور دکھوں کی آماجگاہ ہے، اس میں مور کی طرح اپنے لئے خود خوشیوں کا سامان پیدا کرو، جنگل میں منگل مناؤ اور دکھوں کے خلاف جہاد کرو۔

آخر میں راہیؔ نے بچوں کو دنیا میں اپنا نام ومقام بنانے کا گُر بھی بتایا ہے:

> ''نام کمانا چاہتے ہو، تو اس کے لئے کچھ کام کرنا ہوگا اور کام یہ ہے کہ جو ہنر قدرت کی جانب سے تمھیں عطا ہوا ہے، اُسے بھرپور طور پر کام میں لاؤ، کہ تمہاری پہچان تمہارے ہنر میں پوشیدہ ہے۔ یہ دنیا حسین ہے، اسے حسین تر بناؤ۔ (۷۲)

اس کے بعد راہیؔ زیرِ نظر کتاب میں پرندوں کے مشاعرے کے بعد خشکی کے جانوروں کا مشاعرہ منعقد کرواتے ہیں۔

۲۔ خشکی کے جانوروں کا مشاعرہ:

جب پرندوں کا مشاعرہ خوب صورت اور دل پذیر انداز میں اپنے اختتام کو پہنچا، تو اس کی دھوم اور شہرت جنگل میں پھیل گئی۔ نتیجتاً خشکی کے جانوروں نے بھی اپنا مشاعرہ منعقد کرنے کی ٹھانی۔ اس مقصد کے لئے ایک چراگاہ کا انتخاب کیا گیا، جس میں جنگل سے ببر شیر، چیتا، بندر، گلہری، زرافہ، اور خرگوش نے شرکت کی۔ شہر سے بھینس، گھوڑے اور گدھے کو بُلایا گیا۔ کیونکہ عموماً یہ جانور انسانی آبادی میں ہی پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مشاعرے کو رونق اور وسعت دینے کے لئے چولستان کی صحرا سے ایک اونٹ کو بھی مدعو کیا گیا اور یوں یہ ایک اچھا خاصا مشاعرہ بن گیا۔ ناظمِ مشاعرہ کُتے کو بنایا گیا کیونکہ مشاعرے کے انعقاد کا سہرا کُتے کے سر ہی تھا۔ اس نے بڑی دوڑ دھوپ کر کے شہر، جنگل اور صحرا سے مختلف جانوروں کو بُلایا تھا۔ ناظم مشاعرہ ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلے کُتا اپنا تعارف کلام کی صورت میں پیش کرتا ہے، لیکن اس سے پہلے وہ اپنی ذات کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے کہ ایک جانور ہونے کے باوجود میری وفاداری انسانوں سے زیادہ ہے۔ میں نے انسان میں اپنی خوبیاں پیدا کر کے اسے انسان بنانے میں بڑی مدد دی ہے ورنہ وہ اور بھی زیادہ وحشی صفت، بے وفا، شر پسند

اور زمین پر فساد پھیلانے والا ہوتا۔

ایک طرح سے راہیؔ نے کُتے کی زبانی اس کی وفاداری اور خصوصیات کو موثر انداز میں بیان کر کے مشاعرے کو دلچسپ بنایا ہے کیونکہ جانوروں میں کُتا ہی وہ واحد جانور ہے جو بے شمار صفات سے متصف ہے۔اس بارے میں راہیؔ کتاب کے افتتاحیہ میں لکھتے ہیں:

> ''خواجہ حسن بصری کے مطابق صوفیا کی اکیس صفات ایسی ہیں جو کُتے میں بھی پائی جاتی ہیں۔مثلاً وہ رات رات بھر جاگتا ہے۔صابر ہے، محبت شعار ہے، یہ تمام خصوصیات ایک عام انسان میں پیدا ہو جائیں تو وہ ولی بن جائے۔یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کے ہاں کُتے کا ایک خاص مقام ہے''۔(۷۳)

چنانچہ کُتا' ناظمِ مشاعرہ کی حیثیت سے ان اشعار کے ذریعے مشاعرے کا آغاز کرتا ہے:

انسانوں سے یاری میری
مشہور وفاداری میری
یوں تو ہر شے کھا لیتا ہوں
پر ہڈی پر جان دیتا ہوں(۷۴)

اس نظم میں کُتے کی انسانوں سے دوستی، اس کی وفاداری اور اس کی پسندیدہ خوراک ''ہڈی'' کا آسان لفظوں میں ذکر کیا گیا ہے۔

اس مشاعرے میں گدھے کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا گیا، جو کہ ایک عاجز مخلوق ہے، اس کی یہ خصوصیت کچھ انسانوں میں بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔گدھا عاجزی، ملنساری اور محنت کا ایک چلتا پھرتا استعارہ معلوم ہوتا ہے، اپنا کلام سنانے کے لئے وہ ''ڈھینچوں ڈھینچوں'' کی بھرپور موسیقی کے ساتھ اپنا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے:

مجھ سے نہ کہو بدرنگ ہوں میں
عاجز سا ایک ملنگ ہوں میں(۷۵)

اس پر خیبر پختونخوا سے آئی ہوئی بکری کہتی ہے کہ ملنگی بہ منے (یعنی ملنگی اور عاجزی سے انکار نہیں کیا جاسکتا)۔اس کے بعد گدھا دوسرا اور آخری شعر بیان کرتا ہے:

میں دن بھر بوجھ اٹھاتا ہوں
اور ڈھینچوں ڈھینچوں گاتا ہوں (۷۶)

اس شعر میں بھی راہیؔ نے گدھے کی آواز ''ڈھینچوں ڈھینچوں'' (اسم صوت)، اس کی بُری صورت (اسم صفت) اور عاجزی کی صفت کو بیان کیا ہے۔بکری کے یہ الفاظ ''ملنگی بہ منے'' پشتو زبان کے الفاظ ہیں، جسے راہیؔ نے برمحل استعمال کر کے نہ صرف مشاعرے میں مزاحیہ رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ بچوں کو پشتو زبان سے بھی متعارف کرایا

ہے۔اس کے بعد راہیؔ مشاعرے میں بھینس کا تعارف کرتا ہے اور بھینس دائیں بائیں اپنی گردن گھما کر اپنا کلام سناتی ہے۔

عام طور پر جانور ہنسنے کے عمل سے محروم ہیں، یعنی وہ انسانوں کی طرح نہیں ہنس سکتے۔لیکن جانوروں میں ایک جانور ایسا ہے جسے اس انسانی خصوصیت سے نوازا گیا ہے، وہ نہ صرف خود ہنستا ہے بلکہ اپنی حرکات وسکنات سے اوروں کو بھی ہنساتا ہے۔اگر دیکھا جائے تو وہ جانور بندر ہے۔مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے بندر اپنے مخصوص انداز میں اُچھل کود کرتا ہے اور سامعین کرام سے زرافہ کی گردن سے لپٹ کر اپنا کلام سنانے کی اجازت طلب کرتا ہے، جس پر سب ہنس کر اُسے اجازت دیتے۔چنانچہ بندر عرض کرتا ہے:

میں پیڑوں پر چڑھ جاتا ہوں
اور کیا کیا کھیل دکھاتا ہوں

میں اُلٹی چھلانگ لگاتا ہوں
اور روتوں کو بھی ہنساتا ہوں

میں اپنا سر کھجلاتا ہوں
اور جوئیں نکال کے کھاتا ہوں(۷۷)

کلام سنانے کے بعد بندر کا زرافے کی گردن سے اترنے کے منظر کو راہیؔ نہایت خوب صورت الفاظ کا جامہ پہنا کر بہترین منظر نگاری کرتے ہیں:

''شعر پڑھنے کے بعد بندر زرافہ کی گردن پر سلائڈنگ کر کے نیچے گھاس پر اُترا۔دو چار قلا بازیاں لگائیں، پھر اپنا سر کھجلایا اور دو چار جوئیں نکال کر انہیں مزے لے لے کر یوں کھانے لگا جیسے بچے آئس کریم کھاتے ہیں۔''(۷۸)

بندر کے بعد گھوڑا بھی ہنہنا ہنہنا کر اپنے اشعار پڑھتا ہے:

طاقت میں سب سے بڑھ کر ہوں
قوت میں سب سے بڑھ کر ہوں

چستی سے مجھ کو محبت ہے
سستی سے مجھ کو نفرت ہے(۷۹)

اس شعر میں گھوڑے کی خصوصیات کے علاوہ صنعت تضاد کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔''سستی اور چستی'' کے الفاظ

ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔

گھوڑے کے بعد اونٹ (ایک صحرائی جانور ہے اور انسان کی سواری کے فرائض بھی سر انجام دیتا ہے) مشاعرے میں تعارف کرانے کے بعد اپنا کلام سناتا ہے، جس پر سامعین محفل واہ واہ کر کے داد دیتے ہیں۔ مشاعرے کے آخر میں صدر مشاعرہ ببر شیر (جنگل کا بادشاہ) گرج دار آواز میں اپنا کلام یوں سناتا ہے:

گو دیکھو تو بے تاج ہوں میں
جنگل پر کرتا راج ہوں میں
جب دھاڑوں تو سب ڈر جائیں
کچھ نازک دل تو مر جائیں (۸۰)

اسی طرح دیگر شعرائے کرام (جانور) مثلاً بلی، چیتا، خرگوش، زرافہ اور گلہری بھی باری باری اپنا کلام سنا کر مشاعرے کو رونق بخشتے ہیں۔ آخر میں ناظم مشاعرہ کے ذریعے راہیؔ اس مشاعرے کے منعقد کرنے کا اصل مقصد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''آج ہم سب ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں اور ہمارے اس فعل نے ہمیں جو طاقت عطا کی ہے، اس کا اندازہ صرف ہمیں ایک ساتھ دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ (۸۱)

شجاعت علی راہیؔ ایک منجھے ہوئے اور دور اندیش شاعر و ادیب ہیں۔ اُنہوں نے ایک طرف اس مشاعرے میں ان تمام جانوروں کی خصوصیات، حرکات و سکنات، صلاحیتوں، اور بولیوں کا ذکر اس خوبی سے کیا ہے کہ بچوں کی دلچسپی اور معلومات میں مثبت اضافہ ہوتا ہے اور دوسری طرف اُن جانوروں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے، ان کی منظم، متحد اور باسلیقہ زندگی کو مثال بنا کر پیش کرنے سے یہ درس بھی ملتا ہے کہ ہمیشہ متحد ہو کر اتفاق کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہئے۔

۳۔ پانی کے جانوروں کا مشاعرہ:

تیسرا مشاعرہ راہیؔ نے آبی جانوروں یعنی پانی کے جانوروں کے مابین کروایا ہے۔ خشکی کے جانوروں کے مشاعرے کی خبر مینڈک کے ذریعے آبی جانوروں تک پہنچتی ہے، کیونکہ جس وقت خشکی کے جانوروں کا مشاعرہ بپا ہوتا ہے، مینڈک قریب ہی گھاس میں چھپا، سب کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وہ یہ خبر لے کر دریا میں مگر مچھ کے پاس جاتا ہے۔ جسے سن کر مگر مچھ کہتا ہے کہ کیوں نہ ہم بھی ایک مختصر سا مشاعرہ منعقد کروائیں۔ چنانچہ کچھوا، مچھلی، مگر مچھ وغیرہ مل کر ایک تالاب میں مشاعرے کی محفل سجاتے ہیں۔ ناظم مجلس مینڈک، مشاعرے کا آغاز اپنے خوب صورت کلام سے یوں کرتا ہے:

آنکھیں میری موٹی موٹی
ٹانگیں میری چھوٹی چھوٹی
میں ٹر ٹر ٹر ٹر گاتا ہوں
اور کان ہر اک کے کھاتا ہوں
ہر وقت نہاتا رہتا ہوں
میں کتنا صاف اور ستھرا ہوں(۸۲)

اس شعر میں راہیؔ نے ''صنعت تضاد''، ''موٹی اور چھوٹی'' کے الفاظ کو نہایت مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ساتھ میں مینڈک کی ٹرانے کی آواز یعنی ''ٹر ٹر ٹر ٹر'' کو بھی نقل کر کے اسم صوت کا برمحل استعمال کیا ہے۔ مینڈک کے بعد مچھلی کی باری آتی ہے، جو انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی بہت فائدہ مند مخلوق ہے اور زمانہ قدیم سے اس کی خوراک کا ایک اہم ذریعہ رہی ہے:

میں نرم روی سے بہتی ہوں
ہر دم پانی میں رہتی ہوں
پانی سے اپنی غذا پاؤں
پانی نہ ملے تو مر جاؤں(۸۳)

مچھلی کے بعد کچھوا اپنا تازہ کلام سنا کر سامعین کی داد وصول کرتا ہے اور اس کے بعد آخر میں مگرمچھ حاضرین محفل کو ان الفاظ میں اپنا کلام سنا کر خوش کرتا ہے:

پانی میں لیٹا رہتا ہوں
شہتیروں جیسا بہتا ہوں
میں جب بھی موقع پاتا ہوں
انسانوں کو کھا جاتا ہوں
چھوٹا ہے یا وہ موٹا ہے
میرا تو ایک ہی لقمہ ہے۔(۸۴)

مندرجہ بالا اشعار میں راہیؔ نے ان آبی جانوروں کی جملہ خصوصیات کے علاوہ چند تشبیہات بھی استعمال کی ہیں۔ مثلاً ''شہتیروں جیسا پانی میں بہنا'' اور ''پیٹھ کا پتھر اور زرہ بکتر کی طرح سخت ہونا''۔ جبکہ ''کی طرح'' اور ''جیسا'' حروفِ تشبیہ ہیں۔ اس مشاعرے کے ذریعے راہیؔ نے ناظمِ مشاعرہ مینڈک کی زبانی پانی کے اندر کی خوب صورت دنیا کی ایک جھلک دکھائی ہے کہ سمندر کی تہہ میں اللہ تعالیٰ نے کیا کیا خزینے چھپا رکھے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے انسان کے لئے نہ صرف جنگل، صحرا، میدان اور پہاڑ پیدا کیے ہیں۔ بلکہ زیرِ آب سمندروں اور دریاؤں میں بھی انسان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگلوں، صحراؤں، میدانوں اور پہاڑوں کا اپنا ایک حسن، اپنی دل کشی ہے۔
لیکن جنھوں نے سمندروں کے اندر جھانک کر دیکھا ہے۔ صرف وہی جانتے ہیں کہ پانی کے اندر کی دنیا
کتنی ہوشربا ہے اور دل فریب ہے۔ اس حقیقت سے صرف غواص ہی آشنا ہیں کہ سمندر کی تہوں میں کیا
کیا خزینے چھپے پڑے ہیں۔" (۸۵)

مشاعرے کے آخر میں راہیؔ نے سورۃ الرحمن کی اس آیت کا ترجمہ: (پس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) کا ذکر اس غرض سے کیا ہے کہ ہم سب کو اللہ تعالیٰ کی لازوال نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

۴۔ حشرات الارض اور رینگنے والے جانوروں کا مشترکہ مشاعرہ:

زیر نظر کتاب "مشاعرے" کا چوتھا اور آخری مشاعرہ حشرات الارض اور رینگنے والے جانوروں کا مشترکہ مشاعرہ ہے۔ اس مشاعرے کے ذریعے راہیؔ نے بچوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ دنیا میں محنت، محبت، ذمہ داری اور حسن وخیر کی خوبیاں پھیلاؤ۔ علاوہ ازیں یہ بھی بتایا ہے کہ ہر صلاحیت جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت کی ہے یا جانوروں اور حشرات الارض کو عطا کی ہے، اپنی جگہ اہم ہے۔ اپنے اس پیغام کو انہوں نے حشرات الارض اور رینگنے والے جانوروں کے ذریعے پہنچایا ہے اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کیا ہے

جب پرندوں اور جانوروں کے مشاعرے کی خبر رینگنے والے جانوروں تک پہنچتی ہے، تو وہ بھی یکجا ہو کر ایک مشاعرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں، یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہم بھی باذوق ہیں اور کسی سے کم نہیں۔ چنانچہ مشاعرے کے لئے سانپ کے مشورے سے جنگل کے ایک ایسے خطے کو منتخب کیا جاتا ہے جو پھولوں اور پھلوں سے لدا ہوتا ہے۔

ناظم مشاعرہ کے فرائض تتلی کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ شہد کی مکھی مہمان خصوصی بنتی ہے اور صدرِ مشاعرہ چیونٹی کو بنایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ناظم مشاعرہ تتلی اپنا کلام پیش کرتی ہے:

میں پھولوں کی شہزادی ہوں
میں باغوں کی آبادی ہوں
میرا جلوہ گلشن گلشن
میں جس میں نہیں وہ کیسا چمن (۸۶)

اس مشاعرے میں شہد کی مکھی بھی اپنا کلام سناتی ہے جو اس کے کام اور خصوصیات کی نمائندگی کرتا ہے۔ شہد کی مکھی ایک مفید مکھی ہے جو ہمارے لئے لاکھوں پھولوں کا رس لا کر شہد بناتی ہے، جسے نہ صرف ہم غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں بلکہ ہماری بہت سی بیماریوں میں یہ بطور دوا بھی استعمال ہوتی ہے:

میں پھولوں کا رس لاتی ہوں

اور وہ مشروب بناتی ہوں
جو سب سے اچھی غذا بھی ہے
اور سب سے اچھی دوا بھی ہے(۸۷)

اس شعر میں ''غذا'' اور ''دوا'' ہم قافیہ الفاظ ہیں، جسے خوب صورتی سے شعر میں برتا گیا ہے۔ شہد کی مکھی کے بعد ریشم کا کیڑا خوب صورت اور معنی خیز الفاظ میں اپنا کلام اس طرح پیش کرتا ہے:

میں سبز ہوں ، سبز میرا بستر
پتوں پہ بناتا ہوں میں گھر
میں تُوت کے پتے کھاتا ہوں
اور ریشم میں چھپ جاتا ہوں(۸۸)

ریشم کے کیڑے کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ اپنے لعابِ دہن سے ریشم بناتا ہے، جو انسانوں کے آرام وراحت کا باعث ہے۔ حشرات الارض میں مشہور ''شہد کی مکھی'' اور ''چیونٹی'' کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی کیا ہے۔ چیونٹی بظاہر ایک معمولی سا کیڑا ہے لیکن بہت محنتی ہوتی ہے۔ ہمیشہ اپنے سے زیادہ وزن اُٹھاتی ہے۔ یہ تعداد میں دنیا کی سب بڑی مخلوق ہے۔ مشاعرے میں ناظم مشاعرہ ان الفاظ میں چیونٹی کی تعریف کرتے ہوئے گویا ہوتی ہے:

''دس کروڑ برس سے بھی زائد مدت سے زمین پر رینگنے والی ہماری سب سے زیادہ محنتی نمائندہ چیونٹی ہے۔ اس دل رُبا مخلوق کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ تعداد میں اس دنیا کی سب سے بڑی مخلوق ہے۔ یعنی دس پدم ہے اور دس پدم لکھنے کے لئے ایک کے ہندسے کے ساتھ سولہ صفر بڑھانا پڑتے ہیں۔ یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ اگر ہم سب مل کر زندگی بھر گنتے چلے جائیں تو پُورا گن نہ پائیں''(۸۹)

شجاعت علی راہیؔ نے چیونٹیوں سے متعلق بچوں کے لئے ایک ناولٹ بھی تحریر کیا ہے۔ جس کا نام ''باغی چیونٹیاں'' ہے۔ یہ انسانوں کے خلاف چیونٹیوں کی ایک دلفریب داستانِ بغاوت ہے جس میں راہیؔ نے اس ادنیٰ سی مخلوق کے کچھ اور ہوش رُبا کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ چیونٹی، روئے زمین پر اللہ کی تخلیق کردہ ایک محنتی مخلوق ہے۔ لیکن اس کی محنت کو آج تک صرف پیٹ بھرنے تک ہی محدود رکھا گیا ہے۔ اس حقیقت کے بارے میں راہیؔ اس طرح رقم طراز ہیں:

''یہ وہ مخلوق ہے جو لاکھوں، کروڑوں برسوں سے محنت کی ایک زندہ علامت بنا ہوا ہے لیکن بدقسمتی سے آج تک اس کی محنت صرف اس کا پیٹ بھرنے تک ہی محدود رہی ہے۔(۹۰)

چیونٹی بڑی عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتی ہے:

میں دبلی سی ایک چیونٹی ہوں
میں پتلی سی اک چیونٹی ہوں

محنت مزدوری کرتی ہوں
محنت میں پوری کرتی ہوں(۹۱)

اس مشاعرے میں جہاں ایک طرف خوب صورت اور فائدہ مند حشرات اور کیڑے مکوڑوں نے حصہ لیا ہے تو دوسری طرف چند نقصان دہ اور زہریلے کیڑے مکوڑوں نے بھی حصہ لیا ہے جیسے، مچھر، مکھی، سانپ اور بچھو وغیرہ۔ مشاعرے میں ان کی شرکت سے راہیؔ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ دنیا میں جہاں روشنی ہے، وہاں تاریکی بھی ہے۔ جہاں سکھ ہیں، وہاں دکھ بھی ہیں۔ اسی طرح جہاں شہد کی مکھی ہے وہاں بچھو بھی ہے لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ اہم اور منفرد ہیں۔

مچھر جو بظاہر ایک بے فائدہ اور حقیر سا حشرہ دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے خدائی کا دعویٰ کرنے والے نمرود کے غرور کو توڑا۔ یہاں راہیؔ نے مچھر کا ذکر کر کے مشہور تاریخی قصے پر بڑے دل کش انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مچھر اپنا تعارفی کلام بھیں بھیں کرتے ہوئے اہلِ محفل کو بڑے سُر سے سناتا ہے:

میں گانے گاتا رہتا ہوں
لوگوں کو ستاتا رہتا ہوں
انسانوں کا خوں پیتا ہوں
انسانی خوں پر جیتا ہوں
سب دنیا مجھ سے ڈرتی ہے
ڈرتی ہے مجھ سے نفرت کرتی ہے(۹۲)

اسی طرح راہیؔ نے مکھی کا گندی چیزوں پر بیٹھنے اور ہیضہ پھیلانے، بچھو کے ڈنک مار کر ڈسنے اور زہریلے ہونے کے باوجود سانپ کے خوش رنگ ہونے کی خصوصیت کا ذکر کر کے ان کے متعلق ذومعنی اشعار باندھے ہیں جو مصرعہ سازی میں الفاظ کی نشست و برخاست کے ساتھ زبان کی درستی کی بہترین مثالیں ہیں۔ المختصر زیرِ نظر کتاب ''مشاعرے'' کے ذریعے راہیؔ نے دنیا میں اچھائی، حسن اور خیر کی قدریں عام کرنے کا پیغام دیا ہے اور ساتھ میں بچوں کو یہ بتانے کی بھی کوشش کی ہے کہ ہر صلاحیت اپنی جگہ اہم ہے۔ چاہے وہ مکڑی کا جالا بُننا ہو، یا ریشم کے کیڑے کا ریشم بنانا' چیونٹی کا دانا اکٹھا کرنے کی محنت و صلاحیت ہو، یا شہد کی مکھی کا لاکھوں پھولوں سے رس چوس کر شہد بنانے کا ہُنر ہو۔ علاوہ ازیں راہیؔ نے بچوں کو یہ نصیحت بھی کی ہے کہ دنیا بہت حسین ہے، اسے اور بھی حسین تر بناؤ۔ ہمیشہ اس میں امن، چین اور آشتی سے رہنے کا ڈھنگ سیکھو اور ہر حال میں اس پروردگار کا شکر ادا کرو، جس نے نہ صرف خشکی و تری میں تمہارے لئے خوب صورتی کا سامان پیدا کیا ہے بلکہ تمہاری ضرورتیں پوری کرنے کے لئے تمہیں ہر قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے۔

فبای الاءِ ربکما تُکذ بٰن ہ

ترجمہ: ''پس تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

حوالہ جات

۱۔ احمد پراچہ: کوہاٹ کا ذہنی ارتقاء: ضیاء آرٹ پریس، پشاور ۱۹۸۴ء، ص ۱۷۴

۲۔ شجاعت علی راہیؔ: نزم شگوفے: طفیل آرٹ پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۳۸

۳۔ ایضاً ص ۱۹

۴۔ ایضاً ص ۲۲

۵۔ ایضاً ص ۷۔۸

۶۔ سراج احمد تنولی: روزنامہ ''سرگرم'' ایبٹ آباد، ۲۶ اکتوبر ۲۰۱۸ء، ص ۴

۷۔ شجاعت علی راہیؔ: نزم شگوفے: ص ۲۸

۸۔ ایضاً ص ۵

۹۔ احمد پراچہ: کوہاٹ کا ذہنی ارتقاء: ص ۱۷۴

۱۰۔ شجاعت علی راہیؔ: نزم شگوفے: ص ۳۸

۱۱۔ ایضاً ص ۳۸۔۳۹

۱۲۔ ایضاً ص ۱۲۔ ۱۳

۱۳۔ حرف اوّل از کاظم رشید کاظم: مشمولہ: الف سے اتی: کے اینڈ ایچ پبلی کیشنز' اسلام آباد ۲۰۱۲ء، ص ۳۔ ۴

۱۴۔ شجاعت علی راہیؔ: الف سے اتی: ص ۵

۱۵۔ ایضاً ص ۷۔۹

۱۶۔ ایضاً ص ۱۳

۱۷۔ ایضاً ص ۲۰۔۲۲

۱۸۔ منور رؤف: پروفیسر: پرندوں کا شاعر: مشمولہ: مجلہ ''نایاب'' شجاعت علی راہیؔ نمبر، جنوری ۱۹۸۷ء، ص ۸۶۔۸۷

۱۹۔ شجاعت علی راہیؔ: الف سے اتی: ص ۲۷۔۳۰۔۳۲۔۳۶

۲۰۔ ایضاً ص ۴۲۔ ۴۴

۲۱۔ ایضاً ص ۶۶۔۷۰

۲۲۔ ایضاً ص ۷۷۔۷۸

۲۳۔ نوشین وودود: اردو میں بچوں کے ادب کا ارتقاء اور صوبہ سرحد: شعبہ اردو، جامعۂ پشاور، ۲۰۰۹ء، ص ٦٧

۲۴۔ احمد پراچہ: کوہاٹ کا ذہنی ارتقاء: ص ۱۷۴

۲۵۔ رفیع الدین ہاشمی: اصنافِ ادب: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۸ء، ص ۸۴۔۸۵

۲۶۔ پیش لفظ از منور علی شاہ بنوری: پروفیسر: مشمولہ: ذرا سوچو تو: کے اینڈ ایچ پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۹

۲۷۔ شجاعت علی راہیؔ: ذرا سوچو تو: ص ۱۲

۲۸۔ ایضاً ص ۱۶

۲۹۔ ایضاً ص ۱۷

۳۰۔ ایضاً ص ۱۹

۳۱۔ ایضاً ص ۲۰

۳۲۔ ایضاً ص ۲۲

۳۳۔ ایضاً ص ۲۸

۳۴۔ ایضاً ص ۴۶

۳۵۔ ایضاً ص ۲۹

۳۶۔ ایضاً ص ۵۸

۳۷۔ شجاعت علی راہیؔ: پھول کھلے یا نہ کھلے: ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۲۳

۳۸۔ شجاعت علی راہیؔ: ذرا سوچو تو: ص ۵۱

۳۹۔ ایضاً ص ۲۷

۴۰۔ ایضاً ص ۵۲

۴۱۔ احمد پراچہ: راہیؔ سے انٹرویو: مشمولہ، مجلہ ''نایاب''، ص ۴۶

۴۲۔ شجاعت علی راہیؔ: ذرا سوچو تو ص ۵۵

۴۳۔ نسیم سحر: راہیؔ سے گفتگو: مشمولہ: سہ ماہی، ''ابلاغ'' اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص ۲۹

۴۴۔ شجاعت علی راہیؔ: ذرا سوچو تو: ص ۳۷

۴۵۔ محمد اقبال: علامہ: ضربِ کلیم: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۶ء، لاہور، ص ۳۸

۴۶۔ شجاعت علی راہیؔ: ذرا سوچو تو: ص ۲۶

۴۷۔ ایضاً ص ۶۰

۴۸۔ ایضاً ص ۵۷

۴۹۔ ایضاً ص ۶۲

۵۰۔ طاہر یوسف ہاشمی: شاہ صاحب اور ان کا فن: مشمولہ مجلہ ''نایاب'' ص ۱۲۱

۵۱۔ شجاعت علی راہیؔ: مطلب بے مطلب: کے اینڈ ایچ پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۴۹

۵۲۔ ایضاً ص ۵۷

۵۳۔ ایضاً ص ۳۳

۵۴۔ ایضاً ص ۷

۵۵۔ ایضاً ص ۲۱

۵۶۔ ایضاً ص ۲۳

۵۷۔ ایضاً ص ۲۵

۵۸۔ ایضاً ص ۶۳

۵۹۔ ایضاً ص ۴۷

۶۰۔ ایضاً ص ۱

۶۱۔ حرف اوّل از محمد اکرام اللہ خان : ڈاکٹر :مشمولہ : مشاعرے : کے اینڈ ایچ پبلی کیشنز ، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۴۔۵

۶۲۔ شجاعت علی راہیؔ: مشاعرے: ص ۲۴۔۲۵

۶۳۔ ایضاً ص ۳۱۔۳۲

۶۴۔ ایضاً ص ۳۲

۶۵۔ ایضاً ص ۳۴

۶۶۔ ایضاً ص ۳۶

۶۷۔ ایضاً ص ۳۸

۶۸۔ ایضاً ص ۴۰

۶۹۔ ایضاً ص ۴۳

۷۰۔ ایضاً ص ۴۵

۷۱۔ ایضاً ص ۴۷

۷۲۔ ایضاً ص ۴۹۔۵۰

۷۳۔ ایضاً ص ۱۹۔۲۰

۷۴۔ ایضاً ص ۵۴۔۵۶

۷۵۔ ایضاً ص ۶۱

۷۶۔ ایضاً ص ۶۱

۷۷۔ ایضاً ص ۶۸

۷۸۔ ایضاً ص ۶۸۔۷۰

۷۹۔ ایضاً ص ۷۰

۸۰۔ ایضاً ص ۷۷۔۷۹

۸۱۔ ایضاً ص ۸۰۔۸۱

۸۲۔ ایضاً ص ۸۴۔۸۶

۸۳۔ ایضاً ص ۸۶

۸۴۔ ایضاً ۸۹۔۹۱

۸۵۔ ایضاً ص ۹۱

۸۶۔ ایضاً ص ۹۶

۸۷۔ ایضاً ص ۱۰۵

۸۸۔ ایضاً ص ۱۰۰

۸۹۔ ایضاً ص ۱۰۶

۹۰۔ شجاعت علی راہیؔ: باغی چیونٹیاں: کے اینڈ ایچ پبلی کیشنز، اسلام آباد ۲۰۱۲ء، ص ۳

۹۱۔ شجاعت علی راہیؔ: مشاعرے، ص ۱۰۷

۹۲۔ ایضاً ص ۹۹

باب چہارم

شجاعت علی راہیؔ کے بچوں کے لئے ناولٹ:

فکری وفنی جائزہ

شجاعت علی راہیؔ کے بچوں کے لئے ناولٹ: فکری وفنی جائزہ

شجاعت علی راہیؔ نے بچوں کے لئے شعری ادب کے ساتھ ساتھ نثری ادب بھی تخلیق کیا ہے۔نثری ادب میں انھوں نے بچوں کے لئے ناولٹ ،مختصر کہانیاں اور ڈرامے لکھے ہیں جو بچوں کے ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ اگرچہ راہیؔ نے یہ تخلیقات خاص طور پر بچوں کے لئے کی ہیں،لیکن بچوں کے ساتھ ساتھ ان میں بڑوں کے لئے بھی دلچسپی کا سامان اور نصیحت آموز باتیں ہیں۔بچوں کے لئے انھوں نے کل ۱۲(بارہ) ناولٹ لکھی ہیں۔جن میں ''باغی چیونٹیاں''، ''تتلیوں کا میلہ''،''ڈائنا سور کیوں غائب ہو گئے؟''،''بلی کی آپ بیتی''،''کبوتر''،''بولتے برگد''،''سرخ سیارہ''،''ماں''،''قہقہہ''،''حیرت انگیز''،''عظیم لوگوں کے عظیم خواب''اور''بچے(ڈوریمان، جاپان، اور پاکستان)''شامل ہیں۔ان میں پہلے سات ناولٹ باقاعدہ طور پر چھپ چکے ہیں، جبکہ باقی پانچ ناولٹ زیر طباعت ہیں۔یہاں اُن کے صرف شائع شدہ ناولٹوں کا جائزہ لیا جائے گا۔

ذیل میں ان کے ناولٹوں کا فکری وفنی جائزہ لیا جائے گا۔لیکن اس سے پہلے ہم اس بات کا مختصر جائزہ لیں گے کہ ناولٹ کیا ہے؟ ناول اور ناولٹ میں کیا فرق ہے؟؟؟

ناولٹ کا مفہوم:

"Novelette" انگریزی لفظ Novel سے مشتق ہے اور Novel کا لفظ انگریزی میں اطالوی زبان کے لفظ "Novella" سے اخذ کیا گیا ہے۔ناولا کے معنی ہے نیا، انوکھا اور نرالا۔اس طرح لغت کے اعتبار سے ناول کے معانی ''نادر اور نئی بات'' کے ہیں۔رفیع الدین ہاشمی کے مطابق:

> ناول وہ قصہ یا کہانی ہے جس کا موضوع انسانی زندگی ہو اور ناول نگار زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مکمل اور گہرا مشاہدہ کرنے کے بعد ایک خاص سلیقے اور ترتیب کے ساتھ اپنے تجربات اور مشاہدات کو کہانی کی شکل میں پیش کر دے''۔(۱)

ناولٹ، ناول کی تصغیر ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کہانی طویل ہو تو ناول اور مختصر ہو تو اسے ناولٹ قرار دیا جائے۔

ناولٹ فکشن کی ہی ایک شکل ہے اور جدید دور کی پیداوار ہے، جس کا فروغ نشاۃ الثانیہ سے پہلے مغرب میں ایک مخصوص رجحان و میلان کے تحت ناولٹ، ناولہ اور ناویلے کی شکل میں ہوا، مگر ناول کی مقبولیت کے بعد ان اصناف کا زوال شروع ہونے لگا۔مغربی ادب میں عام طور پر اسے علیحدہ صنف ادب کا درجہ نہیں دیا گیا بلکہ چھوٹے ناولوں کے لئے اصطلاحاً یہ لفظ رائج ہوا۔ناقدین فن کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ناول اور طویل کہانی کے درمیان جو فکشن تخلیق کیا جاتا ہے، اسے ناولٹ کہتے ہیں۔

ناولٹ کی تعریف:

The Oxford Advanced Learner's Dictionary

میں "Novelette" کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"A Short Novel, especially a romantic novel, that is considering to be badly written."

''یعنی ناولٹ وہ مختصر ناول ہے جو روحانی جذبات کا اظہار یہ ہو اور جس میں تحریری جھول رہ گیا ہو۔''

Merriam Webster's Encyclopedia of Literature

نے "Novelette" کی تعریف کچھ یوں ہے:

"A wrok of fiction intermediate in lenght or complexity between a short stroy and a novel." (2)

یعنی یہ ایسی تخلیق ہے جو درمیانی طوالت کی ہوتی ہے۔ اس کے پلاٹ میں پیچیدگی کم ہوتی ہے اور یہ افسانہ اور ناول کے درمیان کی کوئی چیز ہے۔ سید وضاحت حسین رضوی ناولٹ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''ناولٹ زندگی یا سماج کے کسی اہم مسئلہ اور اس کے خاص پہلوؤں کا مختصراً جائزہ لیتا ہے۔ جس کی اپنی الگ تنظیم ہوتی ہے جو ناول سے قدرے مختصر مگر طویل افسانے سے زیادہ طویل اور تفصیلی ہوتا ہے''۔ (۳)

انسان کی پوری زندگی ناولٹ کا موضوع نہیں بنتی بلکہ اس میں زندگی کے کچھ خاص پہلوؤں پر ہی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی ضخامت اور طوالت کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ بالعموم ایک ناولٹ کی ضخامت سو سوا سو صفحات سے زیادہ اور پچاس ساٹھ صفحات سے کم نہیں ہوتی۔

ہیئت، موضوع اور اسلوب و مزاج کے اعتبار سے اگرچہ ناول اور ناولٹ میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے اور تخلیقی سطح پر بھی دونوں کے مزاج و تکنیک میں یکسانیت کا عنصر پایا جاتا ہے لیکن ان سب حقائق کے باوجود ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل ضرور قائم ہے۔ ناول کی طرح ناولٹ کے اجزائے ترکیبی بھی قصہ، پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر کشی اور ناولٹ کے اغراض و مقاصد ہیں۔

ناول اور ناولٹ میں فرق:

دنیا کی مختلف زبانوں میں کہانی (قصہ) کی مختلف شکلیں موجود ہیں، جیسے داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ اور

فنی افسانہ وغیرہ۔ اردو ادب میں داستان، ناول اور افسانے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور فنی طور پر یہ اتنے واضح ہو چکے ہیں کہ ان کی شناخت میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ،لیکن ناولٹ کی شناخت اور پہچان میں بعض اوقات دشواری پیش آتی ہے۔
ناولٹ میں اختصار اپنی جگہ پر اہم ہے لیکن محض مختصر ہونے پر اسے ناولٹ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ناول اور ناولٹ میں فرق دونوں کے درمیان بعض فنی محاسن کی بنا پر ہے، ملاحظہ ہو!

قصے سے لطف اندوز ہونا انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ انسان ہمیشہ سے قصے میں دلچسپی لیتا رہا ہے۔ ناول کی طرح ناولٹ میں بھی ایک قصہ یا کہانی ہوتی ہے۔ ناول کا قصہ انسانی زندگی سے متعلق ہوتا ہے اور اس میں انسانی زندگی کی مکمل تصویر پیش کی جاتی ہے لیکن ناولٹ میں زندگی کی مکمل تصویر کشی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس میں صرف ایک ہی کہانی سنائی جا سکتی ہے کیونکہ اس کا پلاٹ بہت سادہ ہوتا ہے۔

ناول اور ناولٹ کے پلاٹ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ناول کا کینوس چونکہ وسیع ہوتا ہے اس میں بے شمار کردار اور چھوٹی چھوٹی ضمنی کہانیاں بھی ساتھ میں چلتی رہتی ہیں۔ لا تعداد مناظر کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ بعض کرداروں کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے اور وہ منظر نامے سے بالکل غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ نئے کرداروں کے ذریعے کہانی آگے بڑھتی ہے اور تمام تر تفصیلات کو کام میں لا کر زندگی کی گونا گو کیفیات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ناول نگار پیچیدہ اور مرکب پلاٹ سے لے کر پلاٹ در پلاٹ بھی طریقے آزماتا چلا جاتا ہے لیکن اس کے برعکس ناولٹ کا کینوس محدود اور مختصر ہوتا ہے۔ اس میں ناول کی طرح وسعت نہیں ہوتی۔ پلاٹ سادہ ہوتا ہے اور ذیلی پلاٹ برتنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

کسی بھی ناولٹ میں قصہ اور پلاٹ جتنے اہم ہوتے ہیں، اُتنے ہی اس کے کردار بھی اہم ہوتے ہیں، بلکہ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ کسی ناولٹ کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار اس کی کردار نگاری پر ہی ہے۔ ناول نگار زندہ کرداروں کو بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ تخلیق کر سکتا ہے لیکن ناولٹ نگار کے لئے کردار وضع کرنا بہت مشکل اور کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ ناول کا فارم جو آزادی مہیا کرتا ہے، ناولٹ میں اس کے برعکس کافی پابندیاں ہوتی ہیں۔

اگر ہم ناول اور ناولٹ کے کرداروں کا جائزہ لیں، تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ناول میں کرداروں کی ارتقا ہوتی ہے۔ کئی کردار آتے ہیں اور کئی کردار غائب ہو جاتے ہیں اور بعض ان میں مر بھی جاتے ہیں۔ کرداروں کی یہ ارتقائی صورت ناول میں طوالت کی وجہ سے ہوتی ہے جبکہ ناولٹ میں اختصار کی وجہ سے ایسا نہیں ہوتا اس بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''ناولٹ کا واضح پلاٹ نہ تو بہت زیادہ کرداروں کے لئے گنجائش مہیا کرتا ہے اور نہ ہی کرداری عمل کا دائرہ بہت وسیع کرتا ہے۔'' (۴)

ناولٹ میں چونکہ کردار کم ہوتے ہیں اس لئے ان کا بامقصد ہونا ضروری ہے۔

اچھے مکالمے لکھنا ایک فن ہے۔ مکالمے جتنے چست، برمحل اور برجستہ ہونگے، فکشن کی دلکشی میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ ناول کے مکالموں میں بڑی حد تک آزادی ہوتی ہے۔ اس میں طویل بحث، لمبی تقریر، وعظ اور خطبے وغیرہ آسانی سے پیش کیے جاسکتے ہیں جبکہ ناولٹ میں طویل مباحثے، تبصرے اور تقاریر کے لئے جگہ نہیں ہوتی۔ ناول کے مقابلے میں ناولٹ کے مکالموں میں بڑی غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے اور ذہن وشعور کی گہرائیوں میں اترنا پڑتا ہے۔ ناولٹ کے مکالمے کے بارے میں ڈاکٹر سید وضاحت حسین رضوی لکھتے ہیں:

> ''ناولٹ کی اولین شرط میں شامل ہے کہ مکالمے برمحل ہوں، طویل اور بے جا باتوں سے پرہیز کیا جائے، کیونکہ اگر ان چیزوں سے احتراز نہ کیا گیا تو ناولٹ کے مکالمے مجروح ہوکر بے جان ہو جائیں گے۔ اور اپنا تاثر کھودیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ناولٹ نگار کم الفاظ میں زیادہ تاثر اور واضح مفہوم دینے والے جملے پیش کرے اور رمز، اشارہ، کنائے کی مدد سے اپنی زبان کو ترتیب دے۔''(۵)

اور یہی بات ڈاکٹر سلیم اختر بھی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ناولٹ نگار کو مکالموں میں بے جا طوالت سے بھی احتراز کرنا چاہیے۔ کیونکہ ناولٹ کی ساخت طویل، بوجھل اور اکتاہٹ پیدا کرنے والے مکالموں سے مجروح ہوتی ہے۔ کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم پیدا کرنے کیلئے ایمائی انداز اپنایا جاسکتا ہے''۔(۶)

کسی بھی فن پارے کی خوب صورتی میں اضافے کا سبب حقیقی منظر کشی بھی ہوتی ہے۔ ایک کامیاب منظر کشی وہ ہوتی ہے جس میں فکشن نگار کسی چیز کے منظر کو اس انداز سے پیش کرے کہ اس کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے۔ ناول میں منظر کشی کے لیے وافر مواقع میسر آتے ہیں۔ اس کے برعکس ناولٹ میں یہ مواقع اس طرح سے میسر نہیں آتے۔ چونکہ ناولٹ کا کینوس چھوٹا اور محدود ہوتا ہے اس لئے اس میں منظر کشی کے حوالے سے زیادہ فنی مہارت کی ضرورت پڑتی ہے اور چھوٹے جملوں میں وہ تصویر کھینچنی ہوتی ہے جو کہانی کے ارتقا، کرداروں کی سیرت اور خوبیوں وخامیوں کو زیادہ نمایاں کر سکے۔ کسی بھی فکشن نگار کا کام زندگی کے نقشے کو موثر انداز سے پیش کرنا ہوتا ہے۔ ناول کی طرح ناولٹ میں بھی نظریہ حیات اور نقطہ نظر کی پیش کش ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے لیکن یہ ناول سے قدر مختلف ہوتا ہے کیونکہ اس میں مقصد ابھر کر سامنے نہیں آتا بلکہ صرف اس کی جھلکیاں ہی دکھائی دیتی ہیں۔ ناولٹ میں نقطہ نظر کے حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> ''ناولٹ کسی مخصوص فلسفہ حیات کے بغیر نہیں کہا جاسکتا، زندگی کے متعلق بغیر کسی واضح نقطہ نظر کے اس کا ڈھانچہ تیار نہیں ہوسکتا اور اگر تیار بھی ہو جائے تو یہ عمارت استوار نہیں ہوسکتی بلکہ وہ واقعات کے مدوجذر، کرداروں کے اقوال وافعال اور حرکات وسکنات میں پوشیدہ ہوتا ہے۔''(۷)

المختصر جدید دور میں قصہ نگاری کے جو وسیلے رائج ہیں، ان میں ناول، ناولٹ اور مختصر افسانہ مشہور و معروف اصناف ہیں۔ مختصر افسانے سے قاری کی تسکین وتشفی ممکن نہیں ہوتی جبکہ ناول کے راستے میں وقت کی قلت وکمی حائل ہے۔ اس طرح ناولٹ ہی قصے کی وہ بہترین صنف ہے جو عصر حاضر کے قارئین کے ذوق مطالعہ کی سیرابی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ادبیات عالم میں ناولٹ بڑی تیزی سے لکھے جا رہے ہیں اور قارئین میں اپنی مقبولیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

۱۔ باغی چیونٹیاں:

شجاعت علی راہیؔ نے بچوں کے لئے دلچسپ اور معلوماتی ناولٹ قلم بند کیے ہیں۔ اس نے بچوں کے لئے جو ناولٹ لکھے ہیں، ان میں ''باغی چیونٹیاں'' ان کا پہلا ناولٹ ہے جو ۱۱۲ صفحات اور دیدہ زیب سرورق پر مشتمل ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ناولٹ کا موضوع انوکھا اور پُرتجسس ہے جو انسان کو یہ ناولٹ پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ کتاب کا انتساب راہیؔ نے اپنے پوتے سید شایان حُسین کے نام کیا ہے، اس کی اس خصوصیت کی بناء پر کہ جب کام کرنے پر آتا ہے تو چیونٹی کی طرح ڈٹ کر محنت سے کام کرتا ہے۔

یہ ایک سبق آموز ناولٹ ہے۔ جس میں بچوں اور بڑوں کے لئے یکساں سبق موجود ہے۔ کتاب کی ابتداء میں راہیؔ بڑی شگفتگی سے بچوں کو یہ ناولٹ پڑھنے پر آمادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ نہ صرف یہ ناولٹ آپ خود پڑھیں بلکہ اپنے بڑوں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں، کیونکہ یہ ان کے لئے بھی سبق آموز ہے۔ یہ ناولٹ دراصل چیونٹیوں کی ایک فرضی کہانی پر مشتمل ہے۔ جس میں چیونٹیوں کی انسانوں کے خلاف بغاوت، شرانگیز سرگرمیوں اور ہوشربا کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس ناولٹ میں راہیؔ نے بتایا ہے کہ چیونٹیاں دس کروڑ برس سے زمین پر رینگنے والی ایک محنتی مخلوق ہے۔ یہ بظاہر تو ایک معمولی سا کیڑا ہے لیکن بہت دلچسپ اور پراسرار فتنوں سے بھرا ہوا ہے۔ راہیؔ نے یہ ناولٹ 'چیونٹیوں کی عادات اور خصائل پر باقاعدہ تحقیق کر کے لکھا ہے اور اس میں چیونٹیوں کی اہمیت، فضیلت اور مختلف اقسام کا ذکر کیا گیا ہے۔ چیونٹیوں کی ایک خیالی دنیا کو سجا کر اس میں حقیقت کا رنگ بھرا گیا ہے، جس میں قاری تخیل کی آنکھ سے ایک غیر محسوس طریقے سے چیونٹیوں کی بستی میں چلا جاتا ہے اور وہاں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔

ناولٹ کا قصہ بہت دلچسپ اور معنی خیز ہے اور اپنے اندر معلومات کے ساتھ ساتھ وسیع تر سبق آموز تجربات کا مواد بھی رکھتا ہے۔ قصے کا انداز بیانیہ ہے جس میں شروع سے لے کر آخر تک قاری کا تجسس برقرار رہتا ہے۔ ہر باب کے عنوان کو دیکھ کر قاری کی دلچسپی مزید بڑھ جاتی ہے اور یوں وہ آگے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہانی میں آخر تک شدت تاثر کی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ ناولٹ کی کہانی دو سائنس دانوں کے تجربات سے شروع ہوتی ہے اور انہی پر ہی ختم ہوتی ہے۔ سائنس دان

سولہ برس میں ایک ایسا انجکشن تیار کرتے ہیں جس سے چیونٹیوں میں انسانوں کی طرح سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ابھی تجربات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور ایک انجکشن' جو انسانی ہمدردی اور محبت کے جذبات پر مبنی ہوتا ہے، تیاری کے مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے کہ چیونٹی، پہلے تجربے کے دوران ہی ٹسٹ ٹیوب توڑ کر چلی جاتی ہے۔ اب اس چیونٹی میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جس چیونٹی کے ساتھ اپنا لعاب دہن ملاتی ہے، اس میں بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے اور جب یہ چیونٹی اپنی بستی واپس لوٹ کر جاتی ہے تو ساری چیونٹیوں کے ساتھ اپنا لعب دہن ملا کر ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔

''چیونٹی'' ایک محنتی مخلوق ہے جو بغیر سوچے سمجھے محنت کرتی ہے اور بار بار محنت کر کے تیمور لنگ جیسے شہنشاہ کو ہمت اور محنت کا درس دیتی ہے۔ زیر نظر ناولٹ میں اپنی اس خداداد صلاحیت کو بروئے کار لا کر تجربہ گاہ سے بھاگی ہوئی چیونٹی ،باقی چیونٹیوں کے ساتھ مل کر انسانوں کے خلاف بغاوت کر کے ان سے حکومت اور اقتدار چھیننے کی کوشش کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ہر قسم کی چیونٹیوں کو مختلف طریقوں سے متحد اور منظم کرتی ہے اور اپنی ان تھک محنت اور کوششوں کی بدولت آخر کار اس میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ چیونٹیوں کو انسانوں پر حکومت کرنے کی مکمل آزادی تو میسر آ جاتی ہے، لیکن اپنی اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اور اس کا غلط اور بے جا استعمال کر کے وہ آپس میں لڑائی جھگڑے بھی شروع کر دیتی ہیں اور خانہ جنگی کا شکار ہو جاتی ہیں، جس کی وجہ سے چیونٹیوں کی ایک بہت بڑی تعداد ختم ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ ان کی ملکہ چیونٹی خودکشی کر لیتی ہے جو چیونٹیوں کی تاریخ کی پہلی خودکشی ہوتی ہے۔ ملکہ چیونٹی کی خودکشی سے سب پر ڈر، خوف اور نا اُمیدی چھا جاتی ہے کہ اب حالات کیسے سُدھریں گے؟

اب کون مسیحا بن کر اس عذاب سے ان کی جان چھڑائے گا۔؟ آخر کار مجبور ہو کر چیونٹیاں آپس میں یہ تدبیر سوچتی ہیں کہ کیوں نہ ہم انسانوں سے ایک دفعہ پھر صلح کی راہ اختیار کر کے ان کی مدد لیں۔ چنانچہ اتفاق سے وہ ایک دن' ان دو سائنس دانوں کے پاس جاتی ہیں اور عاجزی سے التجا کرتی ہیں کہ اُن سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت واپس لے لی جائے۔ انسانوں کی طرح سوچنے کی صلاحیت نے انہیں انسانوں کی طرح ظلم و بربریت ڈھانے، اقتدار کی خاطر دوسروں کی ملکیت پر قبضہ کرنے اور اپنے ہی ہم جنسوں کو مار ڈالنے پر مجبور کیا ہے۔ چنانچہ چیونٹیوں کو اپنی فطری زندگی کی طرف واپس دھکیلنے کے لئے سائنس دان اس دفعہ ایک اور ایسا انجکشن تیار کرتے ہیں جس کے ذریعے ان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت واپس لے لی جاتی ہے اور وہ اپنی فطری زندگی کی طرف لوٹ آتی ہیں۔

یہ ایک سبق آموز ناولٹ ہے جس میں راہیؔ نے چیونٹیوں کی کہانی کے ذریعے انسانوں کو یہ سبق دیا ہے کہ آزادی اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ آزادی جیسی نعمت کا استعمال ذمہ داری اور انسانیت

کے ساتھ کر کے اس دنیا کو جنت نذیر بناتا ہے، یا غیر ذمہ داری، ظلم، جبر، بربریت اور وحشی پن کا مظاہرہ کر کے اور اپنی تخریبی قوتوں کو استعمال کر کے اس کو اپنے لئے عذاب بناتا ہے۔

کیونکہ علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری(۸)

یعنی انسان اپنے اعمال کی بنیاد پر ہی دنیا کو جنت اور جہنم بناتا ہے۔ اس بارے میں راہی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''اے انسانو! آزادی سب سے بڑی نعمت بھی ہے اور سب سے بڑا عذاب بھی۔ اگر تم اپنی آزادی کا استعمال انسانیت اور احساس ذمہ داری سے کروگے تو دنیا کو ایک بہشت پاؤ گے اور اگر بربریت اور غیر ذمہ داری کو اپناؤ گے تو دنیا سے بڑھ کر جہنم زار کوئی نہیں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم دنیا کو بہشت بنانا چاہتے ہو یا جہنم زار۔''(۹)

یہی راہی کا پیغام اور اس ناولٹ کا مرکزی خیال ہے۔

فکری جائزہ:

شجاعت علی راہیؔ نے اس ناولٹ کے ذریعے نہ صرف بچوں کو چیونٹیوں کی طرح مستقل مزاجی سے محنت کرنے اور مل جل کر کام کا درس دیا ہے بلکہ یہ ترغیب بھی دی ہے کہ ہمیں اس دنیا کو اپنی محبت و مشقت سے اور بھی زیادہ حسین اور جنت کا نمونہ بنانا چاہئے۔ انسان نے اگر چہ اب تک زمین، سمندر اور دیگر سیاروں کو مسخر کر کے اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے لیکن ابھی اس کائنات کو مزید ٹٹولنے اور اس پر مزید تحقیق کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ ناولٹ میں راہیؔ سائنس دان واٹسن کی زبانی اپنا یہ پیغام ان الفاظ میں دیتے ہیں:

> ''اس تمام ترقی کے باوجود زمین کے کئی گوشے، کئی افق ہماری نظروں سے اوجھل ہیں اور ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم ان نئے گوشوں، نئے افقوں کو کھنگالیں اور دنیا کو ایک بہتر دنیا بنا دیں بلکہ اپنی محبت و مشقت سے جنت بنا ڈالیں۔(۱۰)

جس طرح چیونٹیوں میں مختلف کام کرنے والی چیونٹیاں اپنی اپنی جگہ کام کر کے اور متحد ہو کر اپنے مقصد میں کامیابی اور سرخروئی حاصل کرتی ہیں، اسی طرح راہیؔ بھی ہمیں یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اگر انسان بھی مل جل کر آپس میں تعاون، امن، بھائی چارے اور اتفاق سے رہیں تو کوئی بھی کام اس کے لیے ناممکن نہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''سپاہی چیونٹی نے جواب دیا اگر ہم لفظ ''ناممکن'' کو چیونٹیوں کی لغت سے خارج کر دیں اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو سب کچھ ممکن ہے''(۱۱)

یعنی نہ صرف چیونٹیاں بلکہ اگر انسان بھی متحد ہو کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو وہ بھی بڑے سے بڑا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ایک اور جگہ پر راہیؔ اتفاق کی برکت اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس زمرے میں ایک لکڑ ہارے کا واقعہ سناتے ہیں جو چیونٹیوں کے اُس درخت کو کاٹنے آتا ہے جس میں وہ رہتی ہیں،تو ملکہ چیونٹی سب چیونٹیوں کو متحد کر کے اُسے بھاگنے پر مجبور کرتی ہیں اور ثابت کرتی ہے کہ لمبے قد و قامت،کلہاڑی اور بازوؤں کی طاقت کے باوجود ادنیٰ سی مخلوق بھی متحد ہو کر سب کچھ کر سکتی ہے۔ملکہ چیونٹی باقی چیونٹیوں کو تحریک دے کے مخاطب کرتی ہے:

> ''لکڑ ہارا! ایک ہے اور تم کئی ہزار۔
> یہ ضرور ہے کہ اس کے پاس لمبا قد و قامت ہے۔کلہاڑی ہے اور بازوؤں کی قوت ہے۔لیکن تمہارے پاس اس سے بھی بڑھ کر قوت ہے،تم سب مل کر اس پر بیک وقت ٹوٹ پڑو اور اس کے پاؤں،ٹانگوں اور جسم کے باقی حصوں کو کاٹ کاٹ کر اس کو اپنی طاقت دکھاؤ۔'' (۱۲)

راہیؔ نے اس ناولٹ میں مختلف قسم کی چیونٹیوں کا ذکر کیا ہے جس میں سے کچھ محنتی اور نکھٹو چیونٹیاں بھی شامل ہیں۔ان کا ذکر کر کے راہیؔ کہتے ہیں کہ اسی طرح انسانوں میں بھی کچھ لوگ محنتی اور کچھ آرام پسند و نکھٹو ہوتے ہیں،ایسی صورت میں ان لوگوں کو بھی ساتھ لے کر آگے بڑھنا چاہئے اور ان کی کاہلی،سستی اور کام چوری کو دیکھ کر محنت اور کوشش کے عمل کو ترک نہیں کرنا چاہئے،ہوسکتا ہے کہ آپ کے دیکھا دیکھی وہ بھی کام کرنے لگ جائیں اور محنت ومشقت کی راہ اپنالیں۔لکھتے ہیں:

> ''ہمیں دوسری چیونٹیوں کو بھگانے کے لئے چند رضا کاروں کی ضرورت ہے۔جو چیونٹیاں اس مہم پر جانے کے لئے تیار ہیں،وہ ایک قدم آگے بڑھائیں۔''تمام مزدور چیونٹیاں ایک قدم آگے بڑھیں۔البتہ نکھٹو چیونٹے بتوں کی طرح چپ چاپ کھڑے رہے۔ملکہ چیونٹی کی آنکھیں مزدور چیونٹیوں کی جرات پر روشن تر ہو گئیں۔'' (۱۳)

یعنی مزدور چیونٹیاں محنتی ہوتی ہیں،اس لئے آگے بڑھ کر اپنی جرات کا مظاہرہ کرتی ہیں اور نکھٹو چیونٹیوں کی کاہلی کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔

اس کے علاوہ راہیؔ نے اس بات کی بھی نصیحت کی ہے کہ ہمیشہ آپس کی دشمنی،ناراضگی اور تلخیوں کو دوستی میں بدلنے کی حتی المقدور کوشش کرنی چاہیے اور معاشرے میں ضرورت مند اور غریب لوگون کی ضرورتوں کا خیال رکھنا چاہئے،تاکہ معاشرے میں اخلاقی بُرائیاں جیسی چوری،خرد برد اور ڈاکہ زنی وغیرہ جنم نہ لے سکے،کیونکہ انسان چور اس وقت بنتا ہے اور غلط قدم اٹھاتا ہے جب معاشرتی ناانصافیوں کی وجہ سے اُسے کچھ نہیں ملتا۔اس کے برعکس اگر انسان کی ساری ضرورتیں پوری ہوں تو وہ کبھی غلط کام نہیں کرتا۔اس سلسلے میں وہ چور چیونٹیوں کی دعوت کی مثال دیتے ہیں،جب چھاتا بردار چیونٹیوں

کی ملکہ، چور چیونٹیوں کو دعوت دیتی ہیں تو وہ سب پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہیں اور ہر قدم پر ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''تمھیں اور تمہاری سب سہلیوں کو کل دوپہر ہماری مہمان سپاہی چیونٹیوں اور ہمارے
ساتھ کھانے کی دعوت قبول کرنا ہو گی۔''
''ہم چور چیونٹیاں کسی بھی اچھی دعوت کو نامنظور نہیں کرتیں۔
کاش! ہمیں ایسی دعوتیں روز میسر ہوں تاکہ ہمیں چوری کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے،
ننھی منی، زرد چیونٹی نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور انٹینے اچکاتے ہوئے کہا''۔(۱۴)

اس طرح ایک دوسری جگہ پر آپس کی تلخی اور دشمنی کو ختم کرنے اور دوستی کا رشتہ استوار کرنے کے بارے میں چھاتا بردار ملکہ، چور چیونٹیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے:

''بہنو اور بیٹیو! آج تک ہم نے ایک دوسرے کو اپنا دشمن جانا۔ تم ہماری مزدور چیونٹیوں سے ان کی غذا
چھین چھین کر لے جاتی رہیں اور وہ تمہاری بنائی ہوئی چھوٹی سرنگوں میں نہ گھس سکنے کے باعث تمھیں
پکڑنے سے معذور رہیں۔ یوں روز بروز آپس میں تلخی اور دشمنی بڑھتی چلی گئی۔
مگر میرا خیال ہے کہ ہم اس دشمنی اور نفرت کو دوستی اور محبت میں بدل سکتی ہیں۔''
''اگر ہمیں خوراک ملتی رہے تو ہم ہر اک سے دوستی کا رشتہ استوار کرنے کے لئے تیار ہیں۔''
''چور چیونٹیوں کی ایک موٹے پیٹ والی نمائندہ چیونٹی بولی''۔(۱۵)

شجاعت علی راہیؔ نے اس ناولٹ میں بچوں کو یہ سبق باور کرانے کی بھی سعی کی ہے کہ ہمیں ہمیشہ آپس میں مل جل کر کام کرنا چاہئے۔ مستقل مزاجی سے محنت کر کے اپنے مقصد کو پانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ معاشرہ مختلف افراد سے مل کر تشکیل پاتا ہے، اس لئے اس میں چیونٹیوں کی طرح ہر انسان اپنے پیشے کے لحاظ سے نہ صرف اہم ہے بلکہ ایک خاص مقام اور حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس لئے کسی کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔ چاہے وہ کوئی درزی ہو، نرس ہو، معمار ہو، مزدور ہو، سپاہی ہو، ترکھان ہو یا کوئی حکمران۔ اس مقصد کے تحت اُنہوں نے ایک طرف مختلف اقسام کی چیونٹیوں کا ذکر کیا ہے اور دوسری طرف انہی چیونٹیوں کے مختلف کام اور پیشے بھی گنوائے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر کے خوشی سے مل جل کر کام کرتی ہیں مثلاً:

''لنگڑی چیونٹی نے نرس چیونٹی سے کہا'' آپ حسب معمول گھر کی صفائی کرنے، لاروؤں، پیوپوں کو
ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک پہنچانے اور ننھی چیونٹیوں کے نہلانے دھلانے اور مالش کرنے
کے کام میں مصروف رہیں۔''
پھر وہ خوراک رساں مزدور چیونٹیوں سے مخاطب ہوئی، آپ ملکہ عالیہ اور باقی چیونٹیوں اور چیونٹوں کے

لئے خوراک کا بندوبست کرتی رہیں۔"

اس کے بعد اس موٹے سروں والے سپاہی چیونٹیوں میں سے پچاس چاق و چوبند صحت منداور غصیلی چیونٹیوں کو چن کر انہیں کہا۔

"میں سمجھتی ہوں کہ جو عظیم مقصد ہمارے پیش نظر ہے اس کے لئے آپ انتہائی موزوں ہستیاں ہیں۔" (۱۶)

ایک اور جگہ پر بھی راہیؔ نے مختلف کام کرنے والی چیونٹیوں کا ذکر بہت خوب صورت، دل پذیر اور خطیبانہ انداز میں کرتے ہیں جب ملکہ چیونٹی سب چیونٹیوں کو متحد کرتی ہیں:

"ملکہ نے جواب دیا" پہلے ہمیں ساری چیونٹیوں کو متحد اور منظم کرنا ہے۔

چاہے وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں،

چاہے وہ جنگجو چیونٹیاں ہوں یا چور چیونٹیاں،

چاہے وہ کسان چیونٹیاں ہوں یا ٹیلے بنانے والے چیونٹیاں،

چاہے وہ درزن چیونٹیاں ہوں یا ترکھان چیونٹیاں (۱۷)

مزید برآں شجاعت علی راہیؔ نے ہمارے معاشرے کے اس المیے کو بھی بڑی خوب صورتی سے بے نقاب کیا ہے کہ جب بھی کوئی نیا لیڈر آتا ہے تو پہلے لیڈر کو بُرا بھلا کہتا ہے اور اس پر کیچڑ اُچھال کر سارے الزامات لگاتا ہے۔ لیکن جب ایک دفعہ اقتدار خود اس کے ہاتھ میں آتا ہے تو حالات کو امن و آمان اور خوش اسلوبی سے ٹھیک کرنے کی بجائے اپنی طاقت اور اختیار کا بے دریغ استعمال کرتا ہے، جس سے بعض اوقات حالات سدھرنے کی بجائے مزید خراب ہو جاتے ہیں۔ ناولٹ میں جب بُل ڈاگ چیونٹی کو وزیر اعظم بنایا جاتا ہے تو برسرِ اقتدار آتے ہی وہ ایک اشتعال انگیز تقریر کرتے ہوئے کہتی ہے:

"ساری خانہ بدوش چیونٹیوں کی دشمنیاں اور جھگڑے اب ختم ہو جانے چاہیے۔ جس گروہ نے بھی نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی اور ہمارے قوانین کی خلاف ورزی کی، ہم اُسے نیست و نابود کر دیں گے"۔ (۱۸)

بُل ڈاگ وزیر اعظم چیونٹی، کی یہ اشتعال انگیز تقریر جلتی پر تیل کا کام کرتی ہے اور پھر اس کے بعد فسادات کا ایک نہ ختم ہونے والا نیا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

غرض راہیؔ نے اس ناولٹ میں چیونٹیوں کی زندگی کو بنیاد بنا کر نئی نسل کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آپس میں پیار و محبت سے رہنا چاہئے۔ لڑائی جھگڑوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔ طاقت اور اختیار کو ہمیشہ تخریبی کاموں کی بجائے تخلیقی سرگرمیوں پر صرف کرنا چاہئے۔ دوسروں کے گھر اُجاڑنا اور دوسروں کے لئے گڑھے کھودنا دراصل اپنا ہی گھر برباد کرنے کے مترادف ہے۔ اس سلسلے میں راہیؔ نے چنگیز خان اور ہلاکو خان جیسے ظلم و بربریت ڈھانے والے جنگجوؤں کا ذکر

کیا ہے، جنہوں نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو اپنی طاقت اور اقتدار کے نشے میں موت کے گھاٹ اُتارا۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ اللہ کی دی ہوئی زندگی ہمیشہ فطرت کے اصولوں کے مطابق گزارنی چاہئے۔ دولت واقتدار حاصل کرنے کی لالچ اور دوسروں کو غلام بنانے کی سوچ اور فکر کبھی دل میں نہیں لانی چاہئے' اس سے انسان کی اپنی زندگی جہنم اور عذاب بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ زندگی میں آگے بڑھنے، کامیابی حاصل کرنے کے لئے رنگ، نسل اور قبائلی امتیازات کو فراموش کرنا چاہئے اور ہمیشہ چیونٹیوں کی طرح مستقل مزاجی سے بغیر سوچے سمجھے محنت کر کے آگے بڑھنے اور کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

فنی جائزہ:

ناولٹ کے موضوع، مرکزی، خیال اور کہانی (قصے) کے ساتھ ساتھ فنی لحاظ سے ناولٹ کا پلاٹ، کردار، مکالمے اور منظر نگاری بھی بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

پلاٹ:

ناولٹ ''باغی چیونٹیوں'' کا پلاٹ بھی منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کا پلاٹ سادہ، عام فہم اور اکہرا ہے۔ کہیں پر بھی پیچیدگی نظر نہیں آتی اور نہ ہی کہیں پلاٹ کی مرکب صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔ کہانی میں شروع سے لے کر آخر تک ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ تمام واقعات ایک دوسرے سے ایسے جڑے ہوئے ہیں کہ قاری بغیر کسی رکاوٹ کے تخیل کی دنیا میں مگن، کرداروں کے ساتھ مختلف منازل واقعات اور مناظر طے کر کے آگے بڑھتا ہے۔ تمام مناظر ایک ترتیب کے ساتھ رونما ہوتے ہیں اور اس طرح کہانی آگے بڑھتی ہے۔ ایک منظم اور مربوط پلاٹ کسی بھی فکشن کی مقبولیت کا سبب بنتا ہے۔ ناولٹ ''باغی چیونٹیاں'' کا پلاٹ بھی نہایت منظم اور مربوط ہے۔

کردار نگاری:

جہاں تک اس ناولٹ کے کرداروں کا تعلق ہے تو اس میں انسانوں اور چیونٹیوں کے کردار پائے جاتے ہیں۔ انسانوں کے کردار میں دو سائنس دان ڈاکٹر واٹسن اور ڈاکٹر مائیکل ہیں جو چیونٹی پر تجربات کرتے ہیں۔ کہانی کا آغاز انہی دو سائنس دانوں سے ہوتا ہے اور خاتمہ بھی انہی کرداروں پر ہوتا ہے۔ یہ کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔ اس کے علاوہ ضمنی کرداروں میں ایک نرس کا کردار ہے جو ہسپتال میں ڈاکٹر واٹسن کی تیمارداری کرتی ہے۔ چیونٹیوں میں ملکہ چیونٹی اور لنگڑی چیونٹی مرکزی کردار ہیں۔ ملکہ چیونٹی ساری چیونٹیوں کی ماں ہوتی ہے، وہ اور لنگڑی چیونٹی، باقی تمام چیونٹیوں کو متحد کر کے انہیں انسانوں کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کرتی ہیں باقی ضمنی کرداروں میں مختلف اقسام اور قبیلوں سے تعلق رکھنے والی مختلف رنگوں کی چیونٹیاں ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف کام کرنے والی چیونٹیاں بھی ہیں جن میں مزدور، سپاہی،

نرس، کارکن، جنگجو، خانہ بدوش، ترکھان، کسان، چور، درزن چیونٹیاں شامل ہیں۔ ان تمام کرداروں میں کہیں پر بھی ارتقا نظر نہیں آتی جو کہ ایک کامیاب ناولٹ کی نشانی ہے۔

راہیؔ نے چونکہ چیونٹیوں کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا اور دیگر ذرائع سے معلومات حاصل کر کے باقاعدہ تحقیق کی ہے اور وہ چیونٹیوں کے رہن سہن، آپس میں رہنے کے انداز وطور طریقوں اور خصلتوں سے اچھی طرح واقف ہیں، اس لئے انہوں نے چیونٹیوں کے سبھی کرداروں کو حقیقی رنگ میں احسن طریقے سے ناولٹ کا حصہ بنایا ہے۔

مکالمہ نگاری:

راہی بچوں کی نفسیات کے بہترین نباض ہیں۔ ان کی ذہنی استعداد، دلچسپیوں اور رجحانات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس لئے انہوں نے ناولٹ کے مکالمے بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر تخلیق کیے ہیں۔ چونکہ ناولٹ کے مکالموں کے لئے بنیادی شرط ان کا مختصر، برمحل اور برجستہ ہونا ہے، اس لئے راہیؔ نے بھی انتہائی سادہ، مختصر اور عام فہم مکالمے استعمال کیے ہیں اور طویل مکالموں اور مشکل پسندی سے احتراز کیا ہے۔ عموماً بچے عام فہم انداز میں لکھے ہوئے قصے اور کہانیوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک موقع پر جب ملکہ چیونٹی باقی چیونٹیوں کو داد دیتی ہے اور لنگڑی چیونٹی کو مہم کی ذمہ داری سونپتی ہے تو اس موقع پر ان کے درمیان ہونے والے مختصر مکالے کی مثال دیکھیے:

> ''شاباش، میری بچیو شاباش!''
> وہ خوش ہو کر بولی اور پھر لنگڑی چیونٹی سے مخاطب
> ہوئی۔ ''بیٹی! ان میں پچاس مضبوط جسم والی اور ذہین
> چیونٹیوں کو چُن کر انہیں مختلف بستیوں میں بھیج دو۔
> اس مہم کی ذمہ داری میں تمھیں سونپتی ہوں۔''
> ''شکریہ، ملکہ عالیہ! لنگڑی چیونٹی
> نے احترام سے اپنے دونوں انٹینے جھکا
> کر کہا''(۱۹)

یوں راہیؔ نے بہترین مکالمے تحریر کر کے فنی عظمت کا ثبوت دیا ہے۔ ناولٹ کے تمام مکالمے نہایت آسان، مختصر، برمحل اور ناولٹ کے فنی تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔

منظر نگاری:

ناولٹ کا کینوس چونکہ محدود اور مختصر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ناولٹ نگار کو منظر کشی کرنے کے لئے وسیع میدان میسر نہیں آتا۔ راہیؔ نے بھی زیر نظر ناولٹ میں بہت خوب صورت، دل آویز اور مختصر منظر نگاری کی ہے جو عین حقیقی رنگ لئے

ہوئے ہیں۔ایک کامیاب منظر نگاری وہ ہوتی ہے جس میں کوئی منظر قاری کی آنکھوں کے سامنے ہو بہو کھنچ جائے۔اس لحاظ سے ''باغی چیونٹیوں'' کی منظر نگاری بے مثال ہے۔

جس دن چیونٹیوں کا اتحاد کانفرنس ہونے والا تھا۔اس دن صبح کے حسین منظر کو راہیؔ نے یوں قلم بند کیا ہے:

صبح کی دودھیا روشنی پھیل رہی تھی۔چیونٹی اتحاد کانفرنس شروع ہونے والا دن طلوع ہو چکا تھا۔
فضا میں پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو بہہ رہی تھی۔
درخت صبح کی ہوا سے سراسرا رہے تھے۔
اور ہری ہری گھاس کے درمیان ننھی منی چیونٹیاں سرگرم عمل تھیں۔
تمام مزدور چیونٹیاں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کام کر رہی تھیں۔
وہ دو چار قدم چل کر ذرا سی رُک جاتیں اور پھر گرم رفتار ہو جاتیں''۔(۲۰)

منظر نگاری کے اس نمونے کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کہانی پر راہیؔ کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔

اسلوب اور زبان و بیان:

ناولٹ ''باغی چیونٹیوں'' کا انداز بیانیہ ہے۔مصنف نے بات کرنے کے لئے خطیبانہ انداز اپنایا ہے۔اگر چہ سادہ اور سلیس زبان میں قصے کو آگے بڑھایا گیا ہے، تاہم پھر بھی کچھ مشکل الفاظ نظر آتے ہیں جس کا اعتراف راہیؔ نے خود کتاب کے آغاز میں کیا ہے کہ اس ناولٹ میں کچھ خامیاں بھی ہیں یعنی اس میں کچھ مشکل الفاظ بھی ہیں۔لیکن ان الفاظ کے استعمال کی وجہ بھی انہوں نے خود ہی بتائی ہے کہ ان کے ذریعے بچے اردو زبان سیکھیں اور اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کریں۔وہ الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

محیر العقول، فرطِ حیرت، ہراساں، مہمل، تحکمانہ انداز، سمع خراشی، شقی القلب، ولالت، نحیف و نزار، بے مایہ، سیل رواں، پا مردی، جرأت رندانہ، آبدیدہ، کھیپ، بزعم خویش، زک، تمکنت، کمک، طمطراق، سراسیمہ، فوج ظفر موج اور گوشہ چشم وغیرہ وغیرہ۔

راہیؔ نے یہ مشکل الفاظ قصے کو بامعنی اور پُراثر بنانے کے لئے موزوں اور برمحل استعمال کیے ہیں۔کیونکہ ناولٹ میں شدت تاثر الفاظ کے معنی اور گہرائی سے پیدا کی جاتی ہے جو ناولٹ نگاری کے فن کا تقاضا ہے۔

علاوہ ازیں کہانی کو موثر انداز سے نبھانے کے لئے راہیؔ نے جگہ جگہ تشبیہات، محاورات اور ضرب المثال کا سہارا بھی لیا ہے۔یہاں تک کہ ایک جگہ فارسی ضرب المثل کو بھی استعمال کیا ہے۔یہ محاورے اور ضرب الامثال نہ صرف بچوں کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ تحریر کی خوب صورتی میں اضافے کا سبب بھی بنتے ہیں۔

غرض شجاعت علی راہی کا ناولٹ ''باغی چیونٹیاں'' ناولٹ کے معیار اور تکنیک پر پورا اترتا ہے۔ سادہ اور رواں پلاٹ اس کا خاصہ ہے۔ کہیں پر بھی کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ جاندار کرداروں کے ساتھ ساتھ مکالموں کو خطیبانہ آہنگ بخشا گیا ہے۔ مختصراً اور عام فہم مکالمے لکھے گئے ہیں اور خوب صورت منظر کشی کر کے بچوں کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ گویا پورے ناولٹ میں وحدت تاثر اور وحدت زماں و مکاں کے تقاضوں کو خوش اسلوبی سے نبھایا گیا ہے۔

۲۔ تتلیوں کا میلہ:

شجاعت علی راہیؔ نے بچوں کے لئے جتنے بھی ناولٹ لکھے ہیں، باقاعدہ تحقیق کر کے لکھے ہیں۔ ناولٹ ''باغی چیونٹیاں'' جس طرح چیونٹیوں کی عادات واطوار، اقسام، خصوصیات اور جبلتوں پر تحقیق کر کے لکھا گیا ہے، اسی طرح ناولٹ ''تتلیوں کا میلہ'' (تتلیوں کے دیس کی ایک کہانی) تتلیوں کی مختلف اقسام، رنگوں اور اُن کی پُر اسرار زندگی سے متعلق تحقیق پر مبنی ہے۔ اس ناولٹ میں تتلیوں کی جملہ معلومات کے علاوہ، اُن کی پیدائش کے مختلف مراحل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، کہ تتلیاں کس طرح جنم لیتی ہیں اور زندگی کا ایک بہار دیکھنے کے بعد جلد فنا ہو جاتی ہیں۔

راہیؔ نے بچوں کے ادب پر خصوصی توجہ دی ہے۔ آج کل اُن کا فوکس بچوں کی تخلیقات پر زیادہ ہے۔ ادب اطفال کی اہمیت اور اپنے ناولٹ ''تتلیوں کا میلہ'' کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے راقمہ کو اپنے ایک انٹرویو میں بتایا:

> ''بچوں کے ناول اور کہانیاں وغیرہ میرے لئے سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں کہ ان میں نئی پود کی ذہنی ترتیب کا سامان ہے اور اخلاقی اقدار کی پاسداری کی سمت راغب کرنے کی ایک شعوری کوشش ہے۔ میں نے اپنے ناولوں ''باغی چیونٹیوں'' اور ''تتلیوں کا میلہ'' کی اساس چیونٹیوں اور تتلیوں کے بارے میں حقائق پر رکھی ہے تاکہ بچے ان کی ہوش رُبا زندگی، اقسام اور عادتوں سے بھی آگاہی حاصل کریں اور حُسن وخیر کی قدروں کی جانب بھی گامزن ہوں''۔ (۲۱)

ناولٹ ''تتلیوں کا میلہ'' کا نام پہلے راہیؔ نے ''سویرا پری'' رکھا تھا۔ لیکن چونکہ یہ ناولٹ تتلیوں کی مختلف اقسام اور طرز حیات کے بارے میں تھا، اس وجہ سے انہوں نے اس کا نام ''سویرا پری'' سے تبدیل کر کے ''تتلیوں کا میلہ'' رکھا۔ اس بارے میں انہوں نے راقمہ کو بتایا ہے:

> ''میں نے تتلیوں کی اقسام اور طرز حیات کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ اس مطالعے کی بنیاد پر اپنا دوسرا ناولٹ ''سویرا پری'' لکھ ڈالا جو ہفت روزہ اخبار ''خواتین'' کراچی میں قسط وار شائع ہوا، بعد میں میں نے اس ناولٹ کا نام تبدیل کر کے ''تتلیوں کا میلہ'' رکھ دیا جو زیادہ موزوں تھا۔'' (۲۲)

اس ناولٹ میں چونکہ زنانہ اور چھوٹی بچیوں کے کردار ہیں، اسی مناسبت سے راہیؔ نے اس کا انتساب اپنی پوتی

انمول قندیل کے نام کیا ہے۔

یہ ایک رومانی ناولٹ ہے جو مافوق الفطرت مخلوق، کوہِ قاف، دنیاوی زندگی، انسانوں اور ان کے مابین باہمی رشتوں پر مشتمل ہے۔ اس میں دلکش، دل آویز اور ہوشربا فطری مناظر کے ساتھ ساتھ ہر طرف پھول، باغ، رنگ و دھنک کا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ خوب صورت و حسین تتلیاں ہر طرف رنگوں کی ایک عجیب وغریب طلسماتی فضا قائم کرتی ہیں جس کی خوب صورتی و رعنائی میں کھو کر انسان اس مادی دنیا کی سختیوں اور تکلیفوں کو بھلا کر تخیلاتی دنیا کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے اور روحانی طور پر ایک آسودگی، فرحت اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔

شجاعت علی راہیؔ نے اس ناولٹ میں اپنے زورِ تخیل اور وسیع قوت مشاہدہ کی بنیاد پر دل نشین انداز میں بچوں کے لئے ایک خوب صورت اور سبق آموز کہانی تخلیق کی ہے، جسے پڑھ کر بچوں میں خود بخود ایک دوسرے کے لئے ہمدردی، محبت، ایثار و قربانی، دکھ درد بانٹنے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ناولٹ کی ابتداء میں وہ پہلے بچوں کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اس دنیا کی خوب صورتیاں اور نیرنگیاں سب کچھ تمہارے لئے ہے۔ ایک طرف تم زندگی کے حُسن کو دیکھو اور اُس سے فائدہ اُٹھاؤ اور دوسری طرف اس دنیا میں لڑنے جھگڑنے، دُکھ درد جھیلنے اور ایک دوسرے کا غم بانٹنے والے لوگوں کو بھی دیکھو اور زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد ناولٹ پڑھنے کی ترغیب ان الفاظ میں دیتے ہیں:

''پیارے بچو! یہ ناولٹ پڑھو۔۔۔۔۔شاید دنیا کے
حسن اور زندگی کے دکھوں کو سمجھنے میں یہ تمہاری
تھوڑی بہت مدد کر سکے اور تم زندگی کی حقیقت کو سمجھ سکو۔(۲۳)

شجاعت علی راہیؔ نے اس ناولٹ میں نہ صرف بچوں کو معلومات کا خزینہ باہم فراہم کیا ہے بلکہ انہیں زندگی کا اصل مقصد و منشاء اور زندگی بسر کرنے کے طور طریقے بھی سکھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناولٹ ایک ننھی پری ''سویرا'' کی کہانی ہے جو دنیا اور دنیا میں حسین تتلیوں کا نظارہ دیکھنے کے لئے کوہِ قاف سے زمین پر اُترتی ہے۔ زمین پر اُسے ایک بچی ملتی ہے جس کا نام کونپل ہوتا ہے۔ اُس سے سویرا کی دوستی ہو جاتی ہے، کونپل اُسے مزے دار اسٹابری کھلاتی ہے اور اُسے اپنے ساتھ گھر لے جاتی ہے، جہاں سویرا کو کوہِ قاف کے برعکس ایک محبت بھرا گھر ملتا ہے جس میں کونپل، اس کے والدین اور اس کا چھوٹا بھائی رہتے ہیں۔ کونپل کی ماں کو سویرا سے ایک قدرتی لگاؤ اور اُنس ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اُسے سویرا میں اپنی مری ہوئی بیٹی کونپل کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ سویرا کے دل میں بھی محبت بھرے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ زمین پر پیار اور محبت کے اس ماحول کے علاوہ اور بھی خوب صورتیاں دیکھتی ہیں۔ رنگ برنگی تتلیاں دیکھتی ہیں، جنھیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتی ہے۔ وہ ان سے دوستی کر لیتی ہے اور کوہِ قاف واپس نہیں جانا چاہتی۔ لیکن اس کی خالہ اُسے زبردستی واپس لے جاتی ہے۔ کوہِ قاف میں وہ بہت افسردہ رہتی ہے اور اپنی ماں سے ضد کرتی ہے کہ وہ دوبارہ زمین پر جانا چاہتی ہے۔ کونپل، تتلیوں اور ننھے مُنّے کو

دیکھنا چاہتی ہے۔اس کی ماں اُسے سمجھاتی ہیں کہ زمین پر دکھ درد ہیں، تکالیف ہیں۔زمین ایک سانپ کی مانند ہے۔اس کے خوش نما رنگوں پر مت جاؤ بلکہ اس کے زہریلے پن کو دیکھنے کی کوشش کرو۔وہ اسے مزید کہتی ہے کہ تم نے ابھی تک زمین کا صرف روشن پہلو ہی دیکھا ہے اس کا تاریک پہلو نہیں دیکھا۔تتلیوں کا رقص تو دیکھا ہے لیکن کسی تتلی کو چھپکلی کے مُنہ میں بسمل کی طرح تڑپتے ہوئے نہیں دیکھا، جبکہ اس کے مقابلے میں کوہِ قاف میں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں اور کسی چیز کی کوئی کمی نہیں۔لیکن سویرا اپنی ضد پر قائم رہتی ہے، جس کی وجہ سے اس کی ماں اُسے زمین پر دوبارہ جانے کی اجازت دے دیتی ہے اور ساتھ میں اُسے یہ بھی کہتی ہے کہ جب زمین کے متعلق تمہارے جھوٹے خواب ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور تم زمین کے دکھ درد دیکھ کر واپس لوٹو گی تو میں سمجھ جاؤں گی کہ تم نے اصل حقیقت کو پا لیا ہے۔

چنانچہ سویرا ایک بار پھر خوشی سے زمین پر اترتی ہے لیکن اس دفعہ وہ کونپل کے گھر کا راستہ بھول جاتی ہے اور کسی اور جگہ اُتر جاتی ہے، جہاں سب سے پہلے ایک مگرمچھ اس پر حملہ کرتا ہے۔وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر ایک درخت پر بیٹھ جاتی ہے، وہاں اس کی ملاقات ایک پرندہ نما تتلی سے ہوتی ہے جو اپنے میاں کی خوب برائیاں کرتی ہے۔درخت سے نیچے اُتر کر قریب ہی اُسے مختلف رنگوں کے پھول دکھائی دیتے ہیں۔ایک ارغوانی رنگ کے پھول سے وہ کونپل کا پتہ پوچھتی ہے تو قریب پھول پر بیٹھی ہوئی ایک حکمران تتلی اسے کہتی ہے کہ جس لڑکی کا تم پوچھ رہی ہو اس کا تو مجھے کچھ نہیں معلوم، البتہ میں تمہیں ایک اور لڑکی سے ملوا سکتی ہوں جو روزانہ باغ میں پھول چُنتی ہے۔یوں حکمران تتلی لڑکی سے ملوانے لے جاتی ہے۔ اس لڑکی کا نام کنول ہوتا ہے۔کنول پھول چُن کر اس سے گلدستے بنا کر بازار میں بیچتی ہے اور چند روپے کما کر گزر بسر کرتی ہے۔سویرا کو کنول بہت پسند آتی ہے اور اُسے سہیلی بناتی ہے، یہاں تک کہ اس کے ساتھ اس کے گھر بھی چلی جاتی ہے۔کنول کے گھر آ کر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اپنی ماں مر چکی ہے اور سوتیلی ماں نہ صرف اُسے ڈانٹتی ہے بلکہ اس سے زبردستی پھولوں کے گلدستے بنانے اور انہیں بیچنے پر مجبور کرتی ہے۔سویرا کنول کے ساتھ ہر دکھ بانٹتی ہے اور اس کی مدد کر کے خوشی محسوس کرتی ہے، وہ اس کے ساتھ مل کر پھولوں کے گلدستے بنا کر بھی بیچتی ہے اور گھر کے کام کاج میں بھی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔

ایک دن سویرا خواب میں کونپل اور بونے منے کو دیکھتی ہے تو انتہائی بے چین ہو کر کنول سے رخصت لے کر کونپل کے گھر کی تلاش میں نکل جاتی ہے۔اتفاق سے اُسے کونپل کا گھر مل بھی جاتا ہے۔وہ سیدھی گھر کے سامنے اُتر کر اندر جاتی ہے۔وہاں جا کر کیا دیکھتی ہے کہ کونپل کی لاش چارپائی پر پڑی ہے اور اس کی ماں رو رو کر سویرا سے کہتی ہے کہ بیٹی تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔کونپل تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے اور تمہارے لئے اسٹابریاں چُنتے ہوئے پہاڑی سے نیچے گر کر ابدی نیند سو گئی ہے۔وہ روز تمہارا راستہ تکتی تھی اور تمہارے آنے کا انتظار کیا کرتی تھی۔

سویرا یہ سُن کر زار و قطار روتی ہے اور یہ فیصلہ کرتی ہے کہ وہ کونپل کی ماں کو کبھی اکیلے نہیں چھوڑے گی بلکہ اس کی بیٹی بن کر ہمیشہ اس کے ساتھ اس کے گھر میں رہے گی۔ ایک رات وہ خواب میں اپنی امی کو دیکھتی ہے جو اُسے پھر کہتی ہے کہ دنیا میں دکھ درد ہیں، تکلیفیں ہیں، جو تم نے دیکھ بھی لی ہیں، کوہِ قاف واپس لوٹ آؤ، تو سویرا جواب دیتی ہے کہ مانا کہ کوہِ قاف میں دکھ درد تکلیفیں نہیں ہیں، ہر چیز کی فراوانی ہے لیکن وہاں زندگی صرف اپنے لئے ہوتی ہے جبکہ زمین پر دوسروں کے لئے جینا پڑتا ہے۔ اصل زندگی وہ ہے جو دوسروں کے لئے گزاری جائے۔ دنیا میں دکھ درد ضرور ہیں لیکن اس میں جو مزہ اور لذت ہے وہ کوہِ قاف میں کہاں؟ اس لئے میں واپس نہیں جاؤں گی اور ہمیشہ کے لئے یہاں رہوں گی۔ اگلی صبح جب وہ اٹھتی ہے، تو دیکھتی ہے کہ اس کے نرم و نازک پَر جھڑ چکے ہیں۔ یوں کوہِ قاف سے اس کا رشتہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جاتا ہے اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے کونپل کے ساتھ اُن کے گھر میں ہنسی خوشی رہنے لگتی ہے۔ اس طرح یہ کہانی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

غرض اس ناولٹ کا مطالعہ دنیا کے دل فریب حُسن ، انسانی رویوں کے باہمی کرب اور انسانی رشتوں کی خوب صورتی کے شعور کو اُجاگر کرتا ہے اور یہی اس کا مرکزی خیال ہے۔

فکری جائزہ:

''تتلیوں کا میلہ'' میں جہاں خوب صورت اور رنگ برنگی تتلیوں کی باتیں ہیں، وہاں بچوں کے لئے بہت سی نصیحتیں اور سبق آموز واقعات بھی ہیں۔ راہیؔ نے اس ناولٹ میں دنیا کے حسن و خوب صورتی ، اس سے وابستہ دکھ سکھ اور انسانی رشتوں کے جذبات و احساسات کو خوب صورت الفاظ کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے ہمیں صرف تتلیوں کے دیس کی سیر ہی نہیں کروائی ہے بلکہ اس کی آڑ میں انسانی دنیا کی حقیقی تصویر بھی ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ ناولٹ میں جب سویرا پری اپنے ساتھ نیلی تتلیوں کو کوہ قاف لے جانا چاہتی ہیں تو تانبا تتلیاں عین درمیان میں آ کر انہیں جانے سے روکتی ہیں۔ کیونکہ وہ بہادر اور طاقتور ہوتی ہیں اس لئے نیلی کمزور تتلیوں کو ڈرپوک کہہ کر ان پر دھاوا بول دیتی ہیں اور سویرا پری سے کہتی ہیں:

> ''آپ کے ساتھ جانے کا حق صرف ہمیں پہنچتا ہے۔ ہم بہادر اور مضبوط تتلیاں ہیں۔ یہ بزدل اور ڈرپوک تتلیاں ہیں۔'' (۲۴)

مزید آگے کہتی ہیں:

> ''ہم انہیں نہیں جانے دیں گی، تانبا تتلی نے دو چار اور نیلی تتلیوں کو دھکیلتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے پَر پھڑ پھڑا کر اور انٹینے ہلا کر اپنی باقی ہم قبیلہ تتلیوں کو اشارہ کیا۔'' (۲۵)

یوں ساری تانبا تتلیاں اکٹھی ہو کر نیلی تتلیوں کو بھگا دیتی ہیں اور خود کوہ قاف جانے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ یہی حال انسانوں کا بھی ہے۔ جو ذرا سا بھی با اختیار اور طاقتور ہوتا ہے، اپنے سے کمزور لوگوں کا حق مارتا ہے۔ دولت و اقتدار

کے نشے میں سب کچھ کر گزرتا ہے۔

راہیؔ اس ناولٹ میں انسانی دوستی کو ایک مقدم اور اٹوٹ رشتہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ دوستی، جو حقیقت میں دل کا رشتہ ہے، یہ اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ جب ایک دفعہ کسی کے ساتھ استوار ہو جائے، تو پھر عمر بھر قائم رہتا ہے۔ سویرا کو جب اس کی خالہ واپس کوہ قاف زبردستی لے کر جاتی ہے، تو اُسے رخصت کرتے ہوئے کونپل کہتی ہے:

> ''سویرا! کسی کے مل جانے پر اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنا دکھ اس کے بچھڑنے سے ہوتا ہے۔ اس لئے جتنی جلدی ہو سکے، واپس آنا اور ضرور آنا''۔(۲۶)

سویرا کوہ قاف جا کر بھی کونپل اور ننھے بونے کو نہیں بھولتی اور ان کی محبت میں ایک دفعہ پھر زمین کا رخ کرتی ہے۔ لیکن غلطی سے وہ کونپل کے گھر کا راستہ بھول کر کسی اور کنول نامی لڑکی کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ ان کے گھر میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد جب کونپل کو خواب میں دیکھتی ہے تو بے چین اور بے قرار ہو کر اس کی تلاش میں نکل جاتی ہے۔ آخر کار اُسے اُس کا گھر مل جاتا ہے، وہاں پہنچ کر کیا دیکھتی ہے کہ کونپل اس کا انتظار کرتے کرتے اور اس کے لئے اسٹابریاں چنتے چنتے پہاڑی سے گر کر جان دے دیتی ہے۔ اس موقع پر کونپل کی ماں سویرا کو کہتی ہے:

> ''بیٹی تم نے بہت دیر کر دی۔ تمہاری کونپل تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے اور تمھارے لئے اسٹابریاں چنتے چنتے پہاڑی سے گر کر کوہ قاف سے بھی دور نکل گئی ہے۔''(۲۷)

یہ سُن کر سویرا پاگلوں کی طرح کونپل کو پکارتی ہے کہ کونپل، کونپل، کونپل! اور اس کی بند مٹھی کو کھول کر دیکھتی ہے تو بے ہوش ہو جاتی ہے:

> ''سویرا نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سرد ہاتھ کو اپنے نیم گرم ہاتھوں میں تھاما اور اس کی مٹھی کھولی۔ مٹھی سے کچھ کھٹی میٹھی اسٹابریاں نیچے گر پڑیں۔''(۲۸)

علاوہ ازیں، راہیؔ اس ناولٹ میں ہماری توجہ معاشرے کے ایک اہم مسئلے کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ ہمارے معاشرے میں کنول کی طرح بے شمار لڑکیاں اپنی سوتیلی ماؤں کی وجہ سے ذلالت کی زندگی گزار رہی ہیں جو اُن پر ظلم وستم کرتی ہیں۔ دن رات ان سے گھر کا سارا کام کرواتی ہیں اور اُن کا جینا دوبھر کرتی ہیں حالانکہ یہی لڑکیاں بعد میں ان کی زندگی کا سہارا بنتی ہیں۔

ایک دفعہ کنول گھر کا سارا کام کاج کر کے ڈھیر سارے برتن دھو کر رکھتی ہے کہ اچانک اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور سارے برتن زمین پر گر جاتے ہیں۔ چند ایک برتن ٹوٹ بھی جاتے ہیں، جنہیں دیکھ کر کنول کی سوتیلی ماں اُس پر اس انداز میں چیختی ہیں:

> ''کم بخت! نمک حرام! یہ تم نے کیا کر دیا۔ ایک آن میں کئی دنوں کی کمائی خاک میں ملا دی''۔ کنول کو

کراہتا دیکھ کر اس کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ ایک تو اتنا نقصان کر دیا، اوپر سے مکر بھی کر رہی ہے۔ چل
اُٹھ!(۲۹)

جب کنول کی یہی ماں اولاد کی نعمت سے محروم ہو جاتی ہے اور ڈاکٹر اُسے جواب دے دیتے ہیں کہ اب وہ کبھی بھی ماں نہیں بن سکتی تو کنول بیماری کے دوران اس کی خوب تیمارداری اور دلجوئی کرتی ہے، جس سے سوتیلی ماں کو اپنی زیادتیوں کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ کنول کو اپنی سگی بیٹی سمجھنا شروع کر دیتی ہے اور کہتی ہے:

''کنول بیٹی! اللہ میاں نے مجھے بیٹا دیا اور چھین لیا اور اب ڈاکٹر کہتے ہیں، میں کبھی بھی ماں نہیں بن سکتی''۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے پُر ہو گئیں۔ ''لیکن ناشکری نہیں ہوں۔ اللہ نے مجھے تجھ جیسی بیٹی دی ہے جو ہیرے و جواہرات میں تلنے کے قابل ہے''۔(۳۰)

راہیؔ انسانی رویوں اور جذبات کے صحیح نباض ہیں۔ تب ہی وہ یہاں ہر دو صورتوں میں ایک ہی انسان کے دو مختلف روپ اور جذبات کو بڑی خوب صورتی سے بیان کرتے ہیں۔

اسی طرح جب کونپل سویرا کو مردہ تتلیوں کی لاشوں سے سجا ہوا ایک البم دکھاتی ہے تو سویرا اُس میں اپنی سہیلیوں کی لاشوں کو دیکھ کر غصے سے اُسے پانی میں پھینکتی ہے، جس پر کونپل اُس سے ناراض ہو جاتی ہے۔ بعد میں سویرا کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے کہ کونپل نے اُسے خوش کرنے کے لئے یہ البم دکھایا تھا، ورنہ وہ دل کی بُری نہیں۔ یہ ساری باتیں وہ پیاتتلی سے شیئر کرتی ہیں جس پر پیاتتلی کہتی ہے:

''میں جانتی ہوں'' پیاتتلی گویا ہوئی''۔ ''شوق انسانوں کو ہی نہیں، جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کو بھی اندھا کر دیتا ہے۔ اب چیونٹی ہی کو دیکھو، وہ ہمارے ریشمی بچوں کو لے جا کر ان سے دودھ حاصل کرتی ہے اور......!(۳۱)

مزید راہیؔ بتاتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں اپنی شوق کی خاطر کیا کیا کرتا ہے، نہ صرف با اختیار ہونے کی صورت میں اپنی طاقت کا بے دریغ استعمال کرتا ہے، بلکہ دولت کی لالچ وحرص میں دوسروں کا حق مارتا ہے اور کسی کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

جب پیاتتلی سویرا سے وعدہ کرتی ہے کہ تم اپنی سہیلی کو مناؤ۔ وقت ضائع نہ کرو اور اُسے کل اپنے ساتھ لاؤ۔ میں اُسے اس کے البم سے زیادہ خوب صورت تتلیوں کا البم دکھاؤں گی، تو سویرا کو یقین نہیں آتا کہ اتنی چھوٹی سی تتلی اتنا بڑا کام کیسے کر سکتی ہے۔ جسے بھانپ کر پیاتتلی اُسے دو نصیحتیں کرتی ہیں:

''سویرا بہن! کسی کو چھوٹا سمجھ کر اُسے ناکارہ مت سمجھو۔ دوسرے، دنیا میں سب سے قیمتی چیز وقت ہے، اپنا بیش قیمت وقت، ضائع نہ کرو اور اسی لمحے اپنی ناراض سہیلی کے پاس لوٹ چلو۔ یاد رکھو، جو لمحہ ایک بار گزر جاتا ہے وہ پلٹ کر کبھی نہیں آتا۔''(۳۲)

شجاعت علی راہیؔ اس ناولٹ میں زندگی کے فانی ہونے اور دنیا کی بے ثباتی کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ دنیا دکھوں اور غموں کی آماجگاہ ہے بلکہ یہاں کی زندگی چندروزہ ہے اور انسان کسی بھی وقت لقمہ اجل بن سکتا ہے۔اس بارے میں وہ ایک پتنگا نما تتلی کی مثال دیتے ہیں۔ جسے اچانک ایک مینڈک نگل لیتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''پتنگوں اور تتلیوں کو تو چاہئے تھا.....''
>
> سویرا اتنا ہی بولی تھی کہ ایک مینڈک نے اُچھل کر پتنگا نما تتلی یا تتلی نما پتنگا کو اپنے چوڑے مُنہ میں بھر لیا اور فوراً اسے نگل لیا۔
>
> اس چھوٹے سے موٹے، بدنما جانور کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے سویرا کو کنول کی نئی امی یاد آ گئی۔
>
> سویرا نے اُداسی سے سوچا کہ ابھی چند لمحوں پہلے جو دلکش چیز اس سے محوِ کلام تھی اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی ہے اور تتلیوں یا پتنگوں کی شکایت کرنے کے قابل بھی نہیں رہی ہے۔
>
> کیا زندگی اسی تلخ حقیقت کا نام ہے؟
>
> آس پاس کہیں ایک کوئل کو کی۔ یوں لگا جیسے وہ زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا نوحہ سنا رہی ہو۔''(۳۳)

اس کے علاوہ راہی حکمران تتلی کی زبانی بچوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ پھول باغ کی خوب صورتی کا باعث ہوتے ہیں۔اس لئے انہیں توڑنا نہیں چاہیے، لکھتے ہیں:

> ''تمھیں اُسے کہنا ہوگا کہ وہ پھولوں کو توڑا نہ کرے۔ پھول تو باغوں، مرغزاروں اور جنگلوں کی بہار ہوتے ہیں اور نہ جانے کتنی تتلیاں، کتنے پتنگے اور کتنے بھنورے اُن کا شہد بھرا رس پی کر مستی سے جھومتے اور رقص کرتے ہیں۔''(۳۴)

مزید برآں راہیؔ یہ بھی بتاتے ہیں کہ دوسروں کے لئے تکلیف اُٹھانا باعث راحت و مسرت ہوتا ہے، اس لئے دوسروں کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہونا چاہیے، اُن کا سہارا بن کر انہیں اپنی خوشیاں دے کر زندگی کو پر رونق اور پر سکون بنانا چاہیے۔

ناولٹ میں جب سویرا کنول کے ساتھ باغ میں جا کر گلدستوں کے لئے پھول چُنتی ہے، تو ایک تیز کانٹا اس کے نازک انگوٹھے میں چبھ جاتا ہے، جس پر کنول پریشان ہو کر اُسے پھول چُننے سے منع کرتی ہے، جبکہ دوسری طرف سویرا اس کے لئے تکلیف اُٹھا کر خوشی محسوس کرتی ہے:

> ''سویرا کے گلابی لبوں پر ایک ہلکی سی مسکان نمودار ہوئی، اس نے کہا'' کانٹا جب کسی اور کے لئے چبھتا ہے تو وہ تکلیف نہیں، راحت بخشتا ہے۔''(۳۵)

راہیؔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنے کا درس بھی دیتے ہیں کہ ہم انسان اپنی زندگی میں کسی بھی حال میں خوش نہیں

رہتے۔ حالانکہ اللہ تو ہم سب پر بہت مہربان ہے۔ جب کنول زندگی کو ایک مسلسل نہ ختم ہونے والے دکھ سے تعبیر کرتی ہے اور زندگی سے بیزاری کا اظہار کر کے کوہ قاف میں پناہ لینے کا سوچتی ہے تو سویرا اُسے مثبت انداز سے سوچنے کی تلقین کرتی ہے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری مت کرو بلکہ اس کا شکر ادا کرو۔ سویرا کہتی ہے:

''کیا تم نے کبھی نہیں سوچا کہ تم اندھی، بہری، لنگی، لولی بھی ہوسکتی تھیں، تپتے ہوئے صحراؤں میں بھی رہ سکتی تھیں، تتلیوں کی طرح کمزور اور مکڑی کے جالے میں پھنس جانے والے کیڑے مکوڑوں کی طرح بے بس بھی ہوسکتی تھیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ تمہارا خدا تم پر مہربان ہے''۔(۳۶)

آخر میں راہیؔ علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے(۳۷)

سویرا پری کی زبانی بہت خوب صورت انداز میں نثری شکل میں اپنا پیغام دیتے ہیں کہ زندگی دوسروں کے لئے جینے کا نام ہے۔ جب ستارہ پری سویرا کو واپس کوہ قاف بلاتی ہے اور کہتی ہے کہ اب دنیا کے غم اور دکھ و درد دیکھ کر تم سمجھ دار ہو چکی ہوگی کہ واقعی یہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس موقع پر سویرا کا جواب ملاحظہ ہو:

''جی ہاں'' سویرا نے جواب دیا'' میں نے دنیا اور اس کے دکھوں کو عقل اور جذبے کی خوردبین لگا دیکھ لیا ہے، اور میں نے زندگی کا راز پالیا ہے۔
زندگی وہ ہے جو دوسروں کے لئے ہے۔
درخت اپنا پھل خود نہیں کھاتے۔
پھول اپنے آپ کو نہیں سونگھتے
دریا اپنا پانی خود نہیں پیتے
یہ پھل، یہ پھول، یہ پانی...... یہ بہاریں، یہ تتلیاں
یہ انسان...... سب ایک دوسرے کے لئے ہیں''۔(۳۸)

سویرا اپنی ماں کے ساتھ یہ کہہ کر کوہ قاف واپس پلٹ کر نہیں جاتی کہ کوہ قاف خوب صورت ہی سہی، لیکن اُس میں رنگا رنگی نہیں ہے۔ دنیا میں خوب صورت رنگوں کے ساتھ ساتھ بدصورت رنگ بھی ہیں۔ جن کی مدد سے اس نے خوب صورت رنگوں کو پہچانا، مانا کہ کوہ قاف میں خوشیاں اور مسرتیں ہی مسرتیں ہیں لیکن اس میں پریاں صرف اپنی لئے ہی زندگی جیتی ہیں وہ کہتی ہیں:

''لیکن کوہ قاف میں پریاں صرف اپنے لئے رہتی ہیں۔ دنیا میں لوگ دوسروں کے لئے رہتے ہیں۔
مجھے کوہ قاف نہیں دنیا چاہئے۔''(۳۹)

رہتے۔ حالانکہ اللہ تو ہم سب پر بہت مہربان ہے۔ جب کنول زندگی کو ایک مسلسل نہ ختم ہونے والے دکھ سے تعبیر کرتی ہے اور زندگی سے بیزاری کا اظہار کر کے کوہ قاف میں پناہ لینے کا سوچتی ہے تو سویرا اُسے مثبت انداز سے سوچنے کی تلقین کرتی ہے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری مت کرو بلکہ اس کا شکر ادا کرو۔ سویرا کہتی ہے:

> ''کیا تم نے کبھی نہیں سوچا کہ تم اندھی، بہری، لنگی، لولی بھی ہو سکتی تھیں، تپتے ہوئے صحراؤں میں بھی رہ سکتی تھیں، تتلیوں کی طرح کمزور اور مکڑی کے جالے میں پھنس جانے والے کیڑے مکوڑوں کی طرح بے بس بھی ہو سکتی تھیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ تمہارا خدا تم پر مہربان ہے''۔(۳۶)

آخر میں راہی علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے(۳۷)

سویرا پری کی زبانی بہت خوب صورت انداز میں نثری شکل میں اپنا پیغام دیتے ہیں کہ زندگی دوسروں کے لئے جینے کا نام ہے۔ جب ستارہ پری سویرا کو واپس کوہ قاف بلاتی ہے اور کہتی ہے کہ اب دنیا کے غم اور دکھ درد دیکھ کر تم سمجھدار ہو چکی ہوگی کہ واقعی یہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس موقع پر سویرا کا جواب ملاحظہ ہو:

> ''جی ہاں'' سویرا نے جواب دیا ''میں نے دنیا اور اس کے دکھوں کو عقل اور جذبے کی خوردبین لگا دیکھ لیا ہے، اور میں نے زندگی کا راز پالیا ہے۔
> زندگی وہ ہے جو دوسروں کے لئے ہے۔
> درخت اپنا پھل خود نہیں کھاتے۔
> پھول اپنے آپ کو نہیں سونگھتے
> دریا اپنا پانی خود نہیں پیتے
> یہ پھل، یہ پھول، یہ پانی...... یہ بہاریں، یہ تتلیاں
> یہ انسان...... سب ایک دوسرے کے لئے ہیں''۔(۳۸)

سویرا اپنی ماں کے ساتھ یہ کہہ کر کوہ قاف واپس پلٹ کر نہیں جاتی کہ کوہ قاف خوب صورت ہی سہی، لیکن اُس میں رنگا رنگی نہیں ہے۔ دنیا میں خوب صورت رنگوں کے ساتھ ساتھ بدصورت رنگ بھی ہیں۔ جن کی مدد سے اس نے خوب صورت رنگوں کو پہچانا، مانا کہ کوہ قاف میں خوشیاں اور مسرتیں ہی مسرتیں ہیں لیکن اس میں پریاں صرف اپنی لئے ہی زندگی جیتی ہیں وہ کہتی ہیں:

> ''لیکن کوہ قاف میں پریاں صرف اپنے لئے رہتی ہیں۔ دنیا میں لوگ دوسروں کے لئے رہتے ہیں۔ مجھے کوہ قاف نہیں دنیا چاہئے۔''(۳۹)

مجموعی طور پر راہیؔ اس ناولٹ میں محبت، خلوص، پیار سے رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور زندگی گزارنے کے لئے ایک دوسرے کے جذبات واحساسات کو سمجھنے پر زور دیتے ہیں۔

فنی جائزہ:

ناولٹ ''تتلیوں کا میلہ'' ایک رومانی ناولٹ ہے۔ رنگ برنگی تتلیوں کا ذکر، خوب صورت فطری مناظر کا دلکش بیان، کوہ قاف کی ان دیکھی دنیا کا حسن اور زمین کے خوشبودار ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے، باغ، پھول اور تتلیاں ایک پُر کیف اور مسحور کن نظارہ پیش کرتے ہیں۔ راہیؔ نے الفاظ و بیان کے جوہر دکھانے کے ساتھ معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ کہانی میں ضم کر کے اپنے کمال ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے اور بچوں کو نصیحت کرنے کے ساتھ ساتھ ناولٹ کو بھی فنی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔

پلاٹ:

فنی لحاظ سے اس ناولٹ کا پلاٹ بھی سادہ اور اکہرا ہے۔ کہیں پر بھی مرکب صورت نظر نہیں آتی۔ تمام واقعات ایک دوسرے کے ساتھ زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہانی اس تسلسل اور دلچسپی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے کہ قاری مزید آگے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور کہیں پر بھی بوریت محسوس نہیں کرتا۔ ناولٹ ''باغی چیونٹیوں'' کے پلاٹ میں اگر چہ واقعات منظم اور مربوط طور پر آگے بڑھتے ہیں، لیکن اس کی نسبت ناولٹ ''تتلیوں کا میلہ'' میں دلچسپی کا عنصر زیادہ غالب ہے، جیسے سویرا کا کوہ قاف سے زمین پر اُترنا، یہاں کونپل کے ساتھ اس کا ملاقات کرنا، پھر دونوں کا آپس میں ناراض ہو جانا، سویرا کی خالہ کا اُسے زبردستی کوہ قاف لے جانا، پھر سویرا کا اپنی امیؔ سے ضد کر کے دوبارہ زمین پر آنا، اس دفعہ کونپل کے گھر کا راستہ بھول جانا اور ایک نئی جگہ پر اُترنا، وہاں سے کنول کا سراغ ملنا، اس کے ساتھ دوستی بنا کر اس کے گھر جانا، پھولوں کے گلدستے بنا کر بیچنا، سویرا کا کونپل کو خواب میں دیکھنا، اُس کا بے چین ہو کر اس کی تلاش میں نکلنا، کونپل کے گھر پہنچ کر اس کی لاش کو دیکھنا اور پھر ہمیشہ کے لئے کوہ قاف نہ جانے کا فیصلہ کرنا، آخر میں اس کے نرم وملائم و نازک پروں کا جھڑ جانا۔ یہ تمام واقعات ایسے ہیں جو شروع سے لے کر آخر تک اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہیں۔

کردار نگاری:

جہاں تک اس ناولٹ کے کرداروں کا تعلق ہے تو اس میں مافوق الفطرت مخلوق جیسے کچھ پریوں کے کردار ہیں۔ جس میں ستارہ پری، سویرا پری اور خالہ نیلوفر کے کردار شامل ہیں۔ اس کے علاوہ چند پرندوں، مگر مچھ، مینڈک اور رنگ برنگی تتلیوں کا بھی ذکر موجود ہے۔ کچھ انسانی کردار بھی ہیں جیسے کونپل، کونپل کی باجی کوئل، اس کی امی اور چھوٹا بھائی بُونا منا وغیرہ۔

مجموعی طور پر راہیؔ اس ناولٹ میں محبت، خلوص، پیار سے رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور زندگی گزارنے کے لئے ایک دوسرے کے جذبات واحساسات کو سمجھنے پر زور دیتے ہیں۔

فنی جائزہ:

ناولٹ ''تتلیوں کا میلہ'' ایک رومانی ناولٹ ہے۔ رنگ برنگی تتلیوں کا ذکر، خوب صورت فطری مناظر کا دلکش بیان، کوہ قاف کی ان دیکھی دنیا کا حسن اور زمین کے خوشبودار ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے، باغ، پھول اور تتلیاں ایک پُر کیف اور مسحور کن نظارہ پیش کرتے ہیں۔ راہیؔ نے الفاظ و بیان کے جوہر دکھانے کے ساتھ معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ کہانی میں ضم کر کے اپنے کمال ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے اور بچوں کو نصیحت کرنے کے ساتھ ساتھ ناولٹ کو بھی فنی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔

پلاٹ:

فنی لحاظ سے اس ناولٹ کا پلاٹ بھی سادہ اور اکہرا ہے۔ کہیں پر بھی مرکب صورت نظر نہیں آتی۔ تمام واقعات ایک دوسرے کے ساتھ زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہانی اس تسلسل اور دلچسپی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے کہ قاری مزید آگے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور کہیں پر بھی بوریت محسوس نہیں کرتا۔ ناولٹ ''باغی چیونٹیوں'' کے پلاٹ میں اگر چہ واقعات منظم اور مربوط طور پر آگے بڑھتے ہیں، لیکن اس کی نسبت ناولٹ ''تتلیوں کا میلہ'' میں دلچسپی کا عنصر زیادہ غالب ہے، جیسے سویرا کا کوہ قاف سے زمین پر اُترنا، یہاں کونپل کے ساتھ اس کا ملاقات کرنا، پھر دونوں کا آپس میں ناراض ہو جانا، سویرا کی خالہ کا اُسے زبردستی کوہ قاف لے جانا، پھر سویرا کا اپنی امیّ سے ضد کر کے دوبارہ زمین پر آنا، اس دفعہ کونپل کے گھر کا راستہ بھول جانا اور ایک نئی جگہ پر اُترنا، وہاں سے کنول کا سراغ ملنا، اس کے ساتھ دوستی بنا کر اس کے گھر جانا، پھولوں کے گلدستے بنا کر بیچنا، سویرا کا کونپل کو خواب میں دیکھنا، اُس کا بے چین ہو کر اس کی تلاش میں نکلنا، کونپل کے گھر پہنچ کر اس کی لاش کو دیکھنا اور پھر ہمیشہ کے لئے کوہ قاف نہ جانے کا فیصلہ کرنا، آخر میں اس کے نرم وملائم و نازک پروں کا جھڑ جانا۔ یہ تمام واقعات ایسے ہیں جو شروع سے لے کر آخر تک اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہیں۔

کردار نگاری:

جہاں تک اس ناولٹ کے کرداروں کا تعلق ہے تو اس میں مافوق الفطرت مخلوق جیسے کچھ پریوں کے کردار ہیں۔ جس میں ستارہ پری، سویرا پری اور خالہ نیلوفر کے کردار شامل ہیں۔ اس کے علاوہ چند پرندوں، مگر مچھ، مینڈک اور رنگ برنگی تتلیوں کا بھی ذکر موجود ہے۔ کچھ انسانی کردار بھی ہیں جیسے کونپل، کونپل کی باجی کوئل، اس کی امی اور چھوٹا بھائی بوٹا منا وغیرہ۔

کنول اور کنول کے والدین کے کردار بھی اہمیت کے حامل ہیں جبکہ مرکزی کردار سویرا پری کا ہے۔

پورے ناولٹ کی کہانی ''سویرا'' کے گرد گھومتی ہے جبکہ باقی سارے کردار ضمنی طور پر کہانی میں شامل کیے گئے ہیں۔ کہانی کے تمام کردار بچوں کی دلچسپی کے مطابق تخلیق کیے گئے ہیں کیونکہ بچے پریوں کی دنیا کوہ قاف، ان کے خوب صورت اور نرم و نازک پروں اور ہوا میں ان کی پرواز میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس لئے اس ناولٹ کے پڑھنے میں وہ ایک تجسس اور لذت محسوس کرتے ہیں۔ ان کا تخیل بلندیوں کی سمت مائل پرواز ہو جاتا ہے۔ راہیؔ نے تمام کرداروں کو بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ڈھالا ہے۔ جذبات نگاری سے کہانی میں شدت تاثر پیدا کر کے بچوں کی دلچسپی اور شوق کو اُبھارا ہے۔

مکالمہ نگاری:

ناولٹ میں چونکہ مرکزی کردار بچوں کے ہیں۔ اس لئے راہیؔ نے انہی کے لب و لہجے میں مکالمے اس انداز سے ضبطِ تحریر لائے ہیں جو فطری معلوم ہوتے ہیں اور بچوں کے لئے خوشی، تفریح اور باعث مسرت ہونے کے ساتھ ساتھ معلوماتی بھی ہیں۔ مثلاً جب نیلوفر پری سویرا کو واپس کوہ قاف لے جانے کے لئے آتی ہے:

''سویرا بیٹی! اب ذرا اپنے پر سمیٹو اور گھر چلنے کی تیاری کرو۔''

لفظ گھر سے سویرا کے ذہن میں ایک سوال اُبھرا!......

''گھر؟ کونسا گھر؟ کو نپل کا گھر یا کوہ قاف والا گھر؟

مگر جلد ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا ''خالہ،

میں نے تو ابھی یہاں کچھ دیکھا ہی نہیں، مجھے چند دن اور یہیں رہنے دیجئے''۔

''کچھ دیکھا ہی نہیں!'' نیلوفر حیرت زدہ ہو کر بولی ''کل سے اب تک تو ہم

نے یہاں سینکڑوں چیزیں دیکھ لی ہیں۔''

سویرا کو نہیں معلوم تھا کہ اس کی خالہ کل سے اس کی ایک ایک حرکت کی کڑی نگرانی کرتی رہی تھی۔

''پلیز خالہ، مجھے بس دو تین روز اور یہاں رہنے دیں۔''

دو تین روز! تمہاری امی تمہارے ایک دن یہاں ٹھہر جانے پر بھی سخت

ناراض ہو رہی ہوگی اور تم دو تین روز کی بات کرتی ہو!''۔

''پلیز خالہ، بس ایک دن اور''

''کیا تم نے اپنی امی سے میرے پر تڑوانے ہیں۔

چلو اپنی سہیلی کو خدا حافظ کہو اور پر تولو''۔(۳۰)

اس قسم کے مکالموں سے بچے نہ صرف محظوظ اور لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ ان میں تجسس کا مادہ بھی پیدا ہوتا ہے اور ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

منظر نگاری:

پورے ناولٹ پر چونکہ ایک رومانی فضا چھائی ہوئی ہے، اس لئے کہ ناولٹ کی منظر نگاری میں راہیؔ نے خوب صورت، برمحل اور رومانیت سے بھرپور الفاظ کا استعمال کر کے اِن میں حسین رنگ بھرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔
جب سویرا کونپل کو اس کے البم سے زیادہ، خوب صورت جاندار تتلیوں کا البم دکھانے کے لئے لے جاتی ہے تو راہیؔ حسین تتلیوں کے نمودار ہونے اور ان کے رقص کو اس خوب صورتی سے منظر پر لاتے ہیں کہ قاری داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ملاحظہ ہو:

> ''ابھی کونپل نے جملہ مکمل نہیں کیا تھا کہ چھنا کے کی ایک ہلکی سریلی آواز کے ساتھ خشک پتوں کے ڈھیر میں سے جیسے ایک دم سینکڑوں دھنکیں کھل اُٹھیں۔
> تیز خوب صورت رنگ، دھوپ کی رسیلی کرنوں میں سے ایسے یک بیک اُبھرے کہ ایک لمحے کے لئے تو سویرا اور کونپل کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ انہیں یوں لگا جیسے ہری ہری گھاس میں سے ایک رنگا رنگ سورج طلوع ہو رہا ہے۔
> چند لمحوں میں یہ رنگ بکھر کر پورب پچھم اُتر دکھن ہر جانب پھیل گئے اور فضا ایک رنگین طویل و عریض چادر کے روپ میں ڈھل گئی۔
> سویرا اور کونپل فضا میں رقص کرتے دلفریب رنگوں کو انتہائی دلچسپی اور مسرت سے دیکھ رہی تھیں۔
> سینکڑوں تتلیوں کا اس طرح بیک وقت رقص کرنا اور سورج کی کرنوں میں آنکھ مچولی کھیلنے کا یہ دلکش منظر کونپل کے البم سے کہیں زیادہ حسین تھا۔''(۴۱)

اس کے علاوہ راہیؔ نے تتلیوں کی پیدائش کا عمل بہت حسین پیرائے میں تتلیوں کی زبانی بیان کیا ہے جو ایک طرف زبان و بیان کے لحاظ سے ایک منفرد شاہکار معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف بچوں کے لئے معلومات کا بہترین ذریعہ بھی ہے کہ تتلیاں کس طرح جنم لیتی ہیں؟ ملاحظہ ہو:

> ''نئی جگہ اور نئے موسم میں ہمارے انڈوں سے لاروے سر نکالتے ہیں' جو بعد میں ریشمی کیڑے بن جاتے ہیں۔ یہ ریشمی کیڑے اپنے اردگرد نرم و ملائم ریشم تان کر کسی جھاڑی یا شاخ پر دنیا و مافیہا سے بے خبر گھوڑے بیچ کر سو جاتے ہیں۔ بظاہر تو یہ غیر متحرک ہوتے ہیں لیکن اندر ہی اندر جوان ہوتے رہتے ہیں۔ پھر ایک سہانی صبح جب پھولوں کا خوشبو سے لدا ہوا ایک جھونکا مژدۂ بہار لاتا ہے تو ریشمی غلاف کے اندر سے ایک حسین و جمیل تتلی اپنی تمام تر رنگینیوں اور حشر سامانیوں سمیت نمودار ہو کر پھر سے ہوا

میں اڑ جاتی ہے اور یوں دنیا کے حسن میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے''۔(۴۲)

اسلوب اور زبان و بیان:

ناولٹ ''تتلیوں کا میلہ'' کا اسلوب رومانی اور شعری ہے۔ چونکہ کہانی کے موضوع کی بنیاد انسانی جذبات پر استوار کی گئی ہے اور اس میں فطرت کی بوقلمونیوں اور جمالیاتی کیفیات کا ذکر ہے، اس لئے اسے لطیف پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ جہاں ''باغی چیونٹیاں'' میں موضوع کے اعتبار سے اسلوب خطیبانہ ہے وہاں ''تتلیوں کا میلہ'' میں اسلوب شاعرانہ آہنگ کا حامل ہے۔ناولٹ میں کئی جگہوں پر ہندی الفاظ کا بھی حسین امتزاج ملتا ہے ۔ضرورت کے مطابق تشبیہات واستعارات کو بھی کام میں لایا گیا ہے جس سے تحریر کی معنویت اور گہرائی میں اضافہ ہوا ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''تتلیوں کا میلہ'' شجاعت علی راہیؔ کا زبان و بیان کے لحاظ سے بہترین شعوری کوشش کا نتیجہ ہے اور ناولٹ کے فنی تقاضوں سے ہم آہنگ ایک بہترین تخلیق ہے۔اس بارے میں کاظم رشید کاظم روزنامہ ''بے باک'' میں لکھتے ہیں:

> ''شجاعت علی راہیؔ ملک کے معروف شاعر اور ادیب ہیں۔ ذہانت ان کی آنکھوں سے عیاں ہے۔ وہ بچوں اور نئی نسل کو اردو کی شیرینی سے باخبر کرنا چاہتے ہیں۔اس لئے ناولٹ میں خوب صورت الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ان کی تحریر میں پختگی، زورِ بیان اور رعنائی پائی جاتی ہے۔''(۴۳)

اپنے اسی تبصرے میں وہ ناولٹ کے مقصد کے بارے میں مزید فرماتے ہیں:

> ''تتلیوں کا میلہ'' پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ناولٹ محض ہنسی اور خوش گپیوں کا نام نہیں بلکہ اصلاح معاشرہ کا نام بھی ہے۔ کتاب میں محبت کی قوسِ قزح، چاندنی کے رنگوں سے دل کش سماں کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔اُنھوں نے ناولٹ کے ذریعے تصویر کائنات کی بے رنگ لکیروں میں محبت و چاہت کے جو رنگ بھرے ہیں، وہ ہر منظر کو رنگین کر دیتا ہے۔(۴۴)

کاظم رشید کاظم کے اس تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناولٹ ''تتلیوں کا میلہ'' زبان و بیان اور مقصدیت کے اصلاحی پہلو کے حوالے سے ناولٹ نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

۳۔ ڈائناسور کیوں غائب ہو گئے؟

شجاعت علی راہیؔ کا تیسرا ناولٹ، ڈائناسور کیوں غائب ہو گئے؟ کے نام سے موسوم ہے۔اپنے پچھلے دو ناولٹوں ''باغی چیونٹیاں'' اور ''تتلیوں کا میلہ'' کے برعکس یہ ناول موضوع کے اعتبار سے الگ نوعیت اور معلومات کا حامل ہے ۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ ایک تحقیقی، سائنسی اور تاریخی موضوع ہے، چنانچہ راہیؔ نے اس ناولٹ میں ڈائناسوروں کا دنیا پر حکمرانی کے دور سے لے کر آج تک کے انسانوں کے دور کا جائزہ لیا ہے۔ایک طرح سے ۱۵ کروڑ برس کی طویل مدت کو

ایک مختصری کتاب میں سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس مقصد کے لئے راہیؔ نے ڈائنا سوروں کے بارے میں بنیادی معلومات سے متعلق انسائیکلوپیڈیا ، "Tell me why??" کی کتاب اور لائبریری کی دیگر کُتب سے استفادہ کر کے حاصل کی ہیں اور حاصل شدہ معلومات کی ترسیل کے لئے ایک کہانی کا سہارا لیا ہے۔

اس ناولٹ میں ڈائنا سوروں کے بارے میں باقاعدہ تحقیق کر کے لفظ ڈائنا سور کا مطلب ،ان کی اقسام ، خصوصیات، زمین پر ان کی حکمرانی اور ان کے عنقا ہونے کی وجوہات تحریر کیے گئے ہیں اور ساتھ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ معلومات فاسلز (Fossils) کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔مزید برآں دورِ حاضر میں ڈائنا سوروں کے بارے میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، اُسے بھی کہانی کا حصہ بنایا ہے اور یوں ڈائنا سوروں کے بارے میں بہت سی معلومات طلبہ وطلبات تک پہنچائی ہیں۔ڈائنا سوروں کے بارے میں تحقیق کر کے راہیؔ بچوں کو بھی تحقیقی کام کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی اس کائنات میں موجود مختلف چیزوں اور مخلوقات کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں اور مطالعہ کر کے ان کے بارے میں تحقیق کریں۔درحقیقت اس طرح وہ بچوں میں ریسرچ کلچر کے فروغ کو یقینی بنانا چاہتے ہیں۔چنانچہ کتاب کے آغاز میں وہ اس ناولٹ کے مقصد کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''یہ داستان اچھی بری جیسی بھی ہے، اس کے بیان کرنے اور آپ تک پہنچانے کا ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ آپ اس خوبصورت دنیا اور اس کے اندر زندہ مردہ مخلوقات کا گہرا مطالعہ کریں۔ان کے بارے میں تحقیق کریں اور غور کریں کہ خداوند مصور نے کتنی حیرت انگیز اور دل فریب مخلوقات پیدا کی ہیں۔'' (۴۵)

یہی مقصد ہی اس ناولٹ کا مرکزی خیال ہے۔''ڈائنا سور کیوں غائب ہو گئے؟'' کی کہانی بہت انوکھی اور دلچسپ ہے کیونکہ اس کی کہانی میں ایک اور کہانی ہے۔اگرچہ یہ ناولٹ بنیادی طور پر ڈائنا سوروں کے متعلق ایک تحقیق پر مبنی ہے لیکن راہیؔ نے اس تحقیق کو اپنے کمالِ فن سے ایک کہانی کا روپ دے کر کردار (پپو) کے ذریعے ساری معلومات بچوں تک پہنچائی ہیں۔

اس کہانی میں سارے کردار حقیقی ہیں اور یہی اس ناولٹ کی انفرادیت ہے۔راہی بیانیہ انداز اختیار کرتے ہوئے خود (پپو) کی زبانی کہانی سناتے ہیں۔کہانی کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ پپو کے گھر والے پشاور میں خورد ماما کی شادی خانہ آبادی میں شرکت کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔آغا جی (والد) بوجی (والدہ) اور پپو کی چاروں بہنیں فرحانہ، ریحانہ، صباحت اور فرزانہ بھی ساتھ میں جاتی ہیں، جبکہ چاروں بھائی لالا، لالا گل، شیریں لالا اور پپو، ملازم غلام جان کے ساتھ گھر پر رہ جاتے ہیں۔غلام جان بھی موقع پا کر جُوا کھیلنے کے لئے کھسک جاتا ہے اور یوں گھر پر چاروں بھائیوں کا راج

ہوجاتا ہے۔تنہائی کوغنیمت جان کرسب کے دل میں کچھ نیا کرنے کا خیال جنم لیتا ہے۔شیریں لالا کہتے ہیں کیوں نا آج روحوں کو بُلا لیا جائے۔ چنانچہ روحیں بُلانے کا جو طریقہ پپو نے سیکھا تھا، اس کے مطابق رُوح بلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس مقصد کے لئے ایک کیرم بورڈ میں ''اے سے ی'' تک کے تمام حروف تہجی لکھ دیئے جاتے ہیں۔ پھر اس کے درمیان ایک شیشے کا گلاس اوندھے مُنہ رکھا جاتا ہے۔تھوڑی دیر بعد اچانک گلاس میں حرکت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے اور کرم بورڈ پر لکھے ہوئے حروف تہجی پر گلاس باری باری لپک کر ایک جملہ بناتا ہے''ڈائنا سور کیوں غائب ہو گئے ؟'' اور پھر اُچھل کر نیچے زمین پر گر جاتا ہے، یہ جملہ پڑھ کر سب ڈر کے مارے کھانا کھائے بغیر سو جاتے ہیں۔

رات کو خواب میں پپو (مصنف) دیکھتا ہے کہ وہ اور اس کے تینوں بھائی پارہ چنار کی خوب صورت وادی میں ایک پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں کہ اچانک پہاڑ لرزنا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ اصل میں کوئی پہاڑ نہیں ہوتا بلکہ ایک ڈائنا سور ہوتا ہے،جس کی پیٹھ پر یہ لوگ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ڈائنا سور انہیں اپنی پیٹھ پر بٹھائے ایک غار کے آگے رک کر انہیں اپنی کمر سے گرا کر اندر دھکیل دیتا ہے اور اس کے دہانے بیٹھ جاتا ہے۔ڈائنا سور کو غار کے دہانے سے ہٹانے کے لئے آگ لگانے کی تجویز پیش کی جاتی ہے۔ چنانچہ لالا گل اپنی بنیان کو آگ لگا کر اُسے ڈائنا سور کی طرف پھینکتا ہے۔ڈائنا سور چیختا ہوا بھاگ جاتا ہے اور سب غار سے نکل کر گھر کی طرف دوڑتے ہیں۔لیکن گھر پہنچ کر اُن کی جان نکل جاتی ہے جب دیکھتے ہیں کہ ڈائنا سور تو گھر کے آنگن میں پہلے سے بیٹھا، ان کا انتظار کر رہا ہے۔ پپو کے مُنہ سے زوردار چیخیں نکل جاتی ہیں جس پر لالا اور شیریں لالا جاگ جاتے ہیں۔ پپو نیند سے جاگ کر خود کو پارہ چنار کی وادی کی بجائے کوہاٹ میں بستر پر پاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ ڈائنا سور کہاں غائب ہو گیا؟ اس دوران وہ چھت پر چھپکلی کو ڈائنا سور کے مشابہ سمجھ کر سہم سا جاتا ہے۔لالا اور شیریں لالا قہقہہ لگا کر اس پر ہنستے ہیں اور اُسے سو جانے کا کہتے ہیں۔

اگلے روز پپو اسکول جا کر اپنے استاد عبدالرزاق سے ڈائنا سوروں کی بابت دریافت کرتا ہے کہ'' ڈائنا سور کیوں غائب ہو گئے؟''۔استاد پہلے تو تعجب کا اظہار کرتے ہیں پھر "Big Bang Theory of Universe" پر روشنی ڈالتے ہوئے زمین پر زندگی کے آثار، رینگنے والے جانوروں یعنی مگر مچھ، ڈائنا سور، چھپکلی اور سانپ وغیرہ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ آج سے کوئی ۱۵ تا ۱۸ کروڑ برس زمین پر ان رینگنے والے جانوروں ''ڈائنا سوروں'' کا راج تھا۔اس کے بعد وہ ان کی لمبائی، وزن، اقسام اور لفظ ڈائنا سور کے معانی بتاتے ہیں کہ اسی اثنا میں تفریح کی گھنٹی بج جاتی ہے اور پپو کا سوال ادھورا رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اگلے روز وہ اپنی خالہ (طلعت نشاط) کے گھر یہ سوال پوچھنے کے لئے جاتا ہے جو ایک شاعرہ اور افسانہ نگار ہوتی ہیں، طلعت خالہ اُسے بتاتی ہے کہ ڈائنا سور غائب نہیں ہوئے ہیں بلکہ انسانوں کی شکل میں ہمارے اردگرد مختلف شکلوں میں اب بھی موجود ہیں لیکن یہ فلسفہ پپو کی سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے اور وہ وہاں سے نا اُمید ہو کر

عبدالسلام ماما کے پاس جاتا ہے، کہ شاید وہ ہی ان کی کچھ مدد کرے۔عبدالسلام ماما اسے جانوروں سے متعلق ایک انسائیکلو پیڈیا کی کتاب دکھاتے ہیں اور بنیادی معلومات بتا کر اُسے جناح میونسپل لائبریری کے لائبریرین کے پاس بھیجتے ہیں کہ وہاں لائبریری میں کتابیں پڑھ کر اس موضوع پر خود تحقیق کر کے مجھے دکھاؤ۔مزید کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے سوال کا جواب پانے کے لئے اچھی تحقیق کروگے، توتمہیں تحفے کے طور پر مفید کتاب ملی گی۔چنانچہ پپو اپنی تحقیق شروع کر دیتا ہے ،ایک دن ریڈیو پاکستان پر ایک پروگرام وقت کی سُرنگ (Time Tunnel) سُنتا ہے، جس میں داخل ہوکر انسان چند صدیاں پیچھے چلا جاتا ہے۔چنانچہ پپو لائبریری کی کتابوں سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر (Time Tunnel) سے آئیڈیا لے کر ایک چھوٹی سی کہانی لکھتا ہے۔اس کہانی میں پپو خود وقت کی سُرنگ میں داخل ہوکر بتدریج منازل طے کرتا ہوا چھ کروڑ برس پہلے کے زمانے میں پہنچ جاتا ہے۔تحقیق کے مطابق چونکہ ڈائناسورز مین پر آج سے کوئی چھ کروڑ برس پہلے ختم ہو چکے ہوتے ہیں، اس لئے پپو بھی وقت کی سُرنگ میں چھ کروڑ برس پہلے کے ماضی میں داخل ہوکر ڈائناسوروں کی دنیا میں پہنچ کر اس عجیب وغریب مخلوق کو دیکھتا ہے، دیکھ کر پہلے تو بہت دہشت زدہ ہوجاتا ہے۔لیکن جب ڈائناسوروں کو اپنے سے بے نیاز پا کر گھاس پھونس کھاتے دیکھتا ہے۔تو اس کا خوف ختم ہوجاتا ہے۔وہ یکھتا ہے کہ ڈائناسور بے تحاشا تیز رفتاری سے سبزہ زاروں کی ہر شے کو ہڑپ کیے جا رہے ہیں۔ یہ دراصل سبزہ خور ڈائناسور ہوتے ہیں۔کہانی کا یہ ابتدائی حصہ لکھ کر پپو عبدالسلام ماما کو دکھاتا ہے جس پر اُسے خوب داد ملتی ہے اور "Tell me Why" کی کتاب بھی تحفے میں مل جاتی ہے۔اس کتاب میں بہت مفید قسم کے معلوماتی سوالات اور ان کے جوابات ہوتے ہیں۔اس کتاب کے دوسرے باب میں ہی اُسے اپنے سوال کا جواب مل جاتا ہے اور ڈائناسوروں کے بارے میں مکمل تحقیقی معلومات حاصل ہوجاتی ہیں، جسے پڑھنے کے بعد عبدالسلام ماما ان سے کچھ سوالات پوچھتے ہیں کہ پپو نے کتاب سے کس حد تک استفادہ کیا ہے، پپو سوالات کے صحیح جوابات دینے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

پپو نے ڈائناسوروں کے بارے میں جو آدھی کہانی پہلے لکھی تھی (جس میں وہ وقت کی سُرنگ میں چھ کروڑ سال پہلے ماضی میں گیا ہوتا ہے)، عبدالسلام ماما اسے مشورہ دیتے ہیں کہ اب اسی سرنگ سے واپس ترتیب وار حال کی طرف واپس لوٹ کر کہانی لکھو۔اس طرح ایک سلسلہ وار تاریخی روداد ترتیب پائی گی، جسے سمجھنا زیادہ آسان ہوجائے گا، چنانچہ پپو آگے کی کہانی یوں لکھتا ہے کہ وہ چھ کروڑ برس پہلے ڈائناسوروں کی دنیا میں مختلف ڈائناسوروں کو گھاس پھونس کھاتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔کچھ گوشت خور ڈائناسور بھی ہوتے ہیں۔رفتہ رفتہ جب موسمی حالات بدل جاتے ہیں اور سبزہ ناپید ہوجاتا ہے تو گوشت خور ڈائناسور اپنے ہی بھائی ڈائناسوروں کو خوراک بنا لیتے ہیں۔یوں ڈائناسوروں کی ایک بڑی تعداد ختم ہوجاتی ہے۔بہت سے ڈائنا سور بھوک اور فاقے سے نڈھال ہوکر مر جاتے ہیں، یہاں تک کہ زمین ان کے لئے

تنگ ہو جاتی ہے کہ اتنے میں ایک اور المیہ رونما ہوتا ہے۔ ایک تیز رفتار دمدار ستارہ میکسیکو کے ایک علاقے چکسولوب میں دھماکے کے ساتھ زمین سے جا ٹکراتا ہے جس کی وجہ سے زمین ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے اور دنیا کی تقریباً ۷۰ فیصد چیزوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ہر سمت زلزلے کی کیفیت سی چھا جاتی ہے، کروڑوں برس تک زمین پر حکمرانی کرنے والے یہ عظیم جانور ڈائنا سور سب کے سب زلزلے کی نذر ہو جاتے ہیں اور کچھ آگ میں جل کر بھسم ہو جاتے ہیں، اس کے بعد پپو ساڑھے چھ کروڑ برس کا مزید واپسی کا سفر طے کر کے دورِ حاضر میں پہنچتا ہے، جس میں ڈائنا سوروں کا نام و نشان تک نہیں ہوتا، صرف سائنس دان ان کے بارے میں تحقیقات کر رہے ہوتے ہیں۔ ۱۸۲۴ء میں ایک سائنس دان ڈائنا سور کے ڈھانچے کو جوڑ کر اسے ''دیو نما چھپکلی'' کا نام دیتا ہے، اسی طرح آگے بڑھ کر ۱۸۶۶ء میں مزید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ گھاس پھونس کھانے والے اور گوشت خور ڈائنا سوروں کے علاوہ کچھ ڈائنا سور ایسے بھی تھے جن کے پَر ہوا کرتے تھے۔ پپو دورِ حاضر میں یہ سب دیکھ کر ڈائنا سوروں کے خاتمے پر شکر ادا کرتا ہے۔

جونہی پپو کہانی مکمل کرتا ہے تو فوراً عبدالسلام ماما کو دکھاتا ہے۔ عبدالسلام ماما خوش ہو کر پپو کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بیٹے! علم کی شمع کو تھامے رکھنا! لفظ بیش قیمت شے ہے۔ اس کی قدر و قیمت کو ہمیشہ نظر میں رکھنا اور دنیا کو اچھے لفظوں اور اچھے خیالوں سے بھرنے کی کوشش کرنا۔ اس نصیحت کے ساتھ کہانی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

فکری جائزہ:

اگرچہ راہی کا ناولٹ ''ڈائنا سور کیوں غائب ہو گئے؟'' ڈائنا سوروں کے بارے میں ایک معلوماتی ریسرچ ہے۔ لیکن راہی نے ان معلومات کو ایک کہانی کے روپ میں پہنچانے کی بہترین سعی کی ہے اور تفریح کے ساتھ ساتھ نہ صرف اپنی تحقیق کو منظر پر لایا ہے بلکہ اس کے علاوہ بچوں کو مختلف نصیحتیں بھی کی ہیں۔ پپو جب خواب دیکھتا ہے کہ ایک ڈائنا سور اسے اور اس کے بھائیوں کو ایک غار میں دھکیل کر خود اس کے دہانے بیٹھ جاتا ہے اور پھر سب اُسے غار کے دہانے سے ہٹانے کی ترکیبیں سوچتے ہیں، تو اسی دوران شیرین لالا پتھروں سے آگ لگانے کا مشورہ دیتے ہیں اور آگ لگا کر ڈائنا سور کو بھگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس واقعہ کے بیان سے راہی ایک طرح سے بچوں کو حاضر دماغی سے حالات کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، لکھتے ہیں:

> ''اسے اتفاق کہیے یا خوش قسمتی کہ غار سے ہمیں ایسے پتھر مل گئے۔ جن کے رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ ان کی مدد سے ہم نے غار میں پڑی گھاس پھونس کو آگ لگائی۔ لالا گل نے اپنی بنیان اتار دی جسے آگ لگا کر لالا نے ڈائنا سور کی طرف پھینکا۔ ڈائنا سور عجیب و غریب چیخیں مارتا ہوا تھوڑی ہی دیر میں نو دو گیارہ ہو گیا۔'' (۴۶)

بچپن میں بچے عموماً کھانے پینے کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ کسی کے ہاتھ میں کھانے کی کوئی چیز دیکھ لیتے ہیں تو فوراً اس کے مانگنے کا تقاضا شروع کر دیتے ہیں، یا پھر ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ کاش کھانے والا ان کو بھی تھوڑی سی چیز دے کر کھلا دے۔ راہیؔ چونکہ بچوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہ ہیں اور ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشات، شرارتوں اور حرکات وسکنات کو سمجھتے ہیں، اس لئے ان کی اس عادت کا ذکر انہوں نے کہانی میں ''پپو'' کے کردار کے ذریعے کیا ہے۔ جب پپو اپنی خالہ شیرین کے گھر ڈائنا سوروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے جاتا ہے تو خالہ شیرین گھر پر نہیں ہوتی۔ البتہ گھر پر اُن کے خالو ہوتے ہیں جو مزے سے گنڈیریاں چوستے ہیں۔ اُنہیں دیکھ کر اس کے دل میں یہ ارمان پیدا ہوتا ہے کہ کاش خالو انہیں بھی کھانے کے لئے کچھ گنڈیریاں دے دیں، لیکن خالو ایسا کچھ بھی نہیں کرتے:

> ''میں نے انہیں سلام کیا تو بڑے جوش وخروش سے وعلیکم السلام کہا، مجھے اُمید تھی کہ وہ دو چار گنڈیریاں مجھے بھی کھانے کے لئے دے دیں گے۔ لیکن انھوں نے بھول کر بھی مجھے نہیں پوچھا۔ میں نے دل میں کہا کہ جب میں بڑا ہوں گا تو صاحب اختیار ہوں گا، تب میں بھی اسی طرح ڈھیر ساری گنڈیریاں چوسا کروں گا۔'' (۴۷)

خالو پپو سے گھر آنے کا مقصد دریافت کرتے ہیں کہ شاید وہ ان کے کچھ کام آئیں جس پر پپو دل میں کہتا ہے:

> ''میں نے سوچا کہ '' آپ کیا مدد کریں گے۔ آپ کو تو گنڈیریاں کھانے ہی سے فرصت نہیں۔ ہاں، آپ یہ مدد ضرور کر سکتے ہیں کہ باقی ماندہ گنڈیریاں ہمیں دے کر ثواب دارین حاصل کریں۔'' (۴۸)

اس واقعہ میں بڑوں کے لئے بھی سبق موجود ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ پپو کے خالو کی طرح کا برتاؤ ہرگز نہ کریں بلکہ خود کھاتے ہوئے انہیں بھی کھانے پینے کی چیزیں دے دیا کریں، تا کہ وہ حسرت بھری نگاہوں سے ان کی طرف نہ دیکھیں۔

جب پپو اور اس کے خالو کے مابین تھوڑی بہت گفتگو ہو جاتی ہے تو اتنے میں خالہ شیریں گھر میں داخل ہوتی ہیں۔ پپو فوراً ان سے ڈائنا سوروں کے غائب ہونے کی وجہ پوچھتا ہے تو خالہ شریں کہتی ہیں کہ ڈائنا سور غائب نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہمارے اردگرداب بھی موجود ہیں:

> ''کون کہتا ہے ڈائنا سور غائب ہو گئے ہیں۔ خالہ ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگیں، '' ڈائنا سور تو ہمارے چاروں اطراف میں بستے ہیں۔ دنیا ڈائنا سوروں سے بھری پڑی ہے''۔ (۴۹)

پپو مزید پوچھتا ہے کہ پھر وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتے۔ تو شیرین خالہ جواب دیتی ہیں:

> ''اس لئے کہ انہوں نے اپنی شکلیں بدل لی ہیں۔ کوئی قاتل بن گیا ہے تو کوئی سمگلر۔ کوئی ذخیرہ اندوز بن گیا ہے تو کوئی رشوت خور، کوئی جیب کترا بن گیا ہے تو کوئی چور۔'' (۵۰)

راہیؔ دراصل ہمارے معاشرے میں موجود ان تمام انسانوں پر طنز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جو ڈائنا سور

بن کر مختلف برائیوں اور جرائم میں مبتلا ہیں۔

اس ناولٹ کے تحریر کرنے سے راہیؔ کا مقصد، بچوں میں ریسرچ ورک کو فروغ دینا ہے، کہ وہ کسی بھی چیز کے بارے میں ازخود تحقیق اور چھان بین کریں اور اس بارے میں اپنی معلومات حاصل کریں۔ اس سلسلے میں لائبریری، جو معلومات اور علم حاصل کرنے کی اصل جگہ ہے، اس سے بھی استفادہ کریں۔ ناولٹ میں وہ عبدالسلام ماما کی زبانی ان الفاظ میں یہ ترغیب دیتے ہیں:

> ''ہمارے شہر میں ایک اچھی لائبریری موجود ہے، جناح میونسپل لائبریری، ایسا کرو تم، تمھارے بھائی اور دوست اپنے سکول کی لائبریری اور جناح میونسپل لائبریری کی مدد سے ڈائنا سوروں پر تحقیق کرو جو بہترین کام کرے گا۔ اُسے میری طرف سے ایک عمدہ کتاب ملے گی۔'' (۵۱)

اسی طرح جب پپو لائبریری سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر ڈائناسوروں کے بارے میں ایک کہانی لکھنے کا آغاز کر کے اس کا ایک حصہ لکھ لیتا ہے تو عبدالسلام ماما اُسے گلے لگا کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ارے! تم اسے کہانی کہتے ہو۔ یہ تم نے تاریخی حقائق کو ایک خوش رنگ انداز میں لکھ ڈالا ہے۔ ارے بھئی، پپو میاں! تم نے تو کمال کر ڈالا ہے۔'' (۵۲)

یوں راہیؔ بچوں کو تحقیق کرنے کے ساتھ ساتھ لکھنے لکھانے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں راہیؔ اس ناولٹ میں بچوں کو بتاتے ہیں کہ علم کی دولت انسان کو جہاں سے بھی ملے، اُسے حاصل کرنی چاہیے۔ پپو جب تحقیق کر کے ڈائناسوروں کے بارے میں اپنی کہانی مکمل کرتا ہے تو عبدالسلام ماما انعام کے طور پر اُسے "Tell me Why" کی مفید معلوماتی کتاب پڑھنے کو دیتے ہیں اور ساتھ میں علم کے بارے میں ایک حدیث بھی سناتے ہیں:

> ''علم مومن کی میراث ہے، سو علم جہاں سے ملے، ہمیں حاصل کرنا چاہئے۔'' (۵۳)

ناولٹ کے آخر میں شجاعت علی راہیؔ بچوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ آپ نہ صرف کائنات میں موجود مختلف مخلوقات کے بارے میں تحقیقی مطالعہ کریں بلکہ لکھنے لکھانے کی طرف بھی خاص توجہ دیں۔ جس طرح پپو نے تحقیقی معلومات حاصل کر کے ایک کہانی لکھی، اُسی طرح آپ بھی لفظوں کی قدر و قیمت جانیں اور لکھنے کی بھرپور کوشش کریں اور دنیا کو اپنی تخلیقات کے حُسن سے مالا مال کریں۔ عبدالسلام ماما کی زبانی پپو کو نصیحت کرتے ہوئے راہیؔ لکھتے ہیں:

> '' بیٹے! علم کی شمع کو تھامے رکھنا! لفظ بہت بیش قیمت شے ہے، اس کی قدر و قیمت کو ہمیشہ نظر میں رکھنا اور دنیا کو اچھے لفظوں اور اچھے خیالوں سے بھر دینا''۔ (۵۴)

فنی جائزہ:

ناولٹ ''ڈائناسور کیوں غائب ہو گئے؟'' ایک تحقیقی ناولٹ ہے اور اس میں ڈائناسوروں کے بارے میں باقاعدہ

معلومات حاصل کر کے ریسرچ کی گئی ہے۔ یہ کہانی سے زیادہ ایک تاریخی اور سائنسی ریسرچ ہے۔ آج کل اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ بچوں کے لئے اخلاقی ادب کے ساتھ ساتھ سائنسی ادب بھی تخلیق کیا جائے، تو ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ کوشش صحیح معنوں میں راہی صاحب نے ''ڈائناسور کیوں غائب ہو گئے؟'' لکھ کر کی ہے۔ ناولٹ کا آغاز انہوں نے بہت ڈرامائی انداز میں کیا ہے اور کردار پپو کے ذریعے آخر تک دلچسپی کے عنصر کو برقرار رکھتے ہوئے تحقیقی عمل کو ایک تمثیلی رنگ دے کر پیش کیا ہے۔

ناولٹ کی کہانی مکمل کرنے کے بعد راہی کو یہ شک گزرتا ہے کہ شاید یہ کہانی اتنی طویل نہیں ہے کہ ناولٹ کہلائی جا سکے۔ تو اس مقصد کے لئے بھی وہ انٹرنیٹ پر ریسرچ کر کے معلومات حاصل کرتے ہیں، جس کے بارے میں وہ کتاب کے آغاز میں خود لکھتے ہیں:

> ''میں نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ضخامت کے اعتبار سے افسانہ، ناولٹ، ناویلا اور ناول میں کیا فرق ہے؟ انٹرنیٹ کا سہارا لیا۔ انٹرنیٹ سے مجھے جو معلومات میسر آئیں، ان کے مطابق ان اصناف کی تقسیم کچھ یوں ہے:
>
> | | |
> |---|---|
> | افسانہ | 7,500 سے کم الفاظ |
> | ناولٹ | 7,500 سے 17,500 تک الفاظ |
> | ناویلا | 17,500 سے 40,000 تک الفاظ |
> | ناول | 40,000 سے زائد |
>
> اس لفظی تقسیم کے پیش نظر ''ڈائناسور کیوں غائب ہو گئے'' ناولٹ کے دائرے میں آتی ہے۔ کیونکہ یہ ساڑھے آٹھ ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔(۵۵)

راہی کی اس تحقیق کے مطابق نہ صرف اُن کا ناولٹ ''ڈائناسور کیوں غائب ہو گئے؟'' ناولٹ کے زمرے میں آتا ہے بلکہ ان کے باقی سارے ناولٹ بھی اسی لفظی تقسیم کی بنیاد پر ناولٹ قرار دیے جا سکتے ہیں۔

پلاٹ:

ضخامت اور لفظی تقسیم کے بعد ناولٹ میں چند دیگر فنی محاسن اور لوازمات کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر ناولٹ ''ڈائناسور کیوں غائب ہو گئے؟'' کی پلاٹ کی بات کی جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا پلاٹ حد درجہ سادہ اور عام فہم ہے، کیونکہ اس کی کہانی باقی دو ناولٹوں ''باغی چیونٹیاں'' اور ''تتلیوں کا میلہ'' کی بہ نسبت مختصر ہے۔ طوالت نہ ہونے کی وجہ سے کہانی اور اس کے واقعات پر راہی کی گرفت مقابلتاً زیادہ مضبوط ہے، جس کی وجہ سے پلاٹ میں کوئی پیچیدگی اور جھول نظر نہیں آتا۔ واقعات ایک منطقی ربط کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ کہیں پر بھی پلاٹ کی مرکب صورت دیکھنے کو

نہیں ملتی۔

تمام واقعات زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے پیوستہ، ایک خاص ترتیب کے ساتھ آگے بڑھتے اور اختتام پذیر ہوتے ہیں، جیسے پپو اور اس کے بھائیوں کا روح بُلانے کی کوشش کرنا، گلاس کا حروفِ تہجی پر باری باری لپک کر جملہ ''ڈائنا سور کیوں غائب ہوگئے؟'' بنانا، پپو کا ڈائنا سور کو خواب میں دیکھنا، اس بارے میں اُس کے تجسس کا بڑھنا اور تحقیق کرنا، پھر تحقیقی معلومات پر مبنی ایک کہانی لکھنا، عبدالسلام ماما کی حوصلہ افزائی اور لکھنے لکھانے کی ترغیب دینا۔ راہیؔ نے بڑی ہنر مندی اور چابکدستی سے کہانی کو مختلف واقعات کے ذریعے آگے بڑھایا ہے جس پر وہ بجا طور پر داد و تحسین کے مستحق ہیں۔

کردار نگاری:

اگر ناولٹ کی کردار نگاری پر بات کریں تو اس ناولٹ کے تمام کردار حقیقی ہیں، جس کے بارے میں کتاب کے ابتداء میں راہیؔ خود کہتے ہیں:

> ''ڈائنا سور کیوں غائب ہوگئے؟'' میں مَیں نے جتنے انسانی کردار شامل کیے ہیں۔ سب کے سب حقیقی ہیں''۔ (۵۶)

کرداروں کے اس گیلری میں راہیؔ کے والدین ، بہن ، بھائی ، ماموں (عبدالسلام) ، گھریلو ملازم (غلام جان)، استاد عبدالرزاق، خالہ شیرین (طلعت نشاط) اور شاعری کے میدان میں ان کے استاد جناح میونسپل لائبریری کے لائبریرین (ایوب صابر) شامل ہیں۔ کہانی چونکہ پپو جو سب سے چھوٹا بھائی یعنی (مصنف) خود ہوتا ہے اس کے ذریعے بیان ہوتی ہے۔ اس لئے کہانی کا مرکزی کردار بھی پپو ہی ہے۔ کرداروں میں کہیں پر بھی ارتقائی صورت دیکھنے کو نہیں ملتی۔

مکالمہ نگاری:

یہ ناولٹ قدرے مختصر اور ضخامت کے اعتبار سے چھوٹا ہے۔ اس کی کہانی بھی بہت سادہ ہے۔ چونکہ اس میں زیادہ تر تحقیقی معلومات ہیں، اس لئے مکالمہ نگاری کے نمونے بھی اکثر مقامات پر مختصر ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ تاہم مکالمے کہانی اور ضرورت کے مطابق برمحل، برجستہ اور عام فہم ہیں اور بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہیں۔ کیونکہ بچے عموماً زیادہ لمبی بات اور جملوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ مختصر اور عام فہم مکالمے کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''ہمارے خالو گنڈیریاں کھاتے کھاتے رکے اور کہنے لگے،
> کیوں بھئی، پپو میاں! کسی چیز کی تلاش ہے؟''۔
> ''خالہ شیرین کہاں ہیں؟''
> ''کوئی کام ہے کیا؟''
> ''جی ہاں''

''کیا کام ہے؟''۔

''ارے بھئی، بولو۔۔۔شاید ہم کچھ مدد کر سکیں''۔

میں نے سوچا'' آپ کیا مدد کریں گے۔آپ کو تو گنڈیریاں کھانے ہی سے فرصت نہیں۔ہاں! آپ یہ مدد ضرور کر سکتے ہیں کہ باقی ماندہ گنڈیریاں ہمیں دے کر ثواب دارین حاصل کرلیں''۔(۵۷)

زیرِ نظر مکالمہ مختصر اور چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہے اور اس میں بچوں کی ذہنی استعداد کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے۔

منظر نگاری:

ایک بہترین ناولٹ نگار ہونے کے ناطے راہی کو منظر نگاری پر خصوصی دسترس حاصل ہے اور خاص طور پر فطری مناظر کے دلکش بیان میں وہ کمال کا ہنر دکھاتے ہیں۔الفاظ کے ذریعے کسی منظر کا نقشہ ہو بہو قاری کے سامنے ایسا کھینچ دیتے ہیں، کہ جس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔مثلاً:

''لالا، لالاگل، شیرین لالا اور میں پارہ چنار کے ایک سرسبز پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔اوپر نیلا دھلا دھلا یا آسمان تھا، جس پر دودھ کی طرح سفید، صاف ستھرے بادل پریوں اور روئی کے گالوں کی طرح تیر رہے تھے۔نیچے پارہ چنار کے حسین وادی کوہ قاف کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔

چناروں کے قدآور درخت خاموش کھڑے دیوؤں کی طرح لگتے تھے۔ہر طرف سبزے کی ایک دلکش چادر تنی ہوئی تھی۔کہیں کہیں بہتا پانی وادی کے حسن کو دوبالا کر رہا تھا۔پہاڑ کے اوپر جمی ہوئی دھوپ میں چمکتی ہوئی سفید، روشن برف ہمیں اپنی سمت بلا رہی تھی اور ہم ہانپتے ہوئے برابر اوپر ہی اوپر بڑھ رہے تھے۔پہاڑ کا کچھ حصہ درختوں، پودوں اور گھاس پھونس سے ڈھکا ہوا تھا۔باقی حصہ بڑے بڑے پتھروں اور چٹانوں پر مشتمل تھا جو بارش کا پانی پی پی کر سبزی مائل ہو گئے تھے اور کہیں کہیں اُن میں سے خودرو، ننھے منے رنگا رنگ پھول جھانک رہے تھے۔''(۵۸)

اسلوب اور زبان و بیان:

جہاں تک اس ناولٹ کی زبان و بیان اور اسلوب کا تعلق ہے تو وہ بہت سادہ، عام فہم، معلوماتی اور سائنسی فکشن جیسا ہے۔چونکہ تحقیق کی زبان بھی سادہ اور آسان ہوتی ہے، اس لئے یہ ناولٹ بھی تحقیقی اصولوں کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ ناولٹ ''باغی چیونٹیاں'' میں اسلوب جہاں خطیبانہ، ''تتلیوں کا میلہ'' میں شاعرانہ ہے۔اسی طرح ''ڈائناسور کیوں غائب ہو گئے؟'' کا اسلوب تحقیقی اور سائنسی ہے کیونکہ معلومات کی ترسیل کے لئے مناسب اور موزوں الفاظ و طرزِ بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔جو راہی خوب جانتے ہیں مثلاً:

''ایک تیز رفتار و مدار ستارہ آگ کے ایک بڑے گولے کی طرح زمین کی جانب بڑھ رہا ہے۔یہ دمدار

ستارہ میکسیکو کے ایک علاقے چکسو لوب میں ایک دھماکے کے ساتھ زمین سے جا ٹکراتا ہے۔
۱۸۰ کلومیٹر طویل گڑھا پڑ جاتا ہے۔ اس ٹکراؤ کا اثر سارے کرہ ارض پر مرتب ہوتا ہے۔ زمین ٹوٹ
پھوٹ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہر طرف راکھ کی ایک تہہ سی بچھ گئی ہے۔'' (۵۹)

راہیؔ کے دیگر ناولٹوں کی طرح ناولٹ ''ڈائنا سور کیوں غائب ہو گئے؟'' بھی ناولٹ نگاری کے فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ناولٹ کا پلاٹ، کردار، مکالمے، منظر نگاری اور زبان و اسلوب اپنی مثال آپ ہیں۔ اس میں وحدت زماں اور مکاں کا بھی بھرپور خیال رکھا گیا ہے اور کہیں پر بھی وحدت تاثر کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

۴۔ بلی کی آپ بیتی:

شجاعت علی راہیؔ نے بچوں کے لئے بہت دلچسپ کہانیاں اور معلوماتی ناولٹ لکھے ہیں۔ ''باغی چیونٹیاں''، ''تتلیوں کا میلہ'' اور ''ڈائنا سور کیوں غائب ہو گئے؟'' جیسے منفرد اور باقاعدہ تحقیق پر مبنی معلوماتی اور دلچسپ ناولٹ ان کے قلم کا خصوصی اعجاز ہیں۔ بچوں کے لئے ان کی نثر ہو یا شاعری، سب میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ راہیؔ نہ صرف بچوں کی تفریح طبع کے لئے دلچسپ، صحت مند اور بامقصد ادب تخلیق کرتے ہیں بلکہ ان کے نثری شہ پارے بچوں کے لئے نہایت معلوماتی بھی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے بچوں کی اخلاقی تربیت کا فریضہ انجام دینا بخوبی جانتے ہیں۔

بچوں کے لئے ان کا چوتھا ناولٹ ''بلی کی آپ بیتی'' بھی بلیّوں کی نفسیات، ان کی عادات و اطوار، جذبات و احساسات اور خصوصیات پر تحقیق کر کے لکھا گیا ہے۔ راہیؔ نے اس ناولٹ میں بتایا ہے کہ قدیم مصر میں کالی بلیوں کو ممایا جاتا تھا۔ ان کی پرستش کی جاتی تھی اور بلی کو نہایت مقدس جانور خیال کیا جاتا تھا۔ ناولٹ میں بلیوں کے بارے میں اور بھی بہت ساری معلومات ہیں۔ مثلاً ان کے پچھلے پاؤں کے پنجے میں پانچ کی بجائے چار انگلیوں کا ہونا، بلیوں کا کلر بلائنڈ ہونا، اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت کا تیز ہونا، سونگھنے اور سننے کی تیز حس رکھنا اور ۲۴ گھنٹو میں سے تقریباً ۲۰ گھنٹوں تک کی نیند کرنا وغیرہ۔ علاوہ ازیں دنیا کی امیر ترین، بھاری، لمبے سائز، سب سے چھوٹے سائز اور سب سے زیادہ قیمتی بلیوں کا ذکر بھی اس خوب صورت آپ بیتی کا حصہ ہے۔

ناولٹ کے موضوع اور مقصد کی وضاحت خود راہیؔ نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ''اس ناولٹ میں آپ کو بلیوں کے حقوق کا بھی تذکرہ ملے گا اور ان کے جذبات و احساسات کا عکس بھی۔ انسانوں اور پالتو بلیوں کے باہمی رشتے اور ان سے ترتیب پانے والے دوسرے دل فریب رشتے بھی اس کہانی کا موضوع ہیں۔ کتاب کا بنیادی مقصد ہے معلومات کی بچوں تک ہلکے پھلکے انداز میں ترسیل ہے، تاکہ وہ محظوظ بھی ہوں، ان کے علم میں بھی اضافہ ہو اور اخلاقی قدروں کو بھی فروغ مل سکے''۔ (۶۰)

یہ ناولٹ چونکہ ایک پالتو بلی کی آپ بیتی ہے، اس لئے بلی اپنی زبان سے خود اپنے حالات وواقعات بیان کرتی ہے۔ اپنی پسند وناپسند، اور اپنے کھیلنے کھودنے کے بارے میں وہ اتنے دلچسپ انداز سے بتاتی ہے کہ قاری ایک ہی نشست میں ناول پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں ریٹائرڈ کموڈور نیوی محمود الرحمن مودی کتاب کے دیباچے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''یہ ناول جو راہیؔ صاحب کی تازہ ترین کاوش ہے، ایک خوب صورت آپ بیتی ہے۔ بچوں کے لئے خصوصی طور پر لکھی ہوئی یہ کتاب بڑوں کے لئے بھی باعث دلچسپی ہوگی۔ مانو بلی مصنف کے گھر میں رہنے لگی اور ان کی پوتی انمول سے دوستی اور محبت کا رشتہ استوار کر لیتی ہے۔ مانو بلی کو اس کی پرانی مالکن گھر سے نکال دیتی ہے اور پھر انمول اس کو اپنا لیتی ہے۔ اس بلی پر کیا بیتی، اس کو کیا پسند اور ناپسند ہے'' کھیلنے کھودنے میں، نظمیں سُننے میں، غرض ہر چیز میں مانو مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ راہیؔ صاحب نے حقیقت اور افسانے کو اس خوب صورتی سے ملایا ہے کہ لگتا ہے کہ یہ تحریر واقعی کسی بلی کی ہے۔ کسی بھی لمحے قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اس ناول کو پڑھ رہا ہے۔ بلکہ لگتا ہے کہ وہ ان کرداروں کے بیچ میں رہ کر مانو کی خوب صورت مصروفیات دیکھ رہا ہے۔''(۶۱)

بلی اللہ تعالیٰ کی ایک خوب صورت اور حسین مخلوق ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں بلی کو انسان دوستی اور حُسن کی وجہ سے پالنا ایک فیشن اور رواج بن چکا ہے۔ راہیؔ بھی ''بلی'' کی خوب صورتی کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''بلی، خالق ومصور کائنات کی انتہائی دلکش اور دلوں کو موہ لینے والی مخلوق ہے۔ اس حیرت انگیز مخلوق کے بارے میں جتنا اور جیسا بھی لکھا جائے، حق تحریر ادا نہیں کیا جا سکتا، تاہم میں نے اپنے تئیں یہ فریضہ نبھانے کی سعی کی ہے۔''(۶۲)

جیسا کہ محمود الرحمن مودی نے فرمایا کہ راہیؔ نے اس ناولٹ میں حقیقت اور افسانے کو اس خوب صورتی سے ملایا ہے کہ یہ واقعی کسی بلی کی تحریر لگتی ہے۔ جی ہاں! یہ واقعی مانو بلی کی ایک ایسی دلچسپ آپ بیتی ہے جیسے کہ اس کی حقیقی زندگی ہو اور جس میں ہم اور آپ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ مانو بلی کی یہ آپ بیتی اس کی زبانی کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے:

سب سے پہلے وہ اپنا ناک حلیہ بتاتی ہے اور اپنے آپ کو ایک خاندانی بلی کہہ کر شیر اور چیتے سے اپنی نسبت ٹھہراتی ہے کہ وہ ہمارے ہی قبیلے اور شاہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مانو، مصنف کی پوتی انمول سے دوستی کرتی ہے۔ مانو کو اس کی پُرانی مالکن گھر سے نکال دیتی ہے تو انمول اُسے گھر لے آتی ہے۔ وہ انمول کے گھر میں بہت خوش ہوتی ہے، لیکن اپنی دو بچھڑی بہنوں اور اپنی امی کو کبھی کبھی یاد کرتی ہے۔ انمول مانو سے بہت پیار کرتی ہے۔ اس کی تصویریں بناتی ہیں۔ انمول کی

پھوپھی کومل بھی اس سے بہت پیار کرتی ہے۔ انمول کے گھر آنے سے پہلے مانو ایک موٹی اور نخریلی عورت کے گھر میں اپنی امی اور دو بہنوں سمیت رہ رہی ہوتی ہے۔ وہ عورت بہت ظالم ہوتی ہے، کہنے کو تو وہ پوری دنیا سے کہتی ہے کہ وہ ان بلیوں کا بہت خیال رکھتی ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ ایک دن مانو اور اس کی بہنوں کو شدید بھوک لگی ہوتی ہے اور گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہوتا، تو اس دوران ان کی امی کو کچن میں کسی برتن میں دودھ پڑا نظر آتا ہے۔ وہ انہیں کچن میں لجا کر خوب پیٹ بھر کر دودھ پلاتی ہے جس پر غصیلی بدبخت عورت اپنے خاوند کو فون کر کے گھر بلاتی ہے اور بلیوں کو ٹھکانے لگانے کا کہتی ہے۔ خاوند اس کے کہنے پر مانو کی امی کو کسی دریا پر پھینک دیتا ہے اور مانو سمیت تینوں بہنوں کو دور کسی ویرانے میں چھوڑ کر چلا آتا ہے۔ بعد میں مانو اپنی امی اور دو بہنوں سے بھی حادثاتی طور پر بچھڑ کر ایک دن کسی سڑک پر جا رہی ہوتی ہے کہ انمول کی نظر اس پر پڑتی ہے۔ انمول اپنی امی ابو سے ضد کر کے اُسے اپنے ساتھ گھر لاتی ہے، اُسے پیار کر کے دودھ پلاتی ہے جس پر مانو اللہ کا شکر ادا کرتی ہے کہ وہ انمول جیسی پیار اور خیال رکھنے والی لڑکی کے ہاتھوں لگ گئی ہے۔

انمول کے دادا بابا ایک مصنف ہوتے ہیں اور ہر وقت کتابیں پڑھ کر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ مانو ایک دن اسے کسی سے باتیں کرتے ہوئے سُنتی ہے کہ پُرانے وقتوں میں بلی کو بہت مقدس خیال کیا جاتا تھا۔ مصر میں خاص طور پر کالی بلی کو مرنے کے بعد ممیایا جاتا تھا اور اس کی پرستش کی جاتی تھی اور ایک خاص قسم کے تابوت میں اسے رکھ کر باقاعدہ قبرستان لے جا کر دفنایا جاتا تھا۔ بلیوں کی یہ عزت دیکھ کر مانو ارمان کرتی ہے کہ کاش! وہ بھی اس دور کی ایک مصری بلی ہوتی، لیکن خیر مانو پھر احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتی۔ بلکہ اپنی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتی ہے کہ پہلے لوگ ہمیں صرف چوہوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے پالتے تھے، جبکہ آج کل کے جدید ذہنیت رکھنے والے لوگ ہمیں ہمارے حسن، خوب صورتی کے ساتھ ساتھ انسان دوستی کی وجہ سے بھی پالتے ہیں اور کیوں نہ پالے، ہم اپنی کچھ خصوصیات کی بناء پر انسانوں پر برتری وفوقیت جو رکھتے ہیں۔ پھر اپنی چند خصوصیات جیسے اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت، سُونگھنے اور سُننے کی تیز حس اور کلر بلائنڈ ہونے کو گنوا کر اپنے حسن پر نازاں ہوتی ہے۔

ایک دن مانو انمول کے ساتھ سکول جاتی ہے۔ انمول اسے ایک باسکٹ میں ڈال کر سکول لے جاتی ہے، وہاں ایک اور لڑکی کو مانو پسند آجاتی ہے اور وہ اُسے چپکے سے باسکٹ سے اُٹھا کر گھر کی طرف بھاگتی ہے لیکن مانو بہت شور مچا کر اس لڑکی کے ہاتھوں اپنے آپ کو اغوا ہونے سے بچاتی ہے۔

جس دن انمول اپنی سالگرہ مناتی ہے، اس دن اپنے ساتھ مانو کی سالگرہ بھی منانے کا پروگرام بناتی ہے اور ایک کی بجائے دو کیک کاٹتی ہے، جو انمول کی حد درجہ محبت کا مُنہ بولتا ثبوت ہوتا ہے۔ انمول کی امی اس سے بہت پیار کرتی ہے اور ہر روز اس کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہیں، جسے دیکھ کر مانو کو بھی بے اختیار اپنی امی یاد آتی ہے۔

ایک دن مانو شرارتیں کرنے کے موڈ میں ہوتی ہے۔ چنانچہ انمول کی غیر موجودگی میں کمرے میں خوب اودھم مچا دیتی ہے۔ جس پر انمول اسے دادا بابا کے پاس لے کر جاتی ہے کہ اس کی شرارتوں پر ایک نظم لکھ لیں۔ دادا بابا مانو پر ایک نہیں دو نظمیں اور ایک ماہیا لکھ کر سناتے ہیں۔ پھر مانو دادا بابا سے قدیم مصریوں کے اس خیال کی صداقت کے بارے میں دریافت کرتی ہے کہ بلیوں کی سات یا نو جانیں ہوتی تھیں کہ نہیں؟۔ دادا بابا ایسی تمام باتوں کو رد کر کے انہیں صرف توہمات کے زمرے میں ڈالتے ہیں۔

ایک دن انمول کا بھائی شایان مانو کو گینیز بک میں دنیا بھر کی بلیوں کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بتاتا ہے مثلاً دنیا کی امیر ترین بلی بلیکی (Blackie) ہے، جو ۲۴ ملین ڈالر کی مالک ہے۔ پھر سب سے بھاری بلی (Himmy)، جس کا وزن ۴۷ پاؤنڈ ہے، اس کے بارے میں معلومات دیتا ہے۔ سکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والی لمبی بلی سنوبی (Snowbie)، اس سے بھی لمبی برطانیہ کی بلی لڈو (Ludo)، دنیا کی سب سے چھوٹی بلی، جو امریکہ سے تعلق رکھتی ہے، ان کے بارے میں بتدریج بتاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ سب سے زیادہ سفر کرنے والا بلا، ہیملٹ ہے اور دنیا کی سب سے قیمتی بلی لائٹر پاؤل کیسی (Paul) ہے، جو امریکہ میں ۲۴ ہزار ڈالر یعنی ایک سو پچیس لاکھ میں فروخت ہوئی تھی وغیرہ۔

یہ سب سن کر مانو کو احساس ہوتا ہے کہ یہ تو واقعی ہم بلیاں بہت قدر و قیمت والی ہیں، تب ہی لائبریری اور کتابوں میں ہماری تصویریں ہوتی ہیں، کیونکہ خوب صورتی اور خوش شکلی میں کوئی اور جانور ہمارا مقابلہ ہی نہیں کر سکتا۔

انمول کے ابو بیرون ملک ملازمت سے منسلک ہوتے ہیں اور پاکستان بہت کم آتے ہیں، جس کی وجہ سے انمول اپنے ابو سے ملنے گرمیوں کی چھٹیوں میں ملک سے باہر جاتی ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ جب انمول اپنے ابو سے ملنے جاتی ہے تو مانو کو اپنی خالہ زاد بہنوں نور العین اور گل اندام کے سپرد کر دیتی ہے، وہ بھی مانو کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ ایک دن اچانک اُن کے گھر کے آگے ایک گاڑی رکتی ہے، جس میں ایک چھوٹی بچی بھی بیٹھی ہوتی ہے، مانو اُسے انمول خیال کرتی ہے اور چپکے سے گاڑی کی ڈگی میں چڑھ کر سامان کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتی ہے کہ گاڑی انمول کے گھر کے سامنے نہیں بلکہ کسی اور گھر کے سامنے رکتی ہے اور وہ لڑکی بھی انمول نہیں بلکہ کوئی اور ہے تو اُسے بہت حیرانی ہوتی ہے اور بہت پریشان ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ لڑکی بھی مانو کو پسند کرتی ہے، اُسے واپس جانے نہیں دیتی ہے اور اُسے اپنے ساتھ گھر میں رکھتی ہے۔

ایک دن وہ لڑکی اپنی امی اور ابو کے ساتھ مانو کو لے کر کسی شاپنگ پلازہ میں جاتی ہے۔ اتفاق سے وہاں نور العین اور گل اندام بھی ہوتی ہے جو مانو کو پہچان کر اُسے اُس لڑکی سے چھیننے کی کوشش کرتی ہیں اور دعویٰ کرتی ہیں کہ یہ وہی بلی ہے، جو انمول ان کے ہاں امانت کے طور پر چھوڑ کر گئی تھی۔ لڑکی کے والدین شریف ہوتے ہیں اور مانو کو نور العین اور گل اندام

کے حوالے کر دیتے ہیں اور یوں مانو ایک دفعہ پھر ان کے ساتھ گھر میں رہنے لگتی ہے۔ ایک دن، ان کے پڑوس میں مانو کسی خوفناک، کالی اور بدشکل بلی کو دیکھتی ہے جو کسی بات پر الجھ کر اُس پر حملہ کر کے اسے زخمی کر دیتی ہے۔ مانو اُسے بد عا دیتی ہے جس کے نتیجے میں وہ بلی کسی ٹین ایجر کی تیز رفتار ڈرائیونگ کا شکار ہو کر حادثاتی طور پر موت کے مُنہ میں چلی جاتی ہے۔ مانو کالی بلی کی اس ناگہانی موت پر بہت افسوس کرتی ہے کیونکہ وہ دل کی بُری نہیں ہوتی۔ کئی دنوں تک وہ کالی بلی اس کے سپنوں میں آتی ہے اور اُسے ڈراتی ہے کہ وہ مری نہیں بلکہ زندہ ہے۔ اس کی نو جانیں ہیں اور وہ اُسے مارنے کے لئے پھر آئی گی۔ مانو نے دادا بابا کو ایک دن یہ کہتے سنا تھا کہ قرونِ وسطیٰ یعنی مڈل ایجز کے جادوگر اور جادوگرنیاں کالی بلیوں کے بھیجے کو ہانڈیوں میں پکا کر خود کو اور بھی زیادہ ڈراؤنا بناتی تھیں۔ اس لئے مانو ڈرتی ہے کہ کہیں جادوگرنیاں اُس مری ہوئی کالی بلی کے بھیجے کو اسی طرح استعمال کر کے اُسے نہ ڈرانا شروع کر دے۔

لیکن رفتہ رفتہ یہ ڈراؤنے خواب وقت کے ساتھ ساتھ آنا بند ہو جاتے ہیں۔ البتہ ایک دن وہ کوئی اور انوکھا خواب دیکھتی ہے، جس میں وہ اپنے آپ کو ایک ایسی کالی بلی خیال کرتی ہے، جس کی لوگ پوجا کرتے ہیں۔ پھر اچانک ایک جنگجو شہزادہ بار بار اپنی تلوار سے اس کا سر کاٹتا ہے لیکن وہ مرتی نہیں لیکن جب وہ نویں بار تلوار سونت کر اُس پر حملہ کرتا ہے تو اس بار ہمیشہ کے لئے فنا ہونے کے ڈر سے مانو کی آنکھ فوراً کھلتی ہے۔ تب اُسے دادا بابا کی وہ بات یاد آتی ہے جو اس نے بلی کی نو جانوں کے بارے میں کہی ہوتی ہے کہ یہ صرف ایک توہماتی خیال ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ کالی بلی کی موت کے بعد اُس گھر میں ایک سفید رنگ کا چھوٹا سا ''کتا'' ہوتا ہے، مانو کی اُس سے دوستی ہو جاتی ہے۔ نورالعین اور گل اندام کے دادا ابو کے ساتھ بھی اس کی بڑی گہری دوستی بن چکی ہوتی ہے۔ وہ قریب ایک غار میں رہنے والے ایک چوہے سے بھی دوستی کرنا چاہتی ہے، کہ پھر وہ، ننھا کتا اور چوہا آپس میں کھیلیں گے کیونکہ ان کے خیال میں اگر نیت صاف ہو اور ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچایا جائے تو بڑے بڑے دُشمن کو بھی دوست بنایا جا سکتا ہے۔

مانو چونکہ ہر وقت سوئی رہتی ہے، اس لئے سپنے بھی بہت دیکھتی ہے۔ چنانچہ حسب معمول وہ ایک حسین سپنا دیکھ رہی ہوتی ہے کہ وہ کوہ قاف کی ایک پری بنی ہوتی ہے اور بہت سے لوگ اس کے استقبال میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اتنے میں گل اندام اُسے انمول کے بیرونِ ملک سے واپسی کی خوشخبری سناتی ہے جسے سُن کر مانو کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی، کہ ایک دفعہ پھر وہ انمول کے ساتھ کھیلیں گی اور ہنسی خوشی رہے گی۔

راہیؔ نے دراصل بلی کی اس آپ بیتی کے ذریعے بچوں کو غیر محسوس طریقے سے بلی کی عادات واطوار، جذبات واحساسات، ان کی نفسیات اور حقوق، انسان دوستی، پسند و ناپسند، خصوصیات، ان کے بارے میں کہاوتوں اور دیگر جملہ تحقیقی معلومات کو اس طریقے سے پہنچایا ہے کہ بچے تفریح کے ساتھ ساتھ معلومات سے بھی مستفید ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ

راہیؔ نے مانو بلی کی اچھی عادتوں کا ذکر کر کے بچوں کو اچھی عادتیں اپنانے کی تلقین بھی کی ہے۔ یہی اس آپ بیتی کا مرکزی خیال اور مقصد و منشاء ہے۔

فکری جائزہ:

شجاعت علی راہیؔ کا چوتھا تحقیقی ناولٹ ''بلی کی آپ بیتی'' ہے۔ اس ناولٹ میں بھی انھوں نے اپنے تئیں معلومات کی ترسیل کا بہترین فریضہ انجام دیا ہے اور بچوں کو اچھی عادتیں اپنانے اور اُن میں اخلاقی اقدار کو فروغ دینے پر زور دیا ہے۔

راہیؔ نے جب یہ ناولٹ لکھا تو اس روز سچ مچ ایک بلی کا بچہ صبح کی چہل قدمی کے دوران ان کا تعاقب کر کے ان کے ساتھ گھر تک جاتا ہے جس پر انہیں بہت حیرانی ہوتی ہے۔ یہ بات راہیؔ نے راقمہ کو اپنے ایک انٹرویو میں اس طرح بتائی:

> ''ایک عجیب و غریب واقعہ میرے ساتھ یہ ہوا کہ جب میں نے یہ ناولٹ لکھا۔ تو اس دن میں صبح چہل قدمی کرنے گیا کہ اچانک کہیں سے ایک بلی کا بچہ بھی راستے میں میرے ساتھ چلنے لگا اور دیکھا تو وہ گھر تک میرے ساتھ ساتھ برابر چلتا رہا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے اُسے معلوم ہو گیا ہو کہ میں نے اس کے بارے میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے''۔ (۶۳)

یہی بات راہیؔ نے کتاب کے آغاز میں بھی لکھی ہے اور ایک طرح سے راقمہ کی بات کی تصدیق کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''میں گھر سے آگے نکل کر اس سبزے کی طرف چل پڑا تا کہ وہ بلی کا بچہ اُدھر کا رُخ کرے۔ پلٹا تو وہ بھی میرے ہمراہ پلٹا۔ چلتے چلتے اتنا قریب آ گیا کہ میرے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ نہ معلوم اسے کیسے خبر ہو گئی کہ میں نے اس کی آپ بیتی لکھی ہے۔'' (۶۴)

راہیؔ اس آپ بیتی میں بلی کی پسند و ناپسند کے زمرے میں بچوں کو اچھی اچھی عادتیں اپنانے کی تلقین کرتے ہیں کہ جس طرح بلی گندی چیزوں کو ناپسند کرتی ہے اور لڑائی جھگڑوں سے بھی دور بھاگتی ہے۔ اس طرح بچوں کو بھی اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھنا چاہئے، کیونکہ صفائی نصف ایمان ہے اور بُرائی جھگڑوں سے بھی اجتناب کرنا چاہئے۔

ناولٹ میں مانو کہتی ہے:

> ''میں گندگی کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ خود کو ہر وقت چاٹ چاٹ کر صاف کرتی رہتی ہوں۔ میری کھدری زبان میرے بدن کے لئے برش کا کام کرتی ہے۔ لڑنا پسند نہیں کرتی۔ لیکن اگر کوئی مجھ سے پنگا لے تو ڈر کر بھاگتی نہیں ہوں۔ ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہوں۔ (۶۵)

اس پیراگراف سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لڑائی جھگڑوں سے اجتناب کرنا چاہئے بلکہ ضرورت پڑنے پر اپنا

دفاع بھی کرنا چاہیے۔ ہم اپنے معاشرے میں اردگرد بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جو جانور پالنے کے شوقین تو ہوتے ہیں لیکن پھران کا خیال نہیں رکھتے، نہ ان کی خوراک کا باقاعدہ خیال رکھتے ہیں اور نہ ہی دیگر ضروریات کا۔ راہیؔ اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے ہمیں یہ یاددلاتے ہیں کہ جانور بھی اللہ کی بے زبان مخلوق ہے، ان سے شفقت سے پیش آنا چاہیے، ان کی خوراک اوردانا پانی کی فکر کرنی چاہیے۔

مانو، انمول کی پالتو بلی بننے سے پہلے ایک موٹی تازی اور نخریلی عورت کے گھر میں اپنی امی اوردو بہنوں سمیت رہا کرتی تھی۔ وہ عورت ان پر بہت ظلم کرتی تھی۔ کبھی اُن کو ڈانٹ پلاتی تو کبھی اُن پر جھاڑو اُٹھا کر پھینکتی تھی۔ کھانے کو بھی کچھ نہیں دیتی تھی۔ راہیؔ، مانو بلی کی زبانی ان الفاظ میں نصیحت کرتے ہیں:

> ''ان محترمہ سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کہ یا تو بلیاں پالو نہیں، اگر پالنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر ان بے چاریوں کا خیال رکھو۔ اُن سے شفقت سے پیش آؤ۔ ان کی خوراک ان کو پہنچاؤ آخر یہ جاندار مخلوق ہیں، کوئی پتھر تو نہیں ہے''۔ (۶۶)

مزید جب انمول، بلی کو گھر لے آتی ہے اور اس سے پیار کرتی ہے تو راہیؔ اس کے ابو کی زبانی یہ نصیحت کرتے ہیں کہ پالتو جانوروں کے ساتھ ایسا مشفقانہ بھرا سلوک کرنا چاہئے کہ جیسے وہ ہمارے خاندان کا ایک حصہ ہوں۔ کہتے ہیں:

> ''انمول بیٹی! یہ بلی اب ہمارے خاندان کا ایک حصہ ہے۔ فیملی ممبر ہے۔ اسے پالوگی تو اس کا خیال بھی رکھوگی''۔ (۶۷)

ایک اور جگہ پر راہیؔ بلی پر ظلم کرنے کی وجہ سے جہنم میں داخل ہونے والی ایک عورت کا تذکرہ کرتے ہیں، جو اُسے کھانے پینے کے لئے کچھ نہیں دیتی، یہاں تک کہ وہ مرجاتی ہے لکھتے ہیں:

> ''ایک عورت کو بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا۔ اس عورت نے بلی کو باندھ دیا، حتیٰ کہ وہ مرگئی۔ وہ اُسے نہ تو کھانے کے لئے کچھ دیتی اور نہ ہی پینے کے لئے اور نہ ہی اُسے چھوڑا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھائے، تو وہ عورت بلی کی وجہ سے جہنم کی آگ میں داخل ہوگئی۔'' (۶۸)

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب اسلام، ایسے لوگوں کو سخت وعید سناتا ہے جو جانوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس لئے پالتو جانوروں کو پالنے کے ساتھ ساتھ ان کا ہر طرح کا خیال رکھنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

بلیاں اللہ کی بہت عاجز، مقدس اور شکر گزار مخلوق ہیں۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہیں۔ ایک دفعہ جب مانو اپنی امی کو خواب میں دیکھتی ہے تو وہ اس سے اس کی دو بچھڑی ہوئی بہنوں کا حال پوچھتی ہے اور کہتی ہے:

> ''میرا دل کہتا ہے کہ وہ بھی خوش وخرم ہوں گی۔ ہم بلیاں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہیں اور خوش رہتی ہیں۔'' (۶۹)

اس اقتباس میں ہم سب انسانوں کے لئے ایک پیغام اور سبق ہے کہ ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر گزار رہنا چاہئے

کیونکہ انسان فطرتاً بہت ناشکرا واقع ہوا ہے۔

علاوہ ازیں راہیؔ اس ناولٹ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں کسی کی دل آزاری نہیں کرنی چاہئے کیونکہ اس سے نہ صرف اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات ہمیں اس دنیا میں بھی اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ ناولٹ میں جب کالی بلی مانو کو دیکھ کر اس پر حملہ کر کے اسے زخمی کرتی ہے اور اُسے ہر روز تنگ و پریشان کرتی ہے تو مانو دُعا کرتی ہے کہ کاش کچھ ایسا ہوجائے کہ اُس کالی بلی سے کسی طرح اس کی جان چھوٹ جائے۔ وہ کہتی ہے:

''میں بار بار ہی دل میں دعا کرتی رہتی تھی کہ اس خراب بلی کو کچھ ہو جائے تا کہ اس سے میری جان چھوٹ جائے۔ پتہ نہیں اُسے میری بد دعا لگی یا کوئی اور بات تھی کہ اُسے کچھ ہوگیا۔(۷۰)

اُس کالی بلی سے سچ مچ میں اس کی جان چھوٹ جاتی ہے اور وہ ایک ٹین ایجر کی تیز رفتار ڈرائیونگ کا شکار ہو کر مرجاتی ہے۔

آخر میں راہیؔ نے اس آپ بیتی میں مانو بلی کے علاوہ ایک ننھے کتے اور چوہے کا بھی ذکر کیا ہے، جس سے مانو دوستی کرنا چاہتی ہے لیکن چوہا اُس سے ڈر کر دور بھاگتا ہے جس کی وجہ وہ اُس سے دُوستی نہیں کر پاتی۔ حالانکہ اُس کا خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچانے کا سوچیں تو تینوں آپس میں بہترین دوست بن کر کھیلیں گے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ یہ جانور ایک دوسرے پر حملہ کر کے کھانے کو دوڑتے ہیں، لیکن راہیؔ نے ان کو بے ضرر دکھا کر ان کی آپس میں دوستی قائم کی ہے اور یہ سبق دینے کی کوشش کی ہے کہ اگر نیت صاف ہو تو دشمن کو بھی دوست بنایا جاسکتا ہے۔ مانو بلی اس بارے میں کہتی ہے:

''میرا خیال ہے تھوڑے ہی دنوں بعد مجھ سے دوستی کرے گا اور پھر وہ چوہا، ننھا کتا، اور میں تینوں مل کر کھیلا کودا کریں گے۔ اگر نیت خراب نہ ہو اور ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچایا جائے تو بڑے بڑے دشمن بھی دوست بن جایا کرتے ہیں۔''(۷۱)

المختصر راہیؔ نے یہ تمام اچھی باتیں اور نصیحتیں ہلکے پھلکے انداز میں اس طرح کہانی میں ضم کر کے پیش کی ہیں جو سیدھا انسان کے دل میں اُتر جاتی ہیں اور پڑھنے والا بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔

فنی جائزہ:

ناولٹ ''بلی کی آپ بیتی'' نہ صرف فکری لحاظ سے منفرد خصوصیات کا حامل ہے، بلکہ فنی لحاظ سے بھی یہاں راہیؔ نے اپنا زورِ قلم آزمایا ہے۔ ناولٹ نگاری کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے بچوں کے لئے دلچسپ، مفید اور بامقصد ادب کی تخلیق راہیؔ کی فنی عظمت اور بالیدگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنے وسیع تر معلومات اور تجربات کو نئی نسل تک پہنچانے کے لئے راہیؔ نے ادبِ اطفال کو منتخب کر کے نہ صرف ہماری آئندہ آنے والی نسلوں پر احسان کیا ہے، بلکہ ادبِ اطفال کے دامن کو بھی اپنی بیش قیمت تخلیقات کے سبب وسعت اور رونق بخشی ہے۔

پلاٹ:

راہیؔ چونکہ بچوں کی نفسیات کے ماہر ہیں، اس لئے انھوں تقریباً اپنے تمام ناولٹوں کے موضوعات بھی ایسے منتخب کیے ہیں، جن میں عموماً بچوں کی دلچسپی زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے دیگر ناولٹوں کی طرح، اس ناولٹ کا پلاٹ بھی سادہ اور اکہرا ہے، اور ہر قسم کی پیچیدگیوں سے مبرا ہے۔ ایک بلی کی آپ بیتی ہونے کے ناطے نہ صرف اس ناولٹ کے واقعات دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے ہیں بلکہ واقعات کی ایک خاص ترتیب بھی قابل ستائش ہے۔ تمام واقعات یکے بعد دیگرے اس منطقی ترتیب سے رونما اور واقع ہوتے ہیں کہ جیسے ہم خود انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ شروع سے لے کر آخر تک کہانی ایک ربط اور تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتی ہے، جس کی وجہ سے پلاٹ میں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ جیسے موٹی تازی نخریلی عورت کا مانو بلی کو گھر سے نکالنا، پھر انمول کا اُسے اپنے گھر لے آنا، مانو کو اغوا کے کرنے کی کوشش کو ناکام بنانا، انمول کا مانو کو نورالعین اور گل اندام کے حوالے کرنا، اور ملک سے باہر جانا، اس دوران مانو کا غلطی سے کسی اور کے گھر جانا، پھر وہاں سے گل اندام اور نورالعین کا اُسے دوبارہ گھر لانا، مانو کا پڑوس میں ایک کالی بلی سے واسطہ پڑنا اور پھر اس کا حادثاتی طور پر مرنا، مانو کا نئے دوست بنانا اور انمول کی دوبارہ وطن واپسی کی خوشخبری سُننا وغیرہ۔ یہ تمام واقعات کہانی کو ایک تسلسل کے ساتھ آگے بڑھاتے ہیں جس سے قاری کی دلچسپی شروع سے لے کر آخر تک قائم و بحال رہتی ہے۔

کردار نگاری:

راہیؔ کے ناولٹ نگاری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر ناولٹوں میں حقیقی کردار پیش کیے ہیں۔ زیرِ نظر ناولٹ میں بھی راہیؔ نے ایک دو فرضی کرداروں کے علاوہ باقی سب کردار حقیقی شامل کیے ہیں۔ اس کہانی میں دو قسم کے کرداروں سے کام لیا گیا ہے، ایک انسانوں کے کردار اور دوسرے جانوروں کے کردار۔ انسانوں کے کردار میں انمول، مصنف کی پوتی ہے۔ اسی طرح نورالعین، گل اندام نواسیاں اور شایان پوتا ہے۔ دادا بابا شجاعت یعنی مصنف خود ہے۔ اس کے علاوہ اس آپ بیتی میں موٹی تازی نخریلی عورت اور ایک بچی کے فرضی کردار بھی شامل ہیں۔

راہیؔ ان کرداروں کے حقیقی ہونے کے متعلق خود لکھتے ہیں:

> ''بلی کی اس خودنوشت میں جن کرداروں کا ذکر آیا ہے، ایک آدھ کے علاوہ سب کے سب حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انمول مصنف کی پوتی، شایان پوتا اور گل اندام اور نورالعین نواسیاں۔ ابو، امی (قندیل شجاعت اور عروس) انمول کے والدین ہیں۔ اسی طرح نورالعین اور گل اندام کے والدین (آفتاب اور غزل) دادا بابا اور دادی (شجاعت فرحت) گل اندام کے دادا ابو (الطاف حسین شاہ) ،کومل (انمول کی پھوپھی)، فرزانہ (مصنف کی ہمشیرہ)۔ یہ سب جیتے جاگتے کردار ہیں اور قریب قریب اپنی اصل خصوصیات کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ ایک آدھ کردار، جیسے موٹی تازی نخریلی عورت اور

ایک بچی کے فرضی کردار ہیں، جو کہانی کو آگے بڑھانے کیلئے تراشے گئے ہیں۔''(۷۲)

جانوروں کے کردار میں مانو بلی، خوفناک کالی بلی، مانو کی امی، اس کی دو بچھڑی ہوئی بہنیں (بلیاں) ننھا منا سفید سا کتا، اور ایک چوہا شامل ہیں۔

چونکہ پوری کہانی ایک آپ بیتی کی صورت میں مانو بلی کی زبانی بیان ہوتی ہے اس لئے ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مانو ہی اس کہانی کا مرکزی کردار ہے، باقی سارے کردار کہانی میں ضمنی طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ مانو بلی کا تعارف راہیؔ خود اس کی زبانی یوں کرتے ہیں:

''آپ مانیں یا نہ مانیں، میں مانو بلی ہوں گلابی ناک والی، نیلی آنکھوں والی مانو۔ میری شاندار قسم کی مونچھیں ہیں۔ جنہیں آپ گل مچھے یا وسکرز بھی کہہ سکتے ہیں۔''(۷۳)

غرض راہیؔ نے اسی طرح تمام کرداروں کو موقع کی مناسبت سے بڑی خوب صورتی کے ساتھ سنوارا اور پیش کیا ہے۔

مکالمہ نگاری:

یہ ناولٹ چونکہ ایک بلی کی آپ بیتی ہے اور مانو بلی یک طرفہ اپنی زبانی خود پر بیتنے والے چھوٹے چھوٹے حالات و واقعات سناتی ہے، اس لئے مکالمہ نگاری کی بھی چھوٹی چھوٹی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ راہیؔ نے تمام مکالمے کرداروں کی نفسیات اور ضرورت کے تحت تخلیق کیے ہیں۔ مانو بلی مختلف کرداروں سے جو گفت وشنید کرتی ہے، مختصر طور پر کر کے آگے بڑھتی ہے اور آگے بڑھ کر کوئی اور واقعہ یا بات سناتی ہے مثلاً:

''انہوں نے جو مجھے اس بچی کی گود میں دیکھا تو چلتے چلتے رُک گئیں۔ گل اندام نے نورالعین سے پوچھا ''کیا یہ وہی بلی نہیں ہے؟''۔

نورالعین بولی'' ہے تو وہی۔ چلو، ذرا پتہ کرتے ہیں۔''

نور نے گھور کر اس بچی کو دیکھا اور استفسار کیا ''یہ تو انمول کی بلی ہے تمہارے پاس کہاں سے آ گئی؟''۔

وہ کہنے لگی ''نہیں، میری ہے۔''

گل اندام بولی ''نہیں، ہماری''۔(۷۴)

ایک روز کسی جگہ پر کالی بدشکل خوفناک بلی سے مانو کی لڑائی ہوتی ہے تو آپس میں یوں بات چیت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں:

''ذرا دیر گھورنے کے بعد مجھ سے کہنے لگی، تم مجھے گھور کیوں رہی ہو؟''

میں نے چڑ کر کہا'' گھور تو تم رہی ہو۔ میں تو بس دیکھ رہی ہوں''۔

بولی ''تمھاری یہ جرات کہ مجھ پر الزام لگاؤ۔'' میں نے جواب دیا'' بھئی! میں تو سچ کہہ رہی ہوں''۔

آگ بگولہ ہو کر کہنے لگی۔

''تم بے حد جھوٹی بلی ہو۔ تمہیں کس بے وقوف نے اپنے گھر پال رکھا ہے۔''

مجھے بھی غصہ آ گیا، ''تم گل اور نور کو بیوقوف کہہ رہی ہو کہ انمول کو؟ خبردار! جو پھر ایسا کہا''۔(۷۵)

یہ مکالمے مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور بچوں کی نفسیات کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔

منظر نگاری:

فنی لحاظ سے ناولٹ کی منظر کشی بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔اس سے ایک طرف تو قاری بوریت کا شکار نہیں ہوتا اور دوسری طرف خوب صورت مناظر کچھ لمحوں کے لئے اس کے ذہن وفکر کو بھی معطر کر دیتے ہیں۔ایک شاعر ہونے کے ناطے راہیؔ الفاظ کا خوب صورت اور برمحل استعمال کر کے بہترین مرصع کاری کی صلاحیت رکھتے ہیں۔خاص طور پر اپنے تمام ناولٹوں میں فطری مناظر کی خوب صورتی کا نقشہ اس انداز سے کھینچتے ہیں جیسے کوئی فوٹو گرافر کیمرے کی آنکھ سے کسی منظر کی تصویر بناتا ہو۔ راہیؔ نہ صرف فطری مناظر کی دلکشی کو بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں، بلکہ انسانی جذبات، حالات و واقعات اور کرداروں کی حقیقی منظر کشی میں بھی کمال رکھتے ہیں۔زیر نظر ناولٹ میں بھی مانو ایک حسین خواب دیکھتی ہے جس کو راہیؔ دلچسپ انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''کل رات میں نے بڑا دلچسپ خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں کوہ قاف کی ایک پری بن کر اُڑتی ہوئی تمہارے پاس تھائی لینڈ کے جزیرے میں پہنچ جاتی ہوں۔وہاں پہنچتے ہی دیکھتی ہوں کہ عورتوں اور بچوں کا ایک عظیم الشان جلوس میرے استقبال کے لئے کھڑا ہے۔عورتوں کے ہاتھوں میں تحفے ہیں اور بچوں کے ہاتھوں میں گل دستے۔تم سب سے آگے کھڑی ہو اور مجھے پھولوں کا ایک بُوکے دے کر گلے لگاتی ہو۔پھر دوسرے بچے بچیاں اور عورتیں مجھے پھولوں، ہاروں، گلدستوں اور تحفوں سے لاد دیتی ہیں۔سب عورتیں تالیاں پیٹ رہی ہیں، خوشی سے ناچ رہی ہیں۔جھوم رہی ہیں۔
>
> مجھے تھائی لینڈ کے ایک عالی شان محل میں پہنچایا جاتا ہے۔ جہاں تالابوں میں خوش رنگ مچھلیاں تیر رہی ہوتی ہیں۔تم ہیرے جواہرات سے لدے ہوئے تخت پر ملکہ بن کر براجمان ہوتی ہو اور مجھے ایک شہزادی کی طرح تمہارے پہلو میں ایک چھوٹے لیکن دلکش تخت پر بٹھادیا جاتا ہے۔(۷۶)

غرض ہر قسم کی منظر کشی پر راہیؔ کو صحیح معنوں میں مکمل عبور حاصل ہے اور ہم اُنہیں بجا طور پر ایک بہترین منظر نگار تصور کر سکتے ہیں۔

اسلوب اور زبان و بیان:

جہاں تک اس ناولٹ کے اسلوب اور انداز بیان کا تعلق ہے تو وہ نہایت سادہ، عام فہم اور بچوں کی نفسیات کا عین

مظہر ہے، قصے کا انداز بیانیہ ہے۔ پوری کہانی مانو بلی کی زبانی ہم تک پہنچتی ہے جو مختلف حالات اور واقعات کو اس دلچسپی سے بیان کرتی ہے کہ قاری کی توجہ کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ الفاظ کا بہترین چناؤ اور مناسب و برمحل استعمال کیا گیا ہے۔ پورے ناولٹ میں مشکل اور غیر مانوس الفاظ کہیں پر بھی نہیں ملتے۔ زبان خاص طور پر ایسی شستہ اور رواں ہے جو خالصتاً بچوں کی ہی زبان ہے۔ تمام عبارات سادہ اور سلیس انداز میں تحریر کیے گئے ہیں۔

المختصر راہیؔ کا تحریر کردہ ناولٹ ''بلی کی آپ بیتی'' نہ صرف زبان و بیان کے لحاظ سے ایک بہترین شاہکار ہے بلکہ ناولٹ نگاری کے تمام فکری و فنی محاسن سے ہم آہنگ ہے، وحدت تاثر کی بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ بلا شبہ راہیؔ اپنے اس ناولٹ کے ذریعے بچوں تک تحقیقی معلومات احسن طریقے سے پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

۵۔ ناولٹ کبوتر:

''کبوتر'' شجاعت علی راہیؔ کا پانچواں ناولٹ ہے۔ اگر چہ شجاعت علی راہیؔ نے ناولٹ نگاری میں ہمیشہ تحقیقی موضوع پر ہی قلم اُٹھایا ہے، جس کے بارے میں انہوں نے باقاعدہ تحقیق کی ہوتی ہے، تاہم ان کے موضوعات میں ایک تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ کبھی وہ ''چیونٹیوں'' پر تحقیق کر کے ان کی اقسام، عادات اور جبلتوں کے بارے میں بات کرتے ہیں تو کبھی ''تتلیوں'' کی دیس کی کہانی سناتے ہیں۔ کبھی ''ڈائنا سور'' جیسے عجیب الخلقت مخلوق کے بارے میں ڈھیر ساری معلومات فراہم کرتے ہیں، تو کبھی کسی بلی کی ''آپ بیتی'' سناتے ہیں۔ اسی طرح اگر پرندوں کی بات کریں تو اُس پر بھی راہیؔ نے شاعری کر کے بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ یہاں تک کہ پروفیسر منور رؤف نے انہیں پرندوں کے شاعر کا نام دیا۔ ان کے شعری مجموعے ''پھول کھلے یا نہ کھلے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

> ''پھول کھلے یا نہ کھلے'' کے مطالعے نے جو تاثرات میرے ذہن پر مرتسم کیے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ واضح اور نمایاں تاثر یہ ہے کہ شاعر کو پرندوں سے بہت دلچسپی ہے۔ اس کے کلام میں جا بجا پرندوں کا ذکر آتا ہے۔ کہیں وہ کبوتر کی بات کرتا ہے اور کہیں فاختہ کی۔۔۔۔ کبھی وہ جگنو کی تلاش میں نکلتا ہے تو اُسے محبوب جیسا مہتاب مل جاتا ہے۔'' (۷۷)

''کبوتر'' کے بارے میں بھی ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

آنکھیں کُھلیں تو دوستوں چکر ہی اور تھا
بھیجا تھا ہم نے جو وہ کبوتر ہی اور تھا'' (۷۸)

پُرانے وقتوں میں کبوتر بہترین ''نامہ بر'' ہوتے تھے۔ راہیؔ نے بھی شاید کبوتر کی اسی خصوصیت کو مدنظر رکھ کر یہ شعر تخلیق کیا ہے۔ دیگر ناولٹوں کی طرح ناولٹ ''کبوتر'' بھی راہیؔ کے زرخیز تخلیقی اور تحقیقی ذہن کا کرشمہ ہے۔ اس ناولٹ میں انہوں نے کبوتر کی صفات، اس کی تاریخی اہمیت و تقدس اور خصوصیات کو زیر بحث لایا ہے اور انسانوں کے ساتھ اس کے

مظہر ہے، قصے کا انداز بیانیہ ہے۔ پوری کہانی مانو بلی کی زبانی ہم تک پہنچتی ہے جو مختلف حالات اور واقعات کو اس دلچسپی سے بیان کرتی ہے کہ قاری کی توجہ کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ الفاظ کا بہترین چناؤ اور مناسب و برمحل استعمال کیا گیا ہے۔ پورے ناولٹ میں مشکل اور غیر مانوس الفاظ کہیں پر بھی نہیں ملتے۔ زبان خاص طور پر ایسی شستہ اور رواں ہے جو خالصتاً بچوں کی ہی زبان ہے۔ تمام عبارات سادہ اور سلیس انداز میں تحریر کیے گئے ہیں۔

المختصر راہیؔ کا تحریر کردہ ناولٹ ''بلی کی آپ بیتی'' نہ صرف زبان و بیان کے لحاظ سے ایک بہترین شاہکار ہے بلکہ ناولٹ نگاری کے تمام فکری و فنی محاسن سے ہم آہنگ ہے، وحدت تاثر کی بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ بلا شبہ راہیؔ اپنے اس ناولٹ کے ذریعے بچوں تک تحقیقی معلومات احسن طریقے سے پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

۵۔ ناولٹ کبوتر:

''کبوتر'' شجاعت علی راہیؔ کا پانچواں ناولٹ ہے۔ اگرچہ شجاعت علی راہیؔ نے ناولٹ نگاری میں ہمیشہ تحقیقی موضوع پر ہی قلم اُٹھایا ہے، جس کے بارے میں انہوں نے باقاعدہ تحقیق کی ہوتی ہے، تاہم ان کے موضوعات میں ایک تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ کبھی وہ ''چیونٹیوں'' پر تحقیق کر کے ان کی اقسام، عادات اور جبلتوں کے بارے میں بات کرتے ہیں تو کبھی ''تتلیوں'' کی دیس کی کہانی سناتے ہیں۔ کبھی ''ڈائنا سور'' جیسے عجیب الخلقت مخلوق کے بارے میں ڈھیر ساری معلومات فراہم کرتے ہیں، تو کبھی کسی بلی کی ''آپ بیتی'' سناتے ہیں۔ اسی طرح اگر پرندوں کی بات کریں تو اُس پر بھی راہیؔ نے شاعری کر کے بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ یہاں تک کہ پروفیسر منور رؤف نے انہیں پرندوں کے شاعر کا نام دیا۔ ان کے شعری مجموعے ''پھول کھلے یا نہ کھلے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

> ''پھول کھلے یا نہ کھلے'' کے مطالعے نے جو تاثرات میرے ذہن پر مرتسم کیے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ واضح اور نمایاں تاثر یہ ہے کہ شاعر کو پرندوں سے بہت دلچسپی ہے۔ اس کے کلام میں جا بجا پرندوں کا ذکر آتا ہے۔ کہیں وہ کبوتر کی بات کرتا ہے اور کہیں فاختہ کی۔۔۔۔ کبھی وہ جگنو کی تلاش میں نکلتا ہے تو اُسے محبوب جیسا مہتاب مل جاتا ہے۔'' (۷۷)

''کبوتر'' کے بارے میں بھی ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

ے آنکھیں کھلیں تو دوستوں چکر ہی اور تھا
بھیجا تھا ہم نے جو وہ کبوتر ہی اور تھا۔'' (۷۸)

پُرانے وقتوں میں کبوتر بہترین ''نامہ بر'' ہوتے تھے۔ راہیؔ نے بھی شاید کبوتر کی اسی خصوصیت کو مدنظر رکھ کر یہ شعر تخلیق کیا ہے۔ دیگر ناولٹوں کی طرح ناولٹ ''کبوتر'' بھی راہیؔ کے زرخیز تخلیقی اور تحقیقی ذہن کا کرشمہ ہے۔ اس ناولٹ میں انہوں نے کبوتر کی صفات، اس کی تاریخی اہمیت و تقدس اور خصوصیات کو زیر بحث لایا ہے اور انسانوں کے ساتھ اس کے

قریبی رشتے کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ناولٹ کے موضوع کے بارے میں راہیؔ خود کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> ''اس ناولٹ کے لئے میرا موضوع کبوتر، اس کی حیرت انگیز صفات اور انسانوں سے اس کا قریبی رشتہ ہے۔ ناولٹ جو نو ہزار سے کچھ کم الفاظ پر مشتمل ہے۔ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ کبوتر کے مقدس روپ کا ہے اور اس کا اسلوب تحریر سنجیدہ ہے۔ دوسرے حصے میں آپ طنز و مزاح کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ سنجیدگی اور مزاح کا ملاپ کارے دارد۔ تاہم میں یہ جسارت کر بیٹھا ہوں۔'' (۷۹)

راہیؔ نے چونسٹھ (۶۴) صفحات اور دیدہ زیب سرورق پر مشتمل اپنے اس ناولٹ کا انتساب اپنے بھائی میجر (ر) ریاض علی شاہ کے نام کیا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ کتاب کا پیش لفظ (دیباچہ) بھی ریاض علی شاہ نے ہی لکھا ہے۔ یہ اس کتاب کی انفرادیت ہے کہ اس کا انتساب اور دیباچہ ایک ہی شخص کے نام سے موسوم ہے۔ ناولٹ کا دوسرا حصہ چونکہ ''جاسوس کبوتر'' کے عنوان سے ہے، اس لئے راہیؔ نے اس کا دیباچہ اپنے بھائی میجر (ر) ریاض علی شاہ سے لکھوایا ہے کیونکہ بھی کافی عرصے سے انٹیلی جنس کے محکمے سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ اس بارے میں میجر (ر) ریاض علی شاہ لکھتے ہیں:

> ''پپو'' نے ''کبوتر'' کا دیباچہ مجھے لکھنے کو کہا۔ میری تقریباً دو دہائیوں کی نوکری انٹیلی جنس پر محیط ہے۔ اور پپو کی خیالی جاسوس کبوتر کی وجہ سے شاید بھائی پپو نے دیباچہ لکھنے کا کام مجھے سونپا۔ سوچتا ہوں پپو نے مجھے کبوتر کی خصوصیات کی آگاہی کے بارے میں اتنی دیر کیوں کر دی۔ پپو نے شروع ہی میں کبوتروں کی خصوصیات کے بارے میں آگاہ کیا ہوتا تو کبوتروں کا استعمال میری انٹیلی جنس کی نوکری میں بڑی آسانیاں پیدا کرتا اور میری کارکردگی کو چار چاند لگا تا۔'' (۸۰)

راہیؔ نے اس ناولٹ میں مفید اور کچھ نئے معلومات کو کہانی کا حصہ بنایا ہے اور خود پپو بن کر کبوتر کے متعلق پیش آنے والے مختلف واقعات کو ہم تک بہت دلچسپ، پُر اثر اور معلوماتی انداز میں پہنچایا ہے۔ کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ پپو اپنے کمرے کا دریچہ کھولتا ہے ۔ جہاں وہ ہمسایوں کے چھت پر غڑغوں غڑغوں کرنے والے خوب صورت کبوتروں کو روز دیکھتا اور سنتا ہے۔ ایک روز کبوتر کو دیکھ کر اس کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ کیوں نہ کمپیوٹر میں اس کے بارے میں کچھ معلومات تلاش کر کے حاصل کی جائیں؟ چنانچہ جیسے ہی وہ کی بورڈ پر انگلیاں چلا کر لفظ ''کبوتر'' لکھتا ہے، تو کبوتروں کے بارے میں بے شمار فائلیں کھلتی ہیں۔ پپو اس پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر تصورات کی دنیا میں کبوتروں کے ساتھ مختلف ادوار میں داخل ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس کا تصوراتی سپنا اُسے طوفان نوحؑ کے دور میں لے جاتا ہے، جہاں وہ دیکھتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم سخت قسم کے عذاب میں مبتلا ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے، مکان ڈوب رہے ہیں، ہر سمت چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دی رہی ہیں۔ ایک ایک کر کے سب لوگ ڈوب رہے ہیں۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کی بہت کوشش کرتے ہیں کہ لوگو! بدکاریاں چھوڑ کر اللہ کے راستے پر آؤ لیکن کوئی بھی ان کی کوئی بات نہیں

مانتا۔صدیوں کی تبلیغ کے بعد آخر کار حضرت نوحؑ نا اُمید ہو کر ان کے لئے بدعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ اس لئے ان پر اللہ کی طرف سے سیلاب اور طوفان آتا ہے۔ یہ عذاب حضرت نوحؑ کی بدعا کا نتیجہ ہوتا ہے۔ طوفان نوحؑ کا آغاز عراق میں موجودہ مسجد کوفہ سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ایک تنور میں پانی اُبلنا شروع ہوتا ہے، جو رفتہ رفتہ ہر طرف پھیل کر پوری بستی کو اپنے لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

حضرت نوحؑ نے اس دوران ایک لمبی چوڑی کشتی اپنے نیکوکار بندوں کے لئے بنائی ہوتی ہے۔ طوفان کے آتے ہی حضرت نوحؑ اپنے بندوں کو کشتی میں بیٹھا کر روانہ ہو جاتے ہیں وہ اس وقت بھی اپنے بیٹے کو سیدھے راستے پر آنے کی دعوت دے کر کشتی میں آنے کو کہتے ہیں لیکن وہ نافرمان باپ کی بات نہ مانتے ہوئے کافروں کا ساتھ دیتا ہے۔ نتیجتاً ان کے ساتھ ہی پانی میں غرق ہو جاتا ہے۔

اب حضرت نوحؑ اور ان کے پیروکار، کشتی میں سوار ہو کر خشکی کا سُراغ لگانے کی فکر میں ہوتے ہیں، تا کہ کشتی کو لنگر انداز کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے کبوتر (جو ایک مقدس پرندہ ہے) کی خدمات لینے کا فیصلہ ہوتا ہے اور یہ خوش قسمتی اُس کے حصے میں آتی ہے کہ وہ حضرت نوحؑ کی کشتی کو بحفاظت خشکی کا علاقہ دریافت کر کے کنارے پہنچائے۔ کبوتر کو چونکہ خداوند تعالیٰ نے ایک ایسے کمپاس (صلاحیت) سے نوازا ہے کہ وہ دور دراز کا سفر کر کے بھی اپنے ٹھکانے کو نہیں بھولتا، کیونکہ اس کی چونچ میں لوہے کے اجزاء جیسا ایک پیچیدہ نظام ہوتا ہے جس سے وہ مختلف مقامات اور جگہوں کی صحیح پہچان و شناخت کر سکتا ہے۔ کبوتر اس مقصدِ عظیم کے لئے دور دراز کا سفر طے کر کے بالآخر مکہ مکرمہ کی سرزمین پر پہنچتا ہے۔ وہاں اُتر کر اس مقدس زمین کی سُرخ مٹی کو ثبوت کے طور اپنے پاؤں سے لگاتا ہے اور خشکی کے علاقے کو دریافت کرنے کی یہ خوشخبری حضرت نوحؑ کو سُناتا ہے۔ پھر حضرت نوحؑ اور کشتی میں سوار، ان کے پیروکاروں کو بحفاظت خشکی کے علاقے پہنچا کر انسان دوستی کی سُنہری تاریخ رقم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کبوتروں کو ایک مقدس پرندہ سمجھ کر لوگ اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہیں اور اُسے امن کا استعارہ سمجھتے ہیں۔ پپو بھی تصوراتی دنیا سے باہر آ کر کبوتر کو پیار سے دیکھتا ہے اور اس کی عظمت کو سلام کرتا ہے۔

اس کے بعد پپو تھوڑی دیر کے لئے پھر دریچے سے باہر جھانک کر فضا میں اُڑتے ہوئے کچھ اور کبوتروں کے ساتھ سپنوں کی وادی میں چلا جاتا ہے۔ اس دفعہ وہ حرم کعبہ پہنچتا ہے، جہاں بہت سارے لوگوں کو کبوتروں کو دانا ڈالتے ہوئے دیکھتا ہے۔ وہاں اُسے معلوم ہوتا ہے کہ حرم کے احاطے میں ایک خاص نیلے اور سبزی مائل پَر رکھنے والے کبوتر تقدس کے حامل کبوتر ہیں، اس لئے کہ یہ وہ نسلی کبوتر ہیں جنہوں نے غار سور میں آپؐ کے قیام کے دوران گھونسلے بنا کر انڈے دیئے تھے۔ ایک اور روایت میں ان کا تعلق ان ابابیلوں سے بھی ہے جنہوں نے یمنی بادشاہ ابرہہ الاشرام اور اس کی فوج پر کنکر

یاں برسائی تھیں۔ پھر پپو کبوتر کے متعلق کچھ اور اہم باتوں کا ذکر کرتا ہے کہ کس طرح کبوتر نے ایک مقدس روپ میں مختلف انبیاء کا ساتھ دیا۔ مثلاً قید تنہائی میں حضرت یحییٰؑ کی خبر گیری کرنا، ابراہیمؑ کے آگ میں پھینکے جانے اور آتش نمرود کے گلزار ہونے کے بعد ان کے کندھے پر بیٹھنا، حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ میں دُعائیں مانگنے پر آمین کہنا، حضرت موسیٰؑ کے پالنے کے ساتھ ساتھ دریا کے اُوپر امن کا استعارہ بن کر پرواز کرنا وغیرہ۔

صرف اسلام ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب جیسے عیسائیت، بدھ مت، ہندوازم اور سکھ ازم سب میں کبوتروں کی حرمت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ پپو دیکھتا ہے کہ پانچ ہزار قبل مسیح کے مسیو پوٹیمیا اور تین ہزار قبل مسیح کے مصر میں بھی کبوتروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد پپو کو کبوتروں کے حوالے سے ایک دلچسپ اور سبق آموز اساطیری قصہ بھی یاد آتا ہے جس میں ایک راجا انصاف اور ہمدردی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک کبوتر کو اپنی پناہ میں لیتا ہے اور اُسے کھانے کے لئے باز (شاہین) کے حوالے نہیں کرتا۔ ایک دفعہ پپو کی نظر کبوتروں کے بارے میں مزید تحقیق کرتے ہوئے حفیظ عثمانی کی ایک تحریر پر پڑتی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک سچا واقعہ ہے۔ اس واقعہ میں عراق کے ایک شہر حلب کا تاجر عالم سفر میں ہوتا ہے کہ ایک ڈاکو اُسے لوٹتا ہے۔ لوٹنے کے بعد اُسے دو کبوتروں کے سامنے بے گناہ قتل بھی کر دیتا ہے جو اس کی قتل پر گواہ بن جاتے ہیں۔ ایک روز یہی قاتل آدمی، امیروں کے کسی بہت بڑی دعوت میں شامل ہوتا ہے۔ تو ایک ڈش میں دو بھنے ہوئے کبوتروں کو دیکھ کر تاجر کے قتل کا واقعہ کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر خود بخود دہراتا ہے، اتفاق سے وہاں ایک قاضی بھی موجود ہوتا ہے جو اس کے اس بیان پر پورے مجمع کو گواہ ٹھہرا کر اسے موت کی سزا دیتا ہے۔ یہ ایک طرح سے کبوتروں کی بے مثال گواہی ہوتی ہے، جو اُس قاتل کو کیفر کردار تک پہنچاتی ہے۔

کبوتروں کے بارے میں پپو کو کمپیوٹر سے مزید معلومات حاصل کر کے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قدیم دور میں کبوتروں کو بہترین نامہ بر سمجھا جاتا تھا۔ خاص طور پر مغلیہ دور حکومت میں ان کو پیغام رسانی کے مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اکبر کبوتروں کا اس قدر شوقین تھا کہ ایک اندازے کے مطابق بیس ہزار کبوتر اس کی تحویل میں تھے، صرف یہی نہیں، کبوتروں نے جنگ عظیم اوّل اور دوم میں بھی پیغام رسانی کی بہترین خدمات انجام دی ہیں۔ موجودہ دور میں بھی کبوتر اسرائیل، فرانس، سویڈن، سوئٹزرلینڈ اور چین کی افواج کے زیر استعمال ہے۔ کبوتر کی جملہ خصوصیات اور کارناموں کو دیکھ کر پپو کے دل میں بھی کبوتر پالنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کی امی اور ابو اُسے اس شغل سے دور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں، جسے پپو مان لیتا ہے لیکن وہ اپنے شوق و تجسس کی تسکین کی خاطر پھر بھی لائبریری کا رُخ کر کے کبوتروں کے بارے میں مزید سائنسی معلومات حاصل کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے پپو مختلف کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے کہ اس دوران اس کے ہاتھ ایک ایسی کتاب لگتی ہے جسے پڑھ کر اُسے حیرانی ہوتی ہے کہ سائنس کی دنیا میں کبوتروں کی اہمیت اور افادیت اس کی سوچ سے کہیں

زیادہ بڑھ کر ہے۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا کی تحقیقات کے مطابق کبوتر کا وژن انسانوں سے کسی درجے کم نہیں ہے بلکہ انسانوں کے مقابلے میں وہ ویولینگتھ (Wavelenght) کو زیادہ اچھی طرح جانچ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کبوتر مختلف چیزوں کو الگ کیٹگری میں بانٹنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اس کی چونچ میں ایک الیکٹرانک آلہ (Device) ہوتی ہے جو راستہ کھوج نکالنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ ان ساری باتوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے پپو کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش وہ بھی ایک کبوتر ہوتا۔

ایک دن پپو کمپیوٹر پر کبوتروں سے متعلق کچھ اور فائلوں کا جائزہ لے رہا ہوتا ہے کہ اچانک اس کی نظر ایک دلچسپ خبر "جاسوس کبوتر جانباز خان فرار ہونے میں کامیاب" پر پڑتی ہے۔ یہ کبوتر ایک راجستانی پولیس اہلکار سے معائنہ کے دوران پنجرے سے فرار ہو چکا ہوتا ہے۔ بھارتی ذرائع کے مطابق یہ کبوتر پاکستان سے جاسوسی کرنے کے لئے آیا ہوتا ہے جو پولیس کی غفلت کی وجہ سے فرار ہو جاتا ہے، صرف یہی نہیں، بلکہ اسی طرح کے کئی اور کبوتر بھی پاکستان کی طرف سے جاسوسی کی غرض سے اور جو بھارتی وزیر اعظم نریندرا مودی کو دھمکی آمیز پیغامات پہنچانے کیلئے بھیجے گئے ہوتے ہیں۔ پپو کو اس خبر پر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ وہ اس طرح کے کئی اور واقعات تجسس اور دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہے اور ہنستا ہے۔

اسی اثناء میں ایک اور کبوتر نریندرا مودی کے گھر میں مٹر گشتی کرتے دیکھا جاتا ہے جس کا سختی سے نوٹس لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ کبوتر بھی اتفاقاً فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس جاسوس کبوتر کے فرار ہونے پر بھارتی حکومت ہر کبوتر کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔ مختلف قسم کے کبوتروں پر مختلف تحقیقات کی جاتی ہیں کہ کہیں وہ سُراغ رساں اور جاسوس کبوتر تو نہیں؟ اس سلسلے میں دُبئی کی طرح کبوتروں کی نقل وحرکت کو محدود کرنے کی تجاویز پر بھی غور کیا جاتا ہے۔ تمام کبوتر بازوں کو اپنے کبوتر رجسٹر کروانے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ مندروں، مسجدوں، گنبدوں اور پارکوں کے آوارہ کبوتروں کی نگرانی بھی عمل میں لائی جاتی ہے۔ مزید برآں سراغ رسانوں کو بھی الرٹ کیا جاتا ہے کہ وہ شعبہء جاسوسی میں کبوتر کی سرگرمیوں اور کردار کا تعین کریں۔ غرض مختلف قسم کی معلومات کو پروسیس کرنے کے بعد اس کے نتائج کو بلیک باکس جیسے محفوظ صندوق میں ڈال کر وزیر اعظم نریندرا مودی کو بھیجا جاتا ہے۔ لیکن جب یہ بلیک باکس نریندرا مودی کے پاس پہنچتا ہے تو اس میں سوائے کبوتروں کے چند پروں کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا، جس پر نریندرا مودی کو یہ شک گزرتا ہے کہ یہ معلومات بھی پاکستانی جاسوس کبوتر اُڑا کر لے گیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد پاکستان اور بھارت دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی بڑھ جاتی ہے۔ نریندرا مودی پاکستان کی دہشت گردی پر ایک دھواں دار تقریر کر کے خبردار کرتا ہے کہ آئندہ کوئی بھی پاکستانی جاسوس کبوتر ان کی سرحدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ملک کے حدود میں داخل ہوا تو اس کے خلاف سخت کارروائی عمل میں لائی جائے گی، جبکہ دوسری طرف پاکستان، بھارت کو اس قسم کی تمام غیر تصدیق شدہ باتوں سے دست بردار ہونے کا کہتا ہے۔ اس کے

ساتھ ہی پاکستان میں یہ خبر پھیل جاتی ہے کہ بھارت نے ہمارے چند معصوم کبوتروں کو گرفتار کیا ہے، جو غلطی سے پرواز کرتے ہوئے ان کے ملکی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ پھر جگہ جگہ ان کی رہائی کے مطالبے اور احتجاج ہونے لگتے ہیں۔ پاکستان میں کبوتر پروری کے شوقین خاندانی لوگ بھی اس احتجاج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور پورے زور وشور سے کبوتروں کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ پپو تصورات کی دنیا میں سوتے ہوئے، ہندو پاک کی کبوتر جنگ میں کھویا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس سنجیدہ صورتحال پر سوچ کر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان اتنی چھوٹی سی بات کو مسئلہ (ایشو) بنانے کی ایک ہی وجہ ہے، وہ یہ کہ ہمارے دلوں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ دونوں ممالک ہتھیاروں سے لیس اور ایٹمی پاور ہیں۔ حکومت اور عوام دونوں، نفرتوں کے سیلاب میں بہتے جارہے ہیں۔ ایسی صورت حال میں نفرت کا جواب نفرت سے نہیں بلکہ محبت سے دینا چاہئے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس کے ذہن میں ایک ترکیب آتی ہے۔ وہ کبوتروں کا ایک جوڑا اپنی پاکٹ منی سے خرید لیتا ہے اور پھر دو چھوٹے چھوٹے کارڈ تیار کر کے اس پر یہ شعر لکھتا ہے:

؎ ان کا جو فرض ہے، ارباب سیاست جانیں

میرا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے۔'' (۸۱)

پھر ایک پختہ دھاگے کی مدد سے یہ کارڈ کبوتروں کے گلے میں ڈالتا ہے اور دونوں کبوتروں کو سرحد کے کنارے دو خوش رنگ سفیروں کے طور پر بھارت کی طرف امن کا پیغام دے کر بھیجتا ہے، اور اس طرح کہانی ایک اچھے پیغام اور نصیحت سے ہم کنار ہو کر ختم ہوتی ہے۔

فکری جائزہ:

راہی کا ناولٹ ''کبوتر'' صرف ناولٹ ہی نہیں، بلکہ کبوتروں کے بارے میں ایک مکمل ریسرچ ہے۔ انہوں نے ناولٹ ''ڈائنا سور کیوں غائب ہو گئے'' اور ''کبوتر'' میں پہلے پپو کے کردار کے ذریعے معلومات حاصل کیں اور پھر انہیں کہانی کے سانچے میں ڈھال کر بچوں کے سامنے بہت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ پپو کے ذریعے معلومات کے حصول سے راہیؔ کا مقصد بچوں میں تحقیقی رجحان کو فروغ دینا ہے کہ وہ کائنات میں موجود اشیاء اور مخلوقات کے بارے میں تحقیق کریں اور اپنی معلومات سے نہ صرف خود فائدہ اٹھائیں بلکہ دوسروں کو بھی اس سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کریں۔

زیر نظر ناولٹ میں بچوں کے لئے کبوتر کے متعلق تحقیق اور سائنسی معلومات کے علاوہ اور بھی بہت ساری نصیحتیں ہیں، جن پر عمل پیرا ہو کر بچے نہ صرف ایک اچھے اور ذمہ دار شہری بن سکتے ہیں بلکہ ایک حساس اور ہمدرد دل کے مالک بن کر اعلیٰ اخلاقی اقدار سے بھی متصف ہو سکتے ہیں۔

سب سے پہلے راہیؔ ناولٹ میں حضرت نوحؑ کی نافرمان قوم کا حال بیان کرتے ہیں کہ حضرت نوحؑ صدیوں تک

اپنی قوم کو تبلیغ کرتے رہے، اپنا خون جلاتے رہے لیکن ان کی بد بخت قوم نے ان کی ایک بھی نہ سُنی۔ آخر کار حضرت نوحؑ تنگ آ کر ان کے لئے بد دعا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے۔ آسمان اور زمین سے پانی کے نادیدہ ذخیرے اُبل کر طوفان و سیلاب مچا دیتے ہیں اور ایک ایک کر کے سب پانی میں ڈوب کر غرق ہو جاتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید ایسی نافرمان قوموں کی اساطیر سے بھری پڑی ہے۔ جنہوں نے اللہ کے رسول اور نبیوں کی نافرمانی کر کے صراطِ مستقیم کو نہیں اپنایا۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کی قوم پر اللہ تعالیٰ عذاب نازل کر کے اِن سے بہترین انتقام لیتا ہے۔ اس بارے میں راہیؔ لکھتے ہیں:

> ''قدرت اُن تمام بد طینت لوگوں سے اپنا انتقام لے رہی تھی، جنہوں نے سچ کو جھٹلایا اور اللہ کے فرستادہ نبی جناب نوح علیہ السلام کی باتوں پر ذرا بھی کان نہیں دھرا۔'' (۸۲)

ہمارا مذہب اسلام ہمیں والدین کی فرمانبرداری اور اطاعت و پیروی کی تلقین کرتا ہے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے اور باپ کی رضا میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ جب حضرت نوحؑ طوفان سے بچنے کے لئے اپنے نیکوکار بندوں کو کشتی میں بیٹھاتے ہیں تو آخری بار اپنے بیٹے سے کہتے ہیں کہ ایمان لا کر میری کشتی میں پناہ لینے آ جاؤ۔ لیکن وہ نافرمان باپ کی بات نہیں مانتا اور اپنی نافرمانی اور کفر پر قائم رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے پانی کی ایک تیز لہر اُسے اپنی لپیٹ میں لے بہتی ہے اور وہ پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ راہیؔ لکھتے ہیں:

> ''جناب نوح علیہ السلام کی نظر اپنے برخوردار پر پڑی جو کفار کے مابین کھڑا تھا۔ اُسے پکار کر فرمایا کہ اے فرزند! اُن کافروں سے الگ ہو جا اور میری کشتی میں پناہ لے لے۔ وہ نافرمان بولا ''مجھے معاف فرمایئے۔ میں یہیں آرام سے ہوں۔ پانی کا ریلا آیا تو کسی پہاڑ کا سہارا پکڑ لوں گا۔'' ایسی میں ایک طوفانی موج کسی اژدہے کی طرح اُبھری اور کافر بیٹے کو ہڑپ کر گئی۔'' (۸۳)

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے اس واقعے کو بیان کر کے راہیؔ بچوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ جو لوگ اپنے والدین کا کہا نہیں مانتے، ان کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔

اسی طرح انصاف اور ہمدردی دو ایسے اخلاقی صفات ہیں، جن کو اپنا کر نہ صرف انتظام سلطنت کو بخوبی چلایا جا سکتا ہے، بلکہ معاشرے میں امن و آمان کے قیام کے لئے کسی بھی انسان میں ان دو خوبیوں کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس سلسلے میں راہیؔ ناولٹ میں ہندوؤں کی کتاب سے لیا گیا ایک اساطیری قصہ سناتے ہیں کہ شوی نامی ایک نیک اور رحم دل راجا ہوتا ہے۔ ایک روز کوئی کبوتر، زخمی حالت میں اس کی گود میں دبک جاتا ہے، جس کا تعاقب ایک باز کر رہا ہوتا ہے۔ وہ راجا سے کبوتر کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے کہ اس پر اُس کا حق ہے جبکہ راجا یہ کہہ کر کبوتر دینے سے انکار کرتا ہے، کہ اب وہ میری پناہ میں ہے اور اُس کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے، جس پر باز کہتا ہے کہ میرے بچے بھوکے ہیں، اگر آپ نے کبوتر واپس نہیں

دیتا تو اس کے بدلے میں اپنے جسم کا ہم وزن گوشت مجھے دے دیجیے کہ میں اپنے بچوں کو کھلا سکوں، راجا اس شرط پر راضی ہو جاتا ہے، لیکن کبوتر اس کے حوالے نہیں کرتا:

> ''راجا نے ترازو منگایا اور ترازو کے ایک پلڑے میں کبوتر کو رکھا اور دوسرے پلڑے میں چھری سے
> اپنے بدن کا گوشت کاٹ کر ڈالتا گیا۔ لیکن جتنا بھی گوشت ڈالا، کبوتر والا پلڑا جوں کا توں بھاری رہا۔
> اس پر راجا آخر خود ہی اُٹھ کر ترازو کے دوسرے پلڑے میں جا بیٹھا۔'' (۸۴)

یعنی اگر ایک طرف کبوتر جیسے پرندے کی تخلیق اللہ نے بنی نوع انسان کے فائدے کے لئے کی ہے تو دوسری طرف قدرت ہمارا امتحان بھی لیتی ہے کہ ہمارے اندر ہمدردی کا کتنا جذبہ ہے اور ہم جانوروں اور پرندوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ اگرچہ کبوتر ایک مقدس پرندہ ہے۔ کئی پیغمبروں کا مددگار رہا ہے اور مغلیہ خاندان کے بادشاہوں کے ساتھ بھی اس کا نام جڑا رہا ہے، لیکن آج کل ہمارے معاشرے میں کبوتر پروری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، کیونکہ اب یہ شریفوں کا مشغلہ نہیں رہا ہے۔ اکثر لچھے لفنگے لوگ کبوتروں کو پال کر ان سے مقابلے کرواتے ہیں جو اخلاقی لحاظ سے ایک بہت بُرا فعل ہے۔ اس لئے جب کردار پپو، کبوتر کی حیرت انگیز کمالات کو دیکھ کر اسے پالنے کا شوق ظاہر کرتا ہے تو اس کے والدین اُسے اس بات کی اجازت نہیں دیتے اور اُسے اس مشغلہ سے دور رہنے کا کہتے ہیں۔ اس موقع پر پپو کے والد اُسے سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''وہ تو ٹھیک ہے، برخوردار! لیکن ہمارے معاشرے میں کبوتر پروری بلکہ کبوتر بازی بدحرام لوگوں کا
> مشغلہ بن کر رہ گیا ہے۔ ہم جیسے شرفاء کو نہیں بھاتا کہ ایسے کاموں میں پڑ کر اپنا نام بد نام
> کریں۔'' (۸۵)

اس کے علاوہ راہیؔ اس ناولٹ میں ایک بے گناہ تاجر کی قتل کی سزا سے متعلق بھی ایک واقعہ سناتے ہیں، جس میں بچوں اور بڑوں دونوں کے لئے یہ سبق ہے کہ کبھی کسی چیز کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے اور نہ ہی کسی بے گناہ انسان کی جان لینی چاہئے، کیونکہ کسی ایک انسان کو قتل کرنا، پوری انسانیت کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔ یہ واقعہ حفیظ عثمانی کی ایک تحریر ہے۔ عراق کے شہر حلب کا ایک تاجر سفر کی حالت میں ہوتا ہے کہ اس دوران ایک ڈاکو اس پر حملہ کر کے اس کا مال واسباب سب کچھ لوٹ لیتا ہے اور مال سمیٹنے کے بعد وہ تاجر کو قتل بھی کر دیتا ہے۔ قریب شاخ پر دو کبوتر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ مرتے وقت تاجر اُن دو کبوتروں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

> ''اے کبوتر! گواہ رہنا کہ اس شخص نے مجھ بے گناہ
> کو قتل کیا ہے''۔
> ڈاکو نے دل میں کہا ''یہ بے زبان مخلوق میرے خلاف بھلا کیا گواہی دیں گے۔'' (۸۶)

کچھ عرصے بعد یہ امیر و کبیر ڈاکو کسی ایسی دعوت میں مدعو ہو کر جاتا ہے، جہاں شہر بھر کے اعلیٰ حکام اور قاضی بھی

موجود ہوتے ہیں۔ کھانا کھانے کے دوران جب وہ ایک ڈش میں دو بُھنے ہوئے کبوتروں کو دیکھتا ہے، تو اس پر اُسے اس تاجر کے آخری الفاظ یاد آتے ہیں۔ وہ ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہے اور پھر ایک غیر مرئی قوت اُس سے سب کچھ اگلواتی ہے۔ راز کے عیاں ہونے پر حاکم حلب فوراً اُسے گرفتار کر کے پھانسی دینے کا حکم صادر کرتا ہے اور یوں دو بے زبان کبوتر، تاجر کے بے گناہ ہونے کی گواہی دیتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے، کہ سچ کبھی بھی نہیں چھپ سکتا۔ حقیقت ایک نہ ایک دن ضرور سب کے سامنے عیاں ہوتی ہے۔

آخر میں راہیؔ جاسوس کبوتر کے باب میں ہندو پاک کی سیاسی کشیدگی کا ذکر کرتے ہیں کہ جاسوس کبوتروں کی جاسوسی کو ایشو بنا کر پاکستان اور بھارت دونوں ممالک کے لوگ نفرت کے دلدل میں روز بروز پھنستے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ کبوتر جیسی ادنیٰ سی مخلوق کی جاسوسی یا حراست نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں ممالک کی دلوں میں دراڑیں پڑ چکی ہیں، اس لئے اس نازک صورتحال سے نپٹنے اور سیاسی کشیدگی کو کم کرنے کے لئے دونوں ممالک کے درمیان محبت جیسے جذبے کو عام کرنے کی اشد ضرورت ہے، کیونکہ نفرت کا جواب محبت سے دے کر ہی نفرت کے شعلوں کو کم کیا جا سکتا ہے۔

اس لئے راہیؔ لکھتے ہیں:

> ''نفرت کا جواب اگر نفرت سے دیا جائے تو نفرت اور شہ پاتی ہے۔ مزید بڑھ جاتی ہے۔ ہوش مندی کا تقاضا ہے کہ اسے ختم کرنے یا کم کرنے کے لئے ٹھنڈے دل سے کچھ کیا جائے۔ نفرت کو مٹانے کا بہترین علاج محبت ہے۔ کچھ ایسا کیا جائے کہ نفرت کے شعلے رفتہ رفتہ سرد ہوتے چلے جائیں''۔(۸۷)

چنانچہ محبت کا پیغام بھیجنے کے لئے پپو کبوتروں کا ایک جوڑا خریدتا ہے۔ ان کے گلے میں محبت کے پیغام پر مبنی کارڈز ڈال کر انڈین بارڈر کے قریب بھارت کی طرف بھیجتا ہے:

> ''تھوڑی ہی دیر میں پپو اور ابو سرحد کے کنارے امن کے دو خوش رنگ سفیروں کو بھارت کی فضاؤں کی سمت سفر کرتے دیکھ رہے تھے۔''(۸۸)

فنی جائزہ:

شجاعت علی راہیؔ نے اپنے ناولٹ ''کبوتر'' میں فلش بیک تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے بڑی ہنرمندی کے ساتھ اسلامی تاریخ کے اہم واقعات بچوں تک پہنچائے ہیں اور ان میں نیکی، اچھائی اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اپنے اس ناولٹ میں جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے کی وجہ سے ہمیں ان کی باتوں میں آج کا وہ منظر نامہ دیکھنے کو ملتا ہے جو حقیقی و سائنسی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور جسے بچے اپنے اردگرد کے ماحول میں دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔

پلاٹ:

عام طور پر کسی بھی ناولٹ کی مقبولیت اور کامیابی کا دارومدار پلاٹ کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ ناولٹ ''کبوتر'' کا پلاٹ بھی اس لحاظ سے انفرادیت کا حامل ہے کہ کردار پپو خیالات وتصورات کی دنیا میں کھو کر مختلف واقعات بیان کرتا ہے۔ یہ بیانیہ اس قدر دلچسپ، پرتجسس اور منطقی ہے کہ قاری کو کسی بھی لمحے یہ محسوس نہیں ہونے دیتا ہے کہ وہ پپو کے ذریعے کہانی کے تہہ در تہہ منازل طے کر رہا ہے بلکہ کہانی میں گہری محویت اُسے خود درجہ بدرجہ آگے لے کر جاتی ہے، جس سے قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا اور شروع سے لے کر آخر تک اس کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ ناولٹ کے تمام واقعات کہانی کے مطابق سلسلہ وار ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ پلاٹ میں آخر تک کوئی جھول اور کسی قسم کی کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی۔ سادہ اور اکہرا پلاٹ اس ناولٹ کی خوب صورتی میں اضافے کا سبب ہے۔ ناولٹ کا پہلا حصہ جو کبوتر کے مقدس روپ کا ہے اس میں تاریخی واقعات اور روایات کو بڑی چابکدستی کے ساتھ کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جبکہ دوسرا حصہ طنز ومزاح پر مشتمل ایک فرضی جاسوس کبوتر سے متعلق ہے۔ اس میں جاسوس کبوتر کے مختلف واقعات اس ربط کے ساتھ منظر پر لائے گئے ہیں، جو مزاحیہ رنگ لیے حقیقت کے عین قریب دکھائی دیتے ہیں۔ راہیؔ بڑی خوب صورتی سے ان فرضی واقعات کو ایک اہم موڑ پر لاکر دونوں ممالک پاکستان اور بھارت کو محبت، امن اور آشتی کا پیغام دیتے ہیں۔ یہی ایک سُلجھے اور منجھے ہوئے لکھاری کا کمال ہوتا ہے۔

کردار نگاری:

کسی بھی فکشن میں کہانی کرداروں کے ذریعے ہی آگے بڑھتی ہے۔ جس طرح ہر کہانی میں کچھ مرکزی اور کچھ ضمنی کردار ہوتے ہیں، اسی طرح اس ناولٹ میں بھی مرکزی کردار، پپو کا ہے۔ پوری کہانی پپو کے ذریعے بیان کی جاتی ہے۔ پپو کمپیوٹر کا سہارا لے کر مختلف واقعات، قصوں اور روایات کے متعلق معلومات حاصل کر کے اُسے ہم تک پہنچاتا ہے۔ راہیؔ اس کا تعارف اس طرح کرتا ہے کہ پپو جب اپنے کمرے کا دریچہ کھولتا ہے تو قریب ہمسائیوں کی چھت پر اُسے کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''آج بھی اس نے حسب معمول دریچے کے پٹ کھول کر کبوتروں کے دل رُبا نغموں سے روح کی غذا حاصل کی۔ انہیں کچھ دیر محبت سے دیکھتا رہا اور پھر دریچہ بند کر کے اپنے کمپیوٹر کا رُخ کیا۔''(۸۹)

یوں کردار پپو، کبوتر کے بارے میں نت نئی معلومات کمپیوٹر پر سرچ کر کے ہم تک دلچسپ انداز میں پہنچاتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی کرداروں کا ذکر ضمنی طور پر مختلف روایات اور واقعات میں کہانی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت نوحؑ اور اس کے نافرمان بیٹے کا ذکر کرنا، شوی نامی ایک نیک دل راجا، شہر حلب کا تاجر، قاتل

ڈاکو، پپو کے امی اور ابو، بھارتی وزیراعظم نریندر امودی، اور ایک بھارتی اہل کار بھمبیر سنگھ وغیرہ۔

اس کے علاوہ اس ناولٹ میں چند پرندوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جیسے مختلف قسم کے کبوتروں میں جاسوس کبوتر جانباز خان، غڑغوں خان اور ایک باز وغیرہ۔ غرض تمام کردار کہانی کے مزاج اور ضرورت کے مطابق بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر تخلیق کیے گئے ہیں۔

مکالمہ نگاری:

ایک لکھاری، کرداروں کی نفسیات اور موقع ومحل کے مطابق مکالمہ نگاری ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ راہی بھی بچوں کی نفسیات سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی بچوں کے رجحانات، میلانات اور نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے مکالمے تحریر کیے ہیں۔ کرداروں کے مابین بات چیت کا یہ انداز اس قدر برمحل اور عام فہم ہے جسے ہر درجے سے تعلق رکھنے والے بچے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ یعنی پرائمری جماعت سے تعلق رکھنے والا بچہ نہ صرف کہانی پڑھ سکتا ہے، بلکہ اس کے مکالموں سے بھی لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ ناولٹ کا انداز چونکہ بیانیہ ہے، اس لئے کرداروں کے مابین گفتگو کے مواقع نسبتاً کم میسر آئے ہیں، تاہم پھر بھی کئی ایک مقامات پر مکالمے کی بہترین مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں مثلاً شوی نامی رحم دل راجا اور ایک باز کے درمیان ہونے والی گفتگو ملاحظہ ہو:

> ''اتنے میں ایک تیکھی چونچ اور خوفناک پنجوں والا باز آیا اور مطالبہ کیا کہ اس کبوتر پر میرا حق ہے۔ مجھے دے دیجئے۔
>
> راجا کچھ سوچ کر بولا'' تم پکڑ لیتے تو تمہارا ہوتا لیکن اب تو یہ میری پناہ میں آچکا ہے۔ اس کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔''
>
> باز نے کہا: ''میں بھوکا ہوں۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔ آپ اسے مجھ سے چھین لیں گے تو ہم سب بھوکے رہیں گے اور گناہ آپ کے سر جائے گا۔''
>
> راجا نے کہا: ''تم اس کبوتر کے بدلے جو چاہو لے لو لیکن یہ کبوتر میری ہی پناہ میں رہے گا۔'' باز ضد پر اڑا رہا۔ بالآخر کہنے لگا۔
>
> ''اچھا تو پھر یوں کیجئے کہ کبوتر کے بدلے اس کے وزن کے برابر اپنے جسم کا گوشت کاٹ کر مجھے دے دیجئے۔''(۹۰)

راہیؔ کے مکالمے نہ صرف مختصر، سادہ اور عام فہم ہیں، بلکہ نصیحت آموز ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کی نفسیات سے عین مطابقت رکھتے ہیں۔

منظر نگاری:

دیگر لوازمات کی طرح منظر نگاری بھی ناولٹ کا اہم جز ہے۔منظر نگاری کے ذریعے فکشن نگار ایک طرف مختلف حالات اور واقعات کا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے تو دوسری طرف قاری کی تھکان اور بوریت کو بھی رفع کرتا ہے۔بعض اوقات فطری مناظر کی دل کشی اور خوب صورتی کے بیان سے ذہن ایک تر و تازگی اور فرحت محسوس کرتا ہے۔ ناولٹ ''تتلیوں کا میلہ'' میں مصنف نے فطری مناظر کی خوب صورت منظر کشی میں اپنے قلم کا وہ جوہر دکھایا ہے جو ہر لحاظ سے قابل داد اور قابلِ تحسین و آفرین ہے۔اسی طرح ''باغی چیونٹیاں'' میں بھی مختلف قسم کی کارکن چیونٹیوں کے مناظر پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔نظر ناولٹ ''کبوتر'' میں بھی راہیؔ نے بہترین منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے دکھائے ہیں۔طوفان نوحؑ کا حال بڑی خوب صورتی سے بیان کرتے ہیں۔خصوصاً اُس منظر کو، جب ایک تنور سے پانی اُبل کر لاوے کی طرح گرد و پیش میں پھیلنے لگتا ہے۔راہیؔ لکھتے ہیں:

> ''ارض و سما سے پانی کے نادیدہ ذخیرے اُبلنا اور ابھرنا شروع ہو گئے۔ایک قیامت کا سماں بپا ہو گیا۔ ہر طرف طوفان باد و باراں اور سیلاب کے ریلے سر اُٹھاتے نظر آنے لگے۔مکان ڈوبنے لگے۔گلیوں میں پانی بھر گیا۔سڑکیں دریا بن گئیں۔صحرا سمندر کا روپ اختیار کر گئے۔جدھر نظر پڑتی، پانی کی راجد ھانی تھی۔آسمان سے کالے کالے، بھنور ابادل دیوؤں کی طرح حملہ آور ہو گئے تھے اور زمین کے ہر کونے کھدرے سے پانی اُبل اُبل کر نکل رہا تھا۔ہر سمت چیخیں تھیں۔فریادیں تھیں۔وہ لوگ جو نسل در نسل غلط طریقوں سے خوشیوں اور مسرتوں کے انبار سمیٹے چلے جا رہے تھے، اب ہمہ تن عالم کرب میں تھے۔ایک ایک کر کے سب ڈوب رہے تھے۔زندگی کی نعمت سے محروم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ان پر توبہ کے دروازے بند ہو چکے تھے''۔(۹۱)

راہیؔ کو جہاں فطری مناظر کی دلکشی کے بیان میں ملکہ حاصل ہے، وہاں موضوع کے لحاظ سے ہر قسم کے حالات، واقعات، ناگہانی آفات، خانہ جنگی اور تباہی و بربادی وغیرہ کا حقیقی نقشہ کھینچنے میں بھی مہارت حاصل ہے۔

اسلوب اور زبان و بیان:

بچوں کے لئے لکھتے وقت جہاں ان کی میلانات، دلچسپیوں اور نفسیات کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، وہاں اسلوب اور زبان و بیان کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے، کیونکہ بچے سادہ، رواں اسلوب اور عام فہم الفاظ میں لکھی گئی کسی بھی تحریر کو اچھی طرح پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔شجاعت علی راہیؔ نے اپنے تمام ناولٹوں میں اسلوب اور زبان و بیان کا خاص خیال رکھا ہے۔چونکہ ان کے ناولٹ تحقیق پر مبنی معلومات سے بھرپور ہیں، اس وجہ سے ان میں کچھ سائنسی اور انگریزی زبان کے الفاظ بھی دیکھنے کو ملتے ہیں، راہیؔ چونکہ بچوں کو ریسرچ کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ ہر معاملے اور ہر چیز کی

تحقیق از خود کر کے انہیں دریافت کریں، تو اس طرح بچے یہ الفاظ ڈکشنری میں دیکھ کر یا پھر اپنے بڑوں سے خود بھی سیکھ سکتے ہیں۔ یوں اُن کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا اور الفاظ کے معنی بھی خود تلاش کر کے تحقیق کریں گے۔ زیرِ نظر ناولٹ ''کبوتر'' میں راہیؔ نے بے شمار ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں، جو بچوں کے ذخیرہ الفاظ میں اضافے کا باعث ہیں۔ مثلاً کبوتر بازی، یا کبوتر پروری، دل ربا نغمے، اسم صوت غڑغوں غڑغوں، نادیدہ ذخیرے، قرعہ، دریچہ، جلاد، نامہ بر، ہڈحرام لوگ وغیرہ۔

اس کے علاوہ جاسوس کبوتر کے باب میں چونکہ پاک و ہند کے درمیان پیدا ہونے والی کشیدگی کو بیان کیا گیا ہے۔ تو راہیؔ نے بھارتی وزیر اعظم کی زبانی تقریر میں کچھ ہندی زبان کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ پیراگراف ملاحظہ ہو:

> ''انہوں (پردھان منتری نریندرا مودی) نے الزام لگایا کہ پاکستانی سرکار اس طرح تک نیچے کر گئی ہے کہ بھارت کی گنگا جمنا جیسی پوتر سرزمین کو اپنے جاسوس کبوتر بھیج کر گدلا کر رہی ہے۔ پردھان منتری نے کہا کہ پاکستان سے بھارت بھیجا جانے والا ہر کبوتر مجرموں کا آلہ کار ہے اور ایسے خطرناک جاسوسوں کو ہمارے یہاں بھیج کر پاکستانی سرکار اپنے بھیانک عزائم سے بھارت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہا ہے۔ پچھلے دنوں ایسی ہی ایک کاروائی کی گئی اور مجھ ایسے امن کے پرچارک پردھان منتری کو ایک دہشت گرد پاکستانی کبوتر کے ذریعے یہ پیغام بھیجا گیا کہ ''تمہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا۔'' (۹۲)

جہاں تک اِس ناولٹ کے اسلوب کا تعلق ہے تو ناولٹ کا پہلا حصہ جو کبوتر کے مقدس روپ پر مشتمل ہے، اس کا اسلوب تحریر سنجیدہ ہے جبکہ دوسرا حصہ طنز و مزاح اور سنجیدگی کا ملاپ ہے، تاہم ہر دو صورتوں میں راہیؔ نے سادگی اور سلاست کو اپنایا ہے اور کوشش کی ہے کہ بچوں تک معلومات کی ترسیل عام فہم انداز میں ہو جو ان کی ذہنی استعداد کے مطابق ہو، تا کہ وہ نہ صرف اُس میں دلچسپی لیں بلکہ ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہو۔

غرض راہیؔ کا ناولٹ ''کبوتر'' فکری اور فنی دونوں لحاظ سے ناولٹ کے معیار اور تکنیکی تقاضوں کو پورا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس میں زبان و بیان اور وحدت زماں و مکاں کے تصور کو خاص طور پر ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔

۶۔ بولتے برگد:

''بولتے برگد'' شجاعت علی راہیؔ کا چھٹا ناولٹ ہے۔ یہ بچوں اور بڑوں دونوں کے لئے یکساں سبق آموز اور مفید ہے۔ یہ ناولٹ درختوں کے متعلق ہے۔ اس لئے مصنف نے اس میں برگد کے درختوں کے زبانی، درختوں کی اہمیت و افادیت کو آشکارا کیا ہے۔ مختلف واقعات کے ذریعے اخلاقی باتیں سکھانے کی کوشش کی ہے۔ ٹمبر مافیا کو بے نقاب کرنے کی سعی کر کے انہیں تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس بارے میں میجر جنرل (ر) عاشور خان فرماتے ہیں:

> ''یہ ناولٹ بڑوں اور بچوں دونوں کے لئے بہترین نسخہ ہے۔ بچے تین برگد دوستوں کے مکالمے سے حظ

اُٹھاتے ہیں، کچھ اخلاقی باتیں سیکھتے ہیں، درختوں کی افادیت سے آگاہ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا سبق حاصل کرتے ہیں۔ بڑوں کے لئے اس ناولٹ میں معاشرے کے ناسور سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ٹمبر مافیا، بچوں کے اغوا اور ڈاکوؤں اور لٹیروں کا لوگوں کو لوٹنے جیسے کئی واقعات ناولٹ میں شامل ہیں۔ امانت کی پاسداری جیسے عمل کا بھی بطریق احسن ذکر ہے۔'' (۹۳)

ناولٹ کے موضوع اور مقصد کے بارے میں فضل ربی راہیؔ رقم طراز ہیں:

''مصنف درختوں کی زبانی اپنے پڑھنے والوں کو جس موثر اور پُرلطف انداز میں درختوں اور جنگلات کی اہمیت اور افادیت بتاتے ہیں، وہ نہ صرف قاری کے لئے لطف وانبساط کا باعث بنتا ہے بلکہ اس کے ذہن میں درختوں کی قدر و قیمت بھی راسخ ہوجاتی ہے''۔ (۹۴)

جبکہ درختوں سے انسیت اور لگاؤ رکھنے کے بارے میں راہیؔ خود یوں لکھتے ہیں:

''یہ ناولٹ، جو قریب قریب نو ہزار الفاظ پر مشتمل ہے، مظاہر فطرت میں انسان کے بہترین دوست درخت کے بارے میں ہے۔ شعروادب کے میدان میں میرا درختوں سے گہرا ربط رہا ہے کہ درخت سے بڑھ کر کریم النفس شے شاید ہی کوئی ہو۔''(۹۵)

چنانچہ اپنے ایک شعری مجموعے میں فرماتے ہیں:

''اس کے سائے میں ستائے اس کی بیری بھی''(۹۶)

یہ ناولٹ ایک مخصوص درخت ''برگد'' کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ جب راقمہ نے راہیؔ صاحب سے اس موضوع پر ناولٹ تحریر کرنے کا سبب دریافت کیا تو اُنہوں نے بتایا:

''زندگی کے سفر میں مجھے کئی چھتنار برگد ملے، جن میں کچھ انسانوں کے روپ میں ملے، کچھ رشتوں میں بزرگ تھے، کچھ علمی وادبی اعتبار سے سرپرسایہ فگن رہے اور کچھ میرے ساتھی تھے۔ اس کتاب کے بارے میں لکھنے کے لئے میری نظر جس نیک نفس انسان اور سماجی اعتبار سے ایک چھتنار اور قدآور برگد پر پڑی، وہ میرے کالج کے ہم جماعت میجر جنرل ریٹائرڈ عاشور کی صفات والی ذات ہے۔ جو میرے دوست بھی ہیں اور ایک اعتبار سے ہمارے خاندانی معالج بھی''۔ (۹۷)

یہی وجہ ہے کہ راہیؔ کے اس ناولٹ کا دیباچہ بھی ڈاکٹر عاشور نے ہی تحریر کیا ہے۔ ۵۶ صفحات، بامعنی اور دیدہ زیب سرورق پر مشتمل اس ناولٹ کا انتساب راہیؔ نے موجودہ وزیراعظم عمران خان کے نام کیا ہے اور ساتھ میں اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ خیبر پختونخوا میں ایک ارب درخت لگانے کی مہم کا آغاز کرکے اس نے پاکستان میں ہرے بھرے موسموں کی بنیاد رکھی ہے۔

دیگر ناولٹوں کی طرح اس ناولٹ میں بھی ایک کہانی بیان کی گئی ہے، گو کہ یہ کہانی ٹکڑوں ٹکڑوں میں پیش کی گئی ہے، لیکن

دلچسپی، تجسس اور روانی کے اعتبار سے ایک خاص انفرادیت لے کر اپنی کوئی مثال نہیں رکھتی۔

کہانی کا آغاز بہت دلچسپ انداز میں اس طرح ہوتا ہے کہ ایک بوڑھا ضعیف آدمی (جو بہت تھکا ہوتا ہے)، تیز چلچلاتی دھوپ میں کسی سائے کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہے کہ اچانک اسے دور سے تین برگد کے درخت دکھائی دیتے ہیں۔ وہ گھسیٹتا ہوا ان کے سائے میں نیم بے ہوشی کی حالت میں پہنچ کر لیٹ جاتا ہے اور تھوڑی دیر میں اُس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ جب وہ نیند سے بیدار ہوتا ہے تو درختوں کی شاخوں کو محبت بھری نظروں سے دیکھ کر ایک اطمینان اور سکون محسوس کرتا ہے اور بے اختیار اس کے دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ ''اے اللہ میری زندگی برگد کے ان حسین درختوں کو نصیب فرما!'' اس کے دل سے نکلی ہوئی یہ دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے اور وہ بوڑھا شخص دائمی نیند سو جاتا ہے۔

اس کے بعد برگد کے ان درختوں میں انسانوں کی سی زندگی دوڑنے لگتی ہے اور وہ انسانوں کی طرح بولنے اور گفتگو کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ برگد کے ان درختوں کو جب اپنے بولنے کی صلاحیت کا پتا چلتا ہے تو بہت خوش ہو جاتے ہیں اور اس بوڑھے آدمی کو دعائیں دینے لگتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اُس عمر رسیدہ شخص کی تجہیز و تکفین کے لیے بھی پریشان ہوتے ہیں، کہ اتنے میں ایک موٹر سائیکل سوار آدمی، کا وہاں سے گزر ہوتا ہے جو پہلے سے اس بزرگ آدمی کی تلاش میں ہوتا ہے۔ وہ فون کر کے ایک گاڑی منگوا کر اس بزرگ کو نم ناک آنکھوں کے ساتھ وہاں سے لے جاتا ہے، جس پر برگد کے سارے درخت خوشی کا اظہار کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔

اس پورے واقعہ کے دوران چھوٹا برگد کا درخت سویا ہوا ہوتا ہے۔ جس پر باریش اور منجھلا برگد کا درخت اسے جگا کر غفلت کی نیند سے بیدار ہونے کی نصیحت کرتا ہے اور خبردار کرتا ہے کہ اگر کسی انسان کے ہتھے چڑھ گئے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ اس پر چھوٹے برگد کا درخت کہتا ہے کہ ہم تو انسانوں کے دوست ہیں، وہ ہمیں کیوں نقصان پہنچائیں گے؟

باریش درخت اسے سمجھاتا ہے کہ انسانوں میں کچھ اچھے لوگ ہوتے ہیں، جو ہماری قدر کرتے ہیں اور کچھ نقصان پہنچانے والے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اسے لنڈی کوتل کے ایک ۱۲۰ سال سے مقید درخت کا واقعہ سناتا ہے، جسے ۱۸۹۷ء میں ایک انگریز افسر جمیز سکویڈ نے اپنے آپ پر حملہ آور ہونے کے جرم میں زنجیروں میں جکڑ کر رکھا تھا، کیونکہ نشے کی حالت میں اسے لگ رہا تھا کہ برگد کا یہ درخت برے عزائم اور خیالات کے ساتھ اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔ لنڈی کوتل کا یہ معصوم برگد کا درخت خیبر رائفلز کے احاطے میں پھیلا ہوا آج بھی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

اس کے بعد بوڑھا برگد، اسے مختلف برگد کے درختوں کے بارے میں بتاتا ہے مثلاً راولپنڈی کے مین صدر بازار والے برگد کے بارے میں یہ بتاتا ہے کہ وہاں مختلف لوگ پیٹ پوجا کرنے اور تازہ دم ہونے کے لیے آتے ہیں، اسی طرح مغربی بنگال کے اس عظیم الشان برگد کا ذکر چھیڑتا ہے جس کے نیچے سات ہزار آدمی بیک وقت کھڑے ہو سکتے ہیں۔

مزید وہ سری لنکا کے اس بزرگ برگد کے بارے میں بھی آگاہ کرتا ہے جو تین سو بڑے اور تین ہزار چھوٹے تنوں پر مشتمل ہے۔

بارِیش برگد، منجھلے اور چھوٹے برگد کو برگد کے مختلف درختوں کے بارے میں معلومات فراہم کر رہا ہوتا ہے کہ اتنے میں دور سے ایک نقاب پوش ڈاکو اپنے گھوڑے پر سوار، برگد کے ان درختوں کے پاس آ پہنچتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک رنگین ڈبہ ہوتا ہے، جسے وہ جلدی سے بوڑھے برگد کے اندر قدرتی طور پر بنے ہوئے غار میں چھپا کر رکھ دیتا ہے اور جلدی سے وہاں سے چلا جاتا ہے۔ اس کے تعاقب میں دو اور آدمی آتے ہیں اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے اس ڈاکو کے ظلم و ستم کی روداد بیان کرتے ہیں کہ اس نے ایک بیوہ عورت کی بیٹی کے جہیز کا سونا لوٹا ہے، اگر اس بے چاری عورت کو اس کا سونا نہ ملا تو وہ صدمے سے مر جائے گی۔ اس کا دوسرا ساتھی بولتا ہے کہ اب تو صرف اللہ ہی غیبی بندوبست کر کے سونا دلوا سکتا ہے جس پر بوڑھا برگد انہیں بتاتا ہے کہ تم لوگ جس ڈاکو کی تلاش میں نکلے ہو وہ زیورات کا رنگین ڈبہ میرے اندر ایک سوراخ میں چھپا کر گیا ہے۔ لہٰذا تم لوگ وہ ڈبہ لے کر اس بیچاری عورت کو دے دو اور اس کی امانت واپس لوٹا دو۔ گھڑ سوار آدمی پہلے تو بہت حیران اور پھر خوش ہو جاتے ہیں کہ برگد بھی بول سکتے ہیں اور سونا لے کر بوڑھے برگد کا شکریہ ادا کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے کسی تاجر کا گزر ہوتا ہے۔ وہ برگد کے سائے میں کچھ لمحے ستا کر چل پڑتا ہے، کیونکہ اسے کسی مقام پر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد لٹیرا دوبارہ زیورات لینے کے لئے درخت کے پاس آتا ہے لیکن وہاں سونا نہ ملنے پر بہت پریشان ہو کر اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہے، کہ اسی اثناء میں اس کی نظر گھوڑے پر سوار اس تاجر پر پڑتی ہے، جو ابھی تھوڑی دور ہی گیا ہوتا ہے۔ وہ فوراً تاجر کا پیچھا کر کے اسے گھیرتا ہے اور کہتا ہے کہ "میرا ڈبہ نکالو"۔ تاجر حیران ہو کر لاعلمی کا اظہار کرتا ہے کہ اسے ایسے کسی بھی ڈبے کا کوئی پتہ نہیں۔ اس کے پاس تو صرف اپنا سامان ہے لیکن ڈاکو اس کی باتوں پر یقین نہیں کرتا اور اسے قتل کرنے کی نیت سے ایک خنجر نکالتا ہے، تو تاجر یہ بھانپ لیتا ہے کہ ڈاکو کی نیت ٹھیک نہیں اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ وہ فوراً پستول نکال کر اپنی دفاع میں ڈاکو کے سینے میں بیک وقت تین گولیاں پیوست کرتا ہے اور وہاں سے آناً فاناً غائب ہو جاتا ہے۔

یہ تماشہ برگد کے تینوں درخت دیکھتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، مکافاتِ عمل کے طور پر اسے اس کی سزا دنیا میں ضرور ملتی ہے۔ ڈاکو نے ہزاروں لوگوں کا مال غصب کیا ہوگا، بہت سوں کی جانیں لی ہوں گی۔ اس لیے آج تاجر نے بھی اس کی جان لینے میں ذرا برابر بھی دیر نہیں کی۔ سچ ہے کہ جو انسان دوسروں کے گھر میں آگ لگاتا ہے تو وہ آگ پھیلتے پھیلتے ایک دن اسے خود بھی بھسم کر ڈالتی ہے۔

اس کے بعد حسبِ معمول تینوں برگد کے درخت ایک دفعہ پھر گفت و شنید میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ بوڑھا برگد

باقی دو درختوں کو، اس دور کی باتیں اور تین سو، سوا تین سو برس کے واقعات سناتا ہے، جب ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہوا کرتا تھا۔ ٹھنڈے، میٹھے اور رسیلے پانی کے چشمے بہا کرتے تھے۔ اس کی چھاؤں میں گاؤں کے بڑے بوڑھے آکر بیٹھا کرتے تھے۔ حقہ پیتے اور قصے سناتے، گھریلو مسائل، شہر اور ملک کے موجودہ صورتحال پر بحث ومباحثہ کرتے، پنچایت کے فیصلے ہوتے، چوپالیں سجا کرتیں، قانون کے رکھوالے اور وکلا یہاں آکر اپنی کرسیاں ڈالتے۔ یہاں تک کہ پٹواری اور محکمہ نہر کے کارکنان بھی اسی جگہ کام کرتے نظر آتے۔ پھر بوڑھا برگد بہت افسوس کے ساتھ انہیں بتاتا ہے کہ وہ سنہرا دور اور سب کچھ پھر ٹمبر مافیا کی سفاکی کی نذر ہو گیا، جنہوں نے ناجائز طریقے سے جنگلات کا صفایا کیا اور سرسبز درختوں سے ڈھکے ہوئے سبزہ زار کو چٹیل میدانوں میں بدل کر رکھ ڈالا۔ اس صورتحال پر افسوس کرتے ہوئے بوڑھا درخت اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ کاش وہ زمانہ اور وہ دور پلٹ کر واپس آئے۔

بوڑھے برگد کی شاخوں میں چونکہ ہزاروں راز اور بے شمار قصے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ جوان برگد کو لاہور کے مشہور قبرستان، میانی صاحب کے صدیوں پرانے برگد کے بارے بتاتا ہے کہ کسی زمانے میں اس پر عیسائی جنات کا قبضہ تھا اور عامل، بدروحوں کو بھسم کر کے اس کی راکھ اس درخت کے تنے میں دفن کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ نامور ادیب قدرت اللہ شہاب کا بھی ذکر کرتا ہے کہ جب وہ بھارت (انڈیا) کے شہر کٹک میں رہتے تھے تو اس کی آسیب زدہ کوٹھی کے سامنے بھی ایک برگد کا گھنا درخت تھا جس سے اکثر چمگادڑیں الٹی لٹکی رہتی تھیں۔

علاوہ ازیں بوڑھا برگد سماجی شخصیت ڈاکٹر رمیش کمار ونکوانی کی ایک تقریب کا ذکر بھی اس غرض سے کرتا ہے، کہ جس میں وہ برگد کے درخت کو ہندومت، بدھ مت اور مسلمانوں کے لئے قابل احترام ٹھہراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ برگد کا درخت رواداری، برداشت اور مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کا ایک ذریعہ ہے، اس لیے یہ اکثر صوفیاء کرام کے مزاروں پر ہر جگہ سایہ نچھاور کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

بوڑھا برگد مزید کہتا ہے کہ جس طرح ڈنک مارنا بچھو کی فطرت ہے۔ ڈسنا، سانپ کی فطرت ہے۔ بھینی بھینی خوشبو بکھیرنا، پھولوں کی فطرت ہے۔ اسی طرح سایہ اور آرام وسکون مہیا کرنا درختوں کی فطرت ہے۔ ان میں تعصب نام کی کوئی شے نہیں، بلکہ عبدالستار ایدھی کی طرح ہر رنگ ونسل اور ہر مذہب ومسلک کے لوگوں سے مساوی سلوک کر کے سب کو پناہ، سکون اور مسرت واطمینان بخشتے ہیں۔

بوڑھے برگد کی ان تمام باتوں کو سن کر نوجوان برگد قدرے سوچ میں غرق ہو کر گویا ہوتا ہے کہ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم درختوں کی اتنی طویل عمر ہوتی ہے جو کسی بھی اور جاندار چیز کی نہیں ہے۔ بلکہ بعض برگدوں کی زندگی حضرت نوح ؑ سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن مجھے ایک بات پر بڑا افسوس ہوتا ہے وہ یہ کہ دنیا کی ہر چیز اپنی مرضی سے حرکت کر سکتی ہے سوائے

ہمارے۔ہم ہمیشہ صرف ایک ہی جگہ پر کھڑے رہتے ہیں،سوچتا ہوں کہ بھلا یہ بھی ہماری کوئی زندگی ہے؟

یہ سن کر بوڑھا برگد درختوں کی اہمیت اورافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے نوجوان برگد کو جواب دیتا ہے کہ اللہ تعالی نے کائنات میں موجود ہر شے کوایک خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے۔درخت اگر چہ ایک مقام پر کھڑے رہتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت نہیں کر سکتے لیکن ان کی افادیت سے بھی کسی کوانکار نہیں۔ یہ بنی نوع انسان اوراس کی زندگی میں مرکزی کرداراوراہمیت کے حامل ہیں۔ زہریلے گیسوں کونگل کر فائدہ مند آکسیجن مہیا کر کے یہ انسانی زندگی کوقائم ودائم رکھنے کاایک اہم ذریعہ ہیں۔زمین کی خوب صورتی،موسموں کاردوبدل انہی پر منحصر ہے۔ بارش برگد پھر درختوں کی مختلف فائدہ منداقسام پر روشنی ڈالتا ہے جوانسانوں کے کام آتے ہیں۔اس دوران بوڑھے برگدکو،ایک خرکاراورلڑکے کے اغوا کا واقعہ یادآتا ہے۔خرکار،کسی لڑکے کوگلی سے اغواکر کے لے جاتا ہے کہ راستے میں اسے رفع حاجت کی ضرورت پیش آتی ہے۔لڑکااس موقع کوغنیمت جان کر بوڑھے برگد پر چڑھ کراس کی شاخوں میں خودکوڈھانپ لیتا ہےاورچھپ جاتا ہے۔خر کاراسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس درخت تک پہنچ بھی جاتا ہے لیکن لڑکے کوڈھونڈ نکالنے میں ناکام رہتا ہے۔یوں بوڑھے برگدکی وجہ سے اس لڑکے کی جان بچ جاتی ہے،یہی لڑکا پھر بڑا ہوکر فارسٹ آفیسر بن کر درختوں کی محبت میں اس علاقے کوسرسبز وشاداب بنادیتا ہے۔

بوڑھا برگد پھر انگلستان کے ایک وزیر اعظم ہنری کیمبل بینز مین(Henry Cambell Bannerman) کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ درختوں کی اتنی قدر کرتا تھا کہ اپنی ٹوپی اتارکران کوجھک کرسلام کر کے تعظیم بجالاتا تھا۔

اس طرح بوڑھا برگد،نوجوان برگدکومطمئن اوراپنے آپ پر فخرکرنے کے لیے یہی پر ہی بس نہیں کرتا، بلکہ اسے پرتگال کےایک پارک کےدروازے پرآویزاں بورڈ کے بارے میں بتاتا ہے،جس پر درختوں اوران سے حاصل ہونے والی لکڑی کے فوائد کے بارے میں لکھا گیا ہوتا ہے کہ کس طرح درخت انسان کی آخری سانس تک اس کے فائدے اور آرام کے کام آتا ہے، پھروہ نوجوان برگدکو یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالی نے بھی درختوں کواتنی عزت اورمرتبہ بخشا ہے کہ جب وہ حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہوتے تھے توایک درخت کے ذریعے ہی اس سے کلام فرماتے تھے۔اس سلسلے میں وہ حضرت نوحؑ کی اس کشتی کا بھی ذکر کرتا ہے جواس نے درختوں کے تنوں سے تیار کی ہوتی ہے اورجس میں حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے ایماندارلوگ، جانوراور پرندے پناہ لیتے ہیں۔ یہ ساری باتیں سن کرنوجوان برگدکو بہت خوشی ہوتی ہے اور بزرگ برگدکا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اگر ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت نہیں بھی کر سکتے لیکن انسانوں کوسکون پہنچانے اوردنیا کو خوب صورت بنانے میں واقعی ہمارا بہت بڑااوراہم کردار ہے،اور ہمیشہ رہے گا۔

اس دوران منجھلا درخت بوڑھے برگد کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر آپ انسانوں کی نسل سے تعلق رکھتے تو واقعی بہت بڑے مبلغ ہوتے، جس پر بوڑھا برگد کہتا ہے کہ اپنی طویل العمری کی بدولت میں نے دنیا اور انسانوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ یہ سن کر نوجوان پیڑ پوچھتا ہے کہ کبھی انسانوں نے بھی آپ سے کچھ سیکھا ہے؟ بوڑھا برگد جواب دیتا ہے کہ واقعی انسانوں کو بھی ہم سے بہت کچھ سیکھنا چاہیے اور ہماری طرح ان کو بھی اپنی زندگی کی تلخیاں اور دکھ سمیٹ کر دوسروں میں سکھ و راحت بانٹنا چاہیے۔ نوجوان پیڑ بوڑھے برگد سے پھر سوال کرتا ہے کہ کیا کبھی دنیا کی عظیم ہستیوں نے بھی ہم سے کوئی دائمی رشتہ استوار کیا ہے؟ جس پر بوڑھا برگد کپل وستو کے سدھارتھ شہزادے (گوتم بدھ) کا حوالہ دیتا ہے جس نے دنیا کی ہر شے میں فنا اور زوال کے عمل کو دیکھ کر اپنا زرق برق لباس اتار پھینکا اور ایک درخت کے نیچے ہمیشہ کے لئے بیٹھ کر روحانیت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہو گیا۔

آخر میں راہیؔ لکھتے ہیں کہ وقت گزرتا جاتا ہے۔ بہار کا موسم ڈیرے ڈال دیتا ہے کہ ایک روز بوڑھی عورت ایک نوجوان کے ساتھ بگھی میں بیٹھے برگد کے درخت کے قریب آکر رکتی ہے۔ یہ وہی عورت ہوتی ہے جس کی بیٹی کا زیور چوری ہو گیا ہوتا ہے اور دو نوجوان، برگد سے وہ زیور امانت کے طور پر اٹھا کر اُس بڑھیا کو واپس کرنے جاتے ہیں۔ بڑھیا، برگد کا شکریہ ادا کرنے آتی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی بیٹی کی شادی ممکن ہوئی ہے۔ جس پر بوڑھا برگد خوش ہو کر کہتا ہے کہ شکریہ تو اس امانت دار نوجوان کا ادا کرو جس نے آپ کی امانت بحفاظت آپ تک پہنچائی ہے۔ اس پر بوڑھی عورت جواب میں کہتی ہے کہ نوجوان کی اس دیانت داری سے متاثر ہو کر ہی میں نے اپنی بیٹی کا رشتہ اس سے جوڑا ہے، کیونکہ میری نظر میں اس سے بڑھ کر اچھا انسان اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ نوجوان بھی برگد کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اس کی وجہ سے اتنے نیک اور اچھے لوگوں میں اُس کا رشتہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد بڑھیا اور نوجوان، بوڑھے برگد سے وعدہ کر کے یہ کہتے ہیں کہ شادی کے روز ہم یہاں ضرور آئیں گے اور ولیمہ کا اہتمام بھی آپ کی چھاؤں میں کریں گے۔ آخر میں بوڑھے برگد کو طویل عمری کی دعا دیتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔

فکری جائزہ:

راہیؔ نے ناولٹ ''بولتے برگد'' میں درختوں کی اہمیت اور افادیت کو خود درختوں کی زبانی بیان کر کے ناولٹ کی خوب صورتی اور انفرادیت میں اضافہ کیا ہے۔ مکالماتی انداز میں ناولٹ کی کہانی کو آگے بڑھایا ہے جو مختلف واقعات سے ہو کر خوب صورت اور معنی خیز اختتام پر پہنچتی ہے۔ درختوں کی ہزاروں اقسام کا بیان، ماحول کو خوشگوار رکھنے، انسانوں کے کام آنے، ان کی تقدس اور احترام کا ذکر اس ناولٹ کا حصہ ہے۔ راہیؔ نے اس ناولٹ میں اخلاقی اقدار، انسانیت کے تقاضوں، اور ایثار و قربانی کے جذبے سے ہم کنار ہو کر دوسروں کے لئے راحت و آرام کا سبب بننے کو ترجیح دی ہے اور نہ صرف بچوں

بلکہ بڑوں کو بھی غور وفکر کی دعوت دی ہے۔

ناولٹ کا آغاز بہت دلچسپ ہے اور ابتداء میں ہی راہی ؔہمیں بتاتے ہیں کہ انسان جو بھی کام دل سے کرتا ہے، وہ اُس میں ضرور کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ چاہے وہ روزمرہ کے امور ہوں یا اللہ تعالیٰ سے مانگی ہوئی کوئی دعا۔ لہٰذا ناولٹ میں جب ایک بوڑھا تھکا ہوا آدمی سایے کی تلاش میں برگد کے درختوں کی چھاؤں میں پہنچ کر آرام کرتا ہے تو نیند سے بیدار ہو کر وہ محبت بھری نظروں سے درختوں کو دیکھ کر یہ دُعا مانگتا ہے:

''اے اللہ! میری زندگی برگد کے ان حسین درختوں کو نصیب کرا!''۔(۹۸)

علامہ اقبال کے اس شعر:

ع دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔(۹۹)

کے مصداق قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے کہ جیسے ہی وہ ضعیف آدمی دُعا کرتا ہے، فوراً اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور وہ دائمی نیند سو جاتا ہے۔ اس کی جگہ برگد کے تینوں درخت ہمیشہ کے لئے زندہ وتابندہ ہو جاتے ہیں۔

اس ناولٹ میں راہیؔ یہ سبق دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی مُسبب الاسباب ہے اور سبب بنانے والا غفور ورحیم ہے، تب ہی بوڑھے آدمی کی دُعا سے برگد کے درختوں میں انسانوں جیسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ بولنے اور سُننے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ خوش ہو کر وہ ضعیف آدمی کو دُعا دیتے ہیں کہ اس کی بدولت، انہیں بولنے اور سُننے کی نعمت ملی ہے۔ لیکن بوڑھے آدمی کے فوت ہونے پر وہ پریشان بھی ہو جاتے ہیں کہ اگر اُن کے کفن دفن کا بروقت انتظام نہ کیا گیا تو اس کی لاش کو جانور اور کیڑے مکوڑے کھا جائیں گے۔ اس موقع پر بوڑھا برگد کہتا ہے:

''جس خداوند ذوالجلال نے اسے ہمارے سائے میں موت بخشی ہے، وہ اس کی تدفین کی بھی کوئی سبیل پیدا کر ہی دے گا۔'' (۱۰۰)

یہ کہہ کر اچانک دور سے ایک موٹر سائیکل سوار درخت کے پاس پہنچ کر کسی کو فون پر اُس بوڑھے آدمی کے موت کی اطلاع دیتا ہے اور تقریباً آدھے گھنٹے میں ایک گاڑی آ کر اُسے کی لاش کو لے جاتی ہے۔

راہیؔ بتاتے ہیں کہ نیکی کرنا درختوں کی فطرت ہے۔ وہ اُن لکڑہاروں پر بھی سایہ کرتے ہیں جن کے ہاتھ ان کو کاٹنے کے لئے بڑھتے ہیں۔ چنانچہ وہ ناولٹ میں درختوں کی زبانی لکھتے ہیں:

''ہم پیڑوں کا کام چھاؤں چھڑکنا ہے۔ ہم خود اپنی ذات پر تیز سے تیز دھوپ کی بوچھاڑیں سہہ لیتے ہیں۔ لیکن اپنی پناہ میں آنے والوں کو حدت سے بچاتے ہیں۔ ان کے اعصاب کو سکون پہنچاتے ہیں۔ یہ ہماری فطرت ہے اور ہم اپنی فطرت کے خلاف کوئی عمل نہیں کرتے۔'' (۱۰۱)

انسانوں کو بھی اسی طرح ان درختوں سے سبق لینا چاہئے۔ انہیں درختوں کی طرح بلاامتیاز سب کو سکون، راحت

اور آرام پہنچانا چاہیے۔ اس سلسلے میں راہیؔ، عبدالستار ایدھی کا حوالہ دیتے ہیں جنھوں نے اپنی خدمات ہر رنگ و نسل اور ہر مذہب، ملت اور مسلک کے لئے عام کردی تھیں، درختوں ہی کے زبانی وہ آگے لکھتے ہیں:

''انسانوں کو چھتنار پیڑوں سے بزرگی تحمل اور صبر سیکھنا چاہئے۔ ہم کس طرح دھوپ چاٹ کر اپنی پناہ میں آنے والوں کو ٹھنڈی چھاؤں عطا کرتے ہیں، انہیں اس فلسفے کو حرز جاں بنانا چاہئے۔'' (۱۰۲)

بوڑھا برگد مزید کہتا ہے:

''یہ بھی انسانوں کے لئے ایک قابل تقلید امر ہے، ایک حسین درس ہے کہ ہماری طرح وہ بھی زندگی کی تلخیوں اور دکھوں کو سمیٹ کر دوسروں میں سکھ کے شیریں پھل بانٹتے رہیں کہ یہی اصل زندگی ہے اور یہی دنیا کی تخلیق کا ایک بہت بڑا راز ہے۔'' (۱۰۳)

راہیؔ اس ناولٹ میں بچوں اور بڑوں، دونوں کو اس بات کا درس دیتے ہیں کہ کبھی بھی کسی کی امانت میں خیانت نہیں کرنی چاہئے۔ چنانچہ جب ایک ڈاکو کسی بیوہ عورت کی بیٹی کے جہیز کا سونا چوری کر کے بوڑھے برگد کے اندر ایک سوراخ میں رکھ کر چلا جاتا ہے، بعد میں دو آدمی اس کی تلاش میں بوڑھے برگد تک آ پہنچتے ہیں۔ تو وہ اُن کو سارا ماجرا سناتا ہے اور انہیں سونا دے کر نصیحت کرتا ہے کہ یہ اس بوڑھی عورت کو دے دینا اور امانت میں خیانت نہ کرنا۔ چنانچہ راہیؔ بوڑھے برگد کی زبانی لکھتے ہیں:

''تم لوگ جس ڈاکو کی تلاش میں نکلے ہو، وہ چوری والا رنگین ڈبا مجھ برگد کے بڑے سوراخ کے اندر چھپا کر رکھ گیا ہے۔ ذرا سوراخ میں جھانکو، امانت اٹھالو اور جا کر بیوہ عورت تک پہنچا دو۔ مگر دیکھنا، امانت میں خیانت نہ کرنا ورنہ سزا بھگتو گے۔'' (۱۰۴)

اس طرح راہیؔ بتاتے ہیں کہ اگر کوئی امانت میں خیانت نہیں کرتا اور اُسے بحفاظت پہنچاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے اس دنیا میں صلہ بھی دیتا ہے۔ جس طرح ناولٹ میں ایماندار نوجوان، بڑھیا تک امانت یعنی سونے کا رنگین ڈبا پہنچا دیتا ہے تو بڑھیا خوشی سے اس کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ کر دیتی ہے، نوجوان بہت خوش ہوتا ہے کہ اس کا رشتہ ایک اچھے خاندان میں ہو گیا ہے۔ کیونکہ بڑھیا لوگوں میں اچھے اخلاق اور پارسائی کے لئے مشہور تھی۔ لکھتے ہیں:

''بوڑھی عورت بولی'' یہ بندہ میرے لئے اللہ کی جانب سے فرشتہ بن کر آیا اور اس کی یہ ادا مجھے اتنی بھائی کہ میں نے اس کی رضا معلوم کر کے اس کے ساتھ اپنی بیٹی کی منگنی بھی طے کر ڈالی''۔ (۱۰۵)

علاوہ ازیں راہیؔ نے ''بولتے برگد'' میں مکافاتِ عمل کے مفہوم اور معنی کو بھی بہت مؤثر طریقے سے بیان کیا ہے، اور کہا ہے کہ انسان جیسا کرتا ہے ویسا ہی بھرتا ہے۔ اگر وہ دوسروں کے گھروں میں آگ لگاتا ہے تو ایک دن وہ خود اپنے لگائے ہوئے آگ میں جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں وہ ڈاکو اور ایک تاجر کے واقعہ کو بیان کرتے ہیں کہ جب ڈاکو برگد کے درخت میں سونا چھپا کر دوبارہ اُسے لینے آتا ہے تو سونا نہ پا کر وہ بے چین ہو جاتا ہے۔ اس دوران اس کی نظر

ایک تاجر پر پڑتی ہے جو اپنے مال سمیت برگد کے درخت کے قریب سے گزر رہا ہوتا ہے۔وہ اُس پر شک کر کے اُسے مارنے کے لئے آگے بڑھتا ہے تو تاجر اس کے سینے میں گولیاں پیوست کر دیتا ہے جس پر بزرگ برگد بے اختیار پکار اُٹھتا ہے:

> ''اس کو کہتے ہیں مکافات عمل، اُس لٹیرے نے نہ معلوم کتنے لوگوں کو لوٹا ہوگا، کتنوں کو بے آسرا کر دیا ہو گا۔کتنوں کے ساتھ ظلم روا رکھا ہوگا اور شاید کتنے ہی بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہوگا۔ لیکن آج وہ خود چند لمحوں میں موت کی وادی میں چلا گیا۔''(۱۰۶)

ناولٹ کے آخر میں راہیؔ گوتم بدھ کا حوالہ دے کر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا درس دیتے ہوئے انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ کس طرح کپل وستو کے شہزادے نے اپنا شاہی لباس اتار کر دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

جب نوجوان پیڑ بوڑھے برگد سے یہ سوال کرتا ہے کہ کیا کبھی دنیا کی عظیم ہستیوں نے بھی ہم سے کوئی تعلق رکھا ہے؟ تو اس پر بوڑھا برگد، گوتم بدھ کے حساس دل کا ذکر کر کے کہتا ہے:

> ''وہی گوتم بدھ جسے قدرت نے ایک حساس دل اور سوچنے سمجھنے کی بے پناہ صلاحیت عطا کی تھی ایک روز اُس نے بازار میں ایک خمیدہ کمر بوڑھی عورت کو دیکھا۔اس کے چہرے پر بچی ہوئی جُھریوں اور اس کی لاٹھی پر نظر ڈالی تو پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اسے بتایا گیا کہ یہ دل کش جوانی کا زوال ہے۔پھر لوگوں کو ایک جنازے کو کاندھا دیتے پایا تو اس کے بارے میں سوال کیا پتہ چلا کہ یہ انسانی زندگی کے ڈرامے کا آخری سین ہے یوں اُس کے ذہن میں پے بہ پے سوالات گچھوں کی صورت میں جنم لیتے رہے''۔ (۱۰۷)

زندگی کی اس ناپائیداری اور بے ثباتی کو دیکھ کر بالآخر شہزادہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے اور ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر روحانی مراتب حاصل کرتا ہے۔

فنی جائزہ:

ناولٹ ''بولتے برگد'' جس طرح فکری لحاظ سے راہیؔ کی تخلیقی صلاحیتوں کا مُنہ بولتا ثبوت ہے، اسی طرح فنی لحاظ سے بھی یہ ایک بہترین ناولٹ ہے۔دیگر ناولٹوں کی طرح یہاں بھی راہیؔ کا فن اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ناولٹ کا پلاٹ، مکالمے، کردار نگاری، منظر نگاری، اسلوب اور زبان ہر زاویے سے تراشیدہ اور برمحل ہیں۔موضوع کے لحاظ سے بھی یہ ایک انوکھا ناولٹ ہے اور درختوں سے متعلق مفید تحقیقی معلومات سے بھی بھرپور راہیؔ کے ہاتھ کا ایک انمول شاہکار ہے۔

پلاٹ:

اگر اس ناولٹ کے پلاٹ کی بات کی جائے، تو اس کی کہانی اور واقعات مختلف ٹکڑوں میں بٹے اور بکھرے ہوئے

ہیں۔ راہیؔ نے درختوں کی زبانی ہی درختوں کی مختلف اقسام اور افادیت کو گنوایا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف چھوٹے چھوٹے واقعات کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس بارے میں فضل ربی راہی کتاب کے آغاز میں فرماتے ہیں:

''ناولٹ کا پلاٹ ایک ایسی کہانی پر مشتمل ہے جو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ لیکن ان میں ایک تسلسل ہے۔ روانی ہے جو پڑھنے والے کو آخر تک اپنے ساتھ جُڑا رکھتی ہے۔'' (۱۰۸)

مثلاً کسی عمر رسیدہ شخص کا تین برگد کے درختوں تلے آرام کرنا، اور ان کے لئے لمبی عمر کی دعا کر کے فوت ہو جانا، پھر اس کے رشتہ داروں کا اُسے وہاں سے لے کر جانا، کسی انگریز کا نشے کی حالت میں لنڈی کوتل کے ایک برگد کے درخت کو زنجیروں سے جکڑ کر قید کرنا، اسی طرح ایک ڈاکو کا کسی بڑھیا کی بیٹی کے جہیز کا سونا چوری کرنا اور اُسے بوڑھے برگد کے اندر ایک سوراخ میں چھپا کر رکھنا، اس دوران وہاں سے کسی تاجر کا گزرنا، ڈاکو کا دوبارہ برگد کے پاس آنا اور سونا نہ پا کر تاجر پر حملہ کرنا، مکافاتِ عمل کے طور پر تاجر کا ڈاکو کو قتل کر کے جانا، اسی طرح ایک خرکار اور لڑکے کے اغوا کا واقعہ سُنانا، اور پھر بوڑھے برگد کا اُس لڑکے کی جان بچانا، بعد میں اس لڑکے کا فارسٹ آفیسر بن کر اس علاقے کو سرسبز و شاداب بنانا۔ مزید برآں دو نوجوانوں کا سُونے کی تلاش میں بوڑھے برگد تک پہنچنا، برگد کا انہیں سُونے کے رنگین ڈبے کے بارے میں بتانا، اور امانت میں خیانت کیے بغیر بڑھیا کو واپس لوٹانا، نوجواں کا امانت کو بحفاظت بُوڑھیا تک پہنچانا اور بڑھیا کا خوش ہو کر اُس سے اپنی بیٹی کا رشتہ طے کرنا، وغیرہ۔

غرض اسی طرح پورا ناولٹ چھوٹے چھوٹے واقعات پر مبنی ہے، جو ایک ہی مقصد کی طرف رواں دواں ہیں۔ تب ہی فضل ربی راہیؔ نے بجا طور پر کہا ہے کہ ان سارے واقعات میں ایک تسلسل اور روانی ہے جو شروع سے لے کر آخر تک قاری کی دلچسپی کو قائم رکھتے ہیں۔ پس ناولٹ کا پلاٹ سادہ رواں، اور ہر قسم کی پیچیدگی سے مبرا ہے۔

کرداری نگاری:

چونکہ اس ناولٹ میں کئی چھوٹے چھوٹے واقعات کو بیان کر کے کہانی تخلیق کی گئی ہے۔ اس لئے اس میں کرداروں کی ایک وسیع گیلری نظر آتی ہے۔ ناولٹ کا آغاز ایک تھکے ماندے بوڑھے ضعیف شخص کے کردار سے ہوتا ہے جب وہ کڑی دھوپ میں سائے کی تلاش میں برگد کے تین درختوں کے پاس پہنچ کر ان کے نیچے ستانے کے لئے لیٹ جاتا ہے:

''تھکا ماندہ بوڑھا شخص ضعف کے مارے قریب قریب گھسٹتا ہوا برگد کے درختوں کی جانب بڑھا اور ان کے سائے تلے پہنچ کر نیم بے ہوشی کے عالم میں دراز ہو گیا۔'' (۱۰۹)

پورے ناولٹ کی کہانی برگد کے تین درختوں کے گرد گھومتی ہے، ان درختوں میں چونکہ بزرگ برگد کا درخت، عمر میں بڑا ہوتا ہے۔ اس لئے بہت سے واقعات، تجربات اور بے شمار قصوں کا آمین ہوتا ہے، بوڑھا برگد اس کہانی کا مرکزی کردار ہے اور اسی کی زبانی سارے ناولٹ کی کہانی، واقعات اور قصے ہم تک پہنچتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی کردار ضمنی طور پر

ہمارے سامنے آتے ہیں اور ارتقا کے عمل سے ہمکنار ہوئے بغیر رخصت ہو جاتے ہیں۔ برگد کے تین درختوں، معمر شخص کے علاوہ، اس ناولٹ میں اور بھی بہت سارے کردار ہیں۔ مثلاً موٹر سائیکل سوار ایک شخص جو دو اور نوجوانوں کے ساتھ مل کر بوڑھے ضعیف آدمی کی لاش کو ایک گاڑی میں لے جاتا ہے۔ ایک انگریز افسر جیمز سکویڈ، جو نشے کی حالت میں برگد کے درخت کو زنجیروں میں قید کرتا ہے، اسی طرح نقاب پوش ڈاکو، تاجر، کچھ پولیس اہل کار، خرکار اور لڑکا، چھکڑا چلانے والا استاد اور اُس میں بیٹھا ہوا ایک مزدور، بڑھیا، اور بڑھیا تک امانت پہنچانے والا نوجوان، سب اس ناولٹ کے ضمنی کردار ہیں۔

اس کے علاوہ بوڑھا باریش برگد مختلف واقعات کے بیان میں کچھ مشہور شخصیات کا ذکر بھی کرتا ہے، جیسے قدرت اللہ شہاب، عبدالستار ایدھی، سماجی شخصیت ڈاکٹر رمیش کمار ونکوانی اور گوتم بدھ وغیرہ۔ لیکن ان شخصیات کا عمل دخل صرف ذکر کرنے تک ہی محدود ہے اور یہ بذات خود کہانی میں شامل نہیں۔

مکالمہ نگاری:

فنی لحاظ سے کسی ناولٹ کی خوب صورتی اور کامیابی کا دارومدار اس کے مکالموں پر منحصر ہوتا ہے۔ کیونکہ مکالمہ یعنی بات چیت کا انداز جتنا عام فہم اور سلیس ہوگا، بچے اتنی ہی زیادہ دلچسپی لیں گے، نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی اِس سے محظوظ ہوں گے۔ راہی اس فنی تکنیک سے بخوبی آگاہ ہیں، تب ہی ان کے ہر ناولٹ کے مکالمے کرداروں کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ اگرچہ اس ناولٹ میں مختصر، برجستہ اور موقع ومحل کے مطابق مکالمے جا بجا موجود ہیں لیکن طوالت کے پیش نظر یہاں صرف ایک مثال پر ہی اکتفا کی جاتی ہے کہ جب نقاب پوش ڈاکو، بوڑھی عورت کے سونے کا رنگین ڈبا چوری کر کے باریش برگد کے اندر بنے ہوئے ایک قدرتی سوراخ میں چھپا کر رکھتا ہے تو دو نوجوان اُس ڈاکو کی تلاش میں برگد کے درخت کے قریب پہنچ کر سارا ماجرا سناتے ہیں کہ اب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کوئی معجزہ کر کے سونا دلا سکتا ہے۔ اس پر ان دو آدمیوں اور برگد کے درخت کے مابین جو گفتگو ہوتی ہے، وہ انتہائی شستہ، آسان اور عام فہم ہے، ملاحظہ ہو:

''دوسرا ساتھی بولا: اب خداوند عزوجل ہی کوئی غیبی بندوبست کردے تو یہ سونا مل سکے گا''۔

''اللہ تبارک وتعالیٰ نے بندوبست کر دیا ہے''۔ ایک آواز اُبھری۔

دونوں گھڑسوار چونک کر دائیں بائیں دیکھنے لگے اور ان میں سے ایک بولا:

''یہ کون بولا؟'' مگر انہیں آس پاس کوئی بندہ نظر نہیں آیا۔ اوپر درختوں کی جانب نگاہ دوڑائی۔ وہاں بھی کوئی شخص موجود نہیں تھا۔

دوسرے شخص نے کہا: ''مجھے تو لگتا ہے کوئی سلیمانی ٹوپی پہن کر بول رہا ہے''۔

''نہیں، کوئی جن بھوت ہے، اس بوڑھے برگد میں''۔ پہلے نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''نہ کوئی سلیمانی ٹوپی والا ہے اور نہ کوئی جن بھوت''۔ عمر رسیدہ برگد بولا۔

''تو پھر یہ آواز کہاں سے آرہی ہے؟'' پہلے شخص نے پوچھا۔ ''تم اس وقت مجھ بوڑھے برگد سے مخاطب ہو۔ یہ آواز میری ہے۔''
''لیکن کیا درخت بھی کبھی گفتگو کرتے ہیں؟''۔ ''نہیں کرتے لیکن یہ جو ہم تین برگد کھڑے ہیں، یہ کسی نیک انسان کی پُر خلوص دعا کی قبولیت کے بعد بولنے کے قابل ہوئے ہیں۔''
(۱۱۰)

یہ مکالمہ پُر تجسس ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم اور کرداروں کی نفسیات کے عین مطابق تحریر کیا گیا ہے۔

منظر نگاری:

ناولٹ کے دیگر فنی لوازمات کی طرح، منظر نگاری بھی ایک بنیادی جُز ہے۔ اس میں مصنف نہ صرف فطری مناظر کا عکس پیش کرتا ہے بلکہ انسانی جذبات واحساسات کی حقیقی تصویر بھی سامنے لاتا ہے۔ منظر نگاری میں حقیقت کا رنگ بھرنا ایک مصنف کا آرٹ ہوتا ہے۔ اور یہ آرٹ وہ جس قدر خوب صورتی اور دلکشی کے ساتھ پیش کرے گا، اتنا ہی قاری بوریت کا شکار نہیں ہوگا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ منظر نگاری کا مقصد قاری کو ذہنی طور پر تروتازہ رکھنا اور اس کی دلچسپی کو برقرار رکھنا ہی ہے۔

راہیؔ چونکہ ہر قسم کے مناظر کو حقیقت کا جامہ پہنانے پر عبور رکھتے ہیں، اس لئے ناولٹ کے آغاز میں وہ ایک عمر رسیدہ شخص کا حال، اور سخت گرمی کی شدت کو اس موثر انداز سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے:

''عمر رسیدہ شخص پسینے میں شرابور چلتا جا رہا تھا۔ جون کا مہینہ تھا۔ تپش کا یہ عالم تھا کہ لگتا تھا۔ سورج سوا نیزے پر اتر آیا ہے۔ آس پاس نہ تو کہیں کوئی ٹھنڈا سایہ تھا جس کو اوڑھا جا سکے اور نہ کوئی گھر جس کا دروازہ کھٹکھٹا کر اور پانی مانگ کر حلق کو تر کیا جا سکے۔ سڑک کے دونوں اطراف سخت حدت سے جلی ہوئی جھاڑیاں تھیں۔ نہ کہیں سبزہ، نہ کوئی پیڑ۔ ایک عجیب وحشت تھی جو ہر سو پھیلی ہوئی تھی اور وہ عمر رسیدہ انسان سر پھوارے، اپنی ہتھیلیوں کی مدد سے خود کو سورج کی شعاؤں سے بچانے کی ناکام کوشش کرتا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔
پھر اچانک اُسے برگد کے تین درخت نظر آئے۔ ان میں سے ایک قدرے جوان برگد تھا، دوسرا منجھلا اور تیسرا عمر رسیدہ، کئی سو برس قدیم۔ قدیم برگد بہت تناور اور گھنا تھا۔ کئی مرلوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اُس کی شاخوں سے ریشے جھک کر زمین سے جا ملے تھے۔ چٹیل میدان میں وہ ایک عظیم دیوتا کی طرح کھڑا تھا۔''(۱۱۱)

غرض درج بالا اقتباس راہیؔ کے پُر اثر منظر نگاری اور فنی بالیدگی کا ثبوت دیتا ہے۔

اسلوب اور زبان و بیان:

ناولٹ بولتے برگد، کا اسلوب نہایت ہی سادہ، رواں اور عام فہم ہے۔اس کا انداز بیانیہ ہے جس میں ایک بوڑھا درخت سارے واقعات اور قصے بیان کرتا ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی یہ ایک بہترین ناولٹ ہے۔اس میں بے شمار ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو بچوں کے ذخیرہ الفاظ میں خاطرخواہ اضافے کا سبب بن سکتے ہیں اور جن سے وہ ایک اچھی اردو سیکھ کر لکھ سکتے ہیں، چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

باچشم نم، مردکہن، دُھت، اتھل پتھل، باریش برگد، خال خال، ایستادہ، معمر، حدت، سرعت، استفسار، پاداش، چہ میگوئیاں، ٹمبر مافیا، برسبیل تذکرہ، فی الفور، بہر کیف، خمیدہ کمر، راج پاٹ، وغیرہ وغیرہ۔

اگر غور کیا جائے تو یہ الفاظ وتراکیب نہ صرف بچوں بلکہ بڑوں کے لئے بھی اردو سیکھنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔عموماً یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھنے والے بچے اردو کے مضمون میں کمزور ہوتے ہیں۔ان کا فوکس ان مضامین پر نسبتاً کم ہوتا ہے۔اس لئے انہیں املاء میں مشکلات درپیش آتی ہے۔اس ناولٹ کی بدولت بچے نئے الفاظ وتراکیب سیکھ سکتے ہیں اور کافی حد تک اردو زبان کی سمجھ بوجھ حاصل کر سکتے ہیں۔اس بارے میں میجر جنرل (ر) عاشور خان لکھتے ہیں:

> ''تحریر کا انداز بیان اتنا سلیس اور عام فہم ہے کہ قاری کو کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ نہ ہی نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور نہ ہی تھکاوٹ کا احساس۔ایک دفعہ شروع کر کے ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو دل چاہتا ہے۔راہیؔ صاحب کا ناولٹ ''بولتے برگد'' ان کی باقی تصانیف کی طرح بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔بچوں کے لئے اس طرح کی آسان فہم اور سلیس اردو کی تحریریں ان کی اردو کی سمجھ بوجھ میں اضافہ کرتی ہیں، خاص طور پر انگلش میڈیم میں پڑھنے والے بچوں کے لئے۔'' (۱۱۲)

المختصر ''بولتے برگد'' میں راہیؔ نے مختلف چھوٹے چھوٹے واقعات کو مرکزی خیال سے جوڑ کر اس قدر خوب صورتی اور وحدت تاثر کے ساتھ پیش کیا ہے کہ قاری نہ صرف اس سے محظوظ ہوتا ہے بلکہ شروع سے لے کر آخر تک اس کی دلچسپی بھی قائم رہتی ہے اور یوں تفریح کے ساتھ ساتھ اس ناولٹ کے پڑھنے کے دیگر مقاصد بھی بطریقِ احسن پورے ہوتے ہیں۔

۷۔ سرخ سیارہ:

''سرخ سیارہ'' شجاعت علی راہیؔ کا ساتواں طبع شدہ ناولٹ ہے۔موجودہ دور چونکہ ایک سائنسی دور ہے اور ہر طرف کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور سمارٹ فون کا چرچا ہے۔ بچے بھی پرانے وقتوں کی طرح کتابوں اور رسائل کے مطالعے کی لذتوں سے محروم ہیں کیونکہ مجموعی طور پر کتاب کلچر ہی زوال پذیر ہو رہا ہے۔ایسی صورت میں لازم ہے کہ بچوں کے لئے ادب تخلیق

کرنے والے ادیب، موجودہ دور کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اُن کے لئے مُفید، معلوماتی، بامقصد اور سائنسی ادب تخلیق کرے تاکہ بچے نہ صرف ان میں دلچسپی لیں بلکہ اسے پڑھنے پر مجبور ہو جائیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائنس فکشن (Science Fiction) سے کیا مراد ہے؟

اس بارے میں ڈاکٹر محمد اشرف کمال، موجودہ دور کو ذہن میں رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سائنس کی ترقی اور نئی نئی ایجادات نے جب انسان کے اُڑنے کے خواب کو ممکن بنایا اور پلک جھپکتے میں ادھر سے اُدھر بات ہونے لگی، بیٹھے بیٹھے پیغامات اور ڈاٹا ایک جگہ سے ہزاروں میل بھیجا جانے لگا تو ایسے حالات میں سائنس فکشن کا وجود میں آنا کوئی اچھنبے کی بات نہیں تھی۔
> اب جادوئی گولوں کی جگہ کمپیوٹر اور جدید مشینوں نے لے لی اور بھوتوں، جنوں، دیوؤں کی جگہ فکشن روبوٹ چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔ یہ ایک فینٹسی کی دنیا ہے جس میں مستقبل میں ہونے والی ایجادات کے حوالے سے قیاس آرائی کو موضوع بنایا جاتا ہے۔''(۱۱۳)

سائنس فکشن کے موضوع پر بچوں کے لئے بہت کم ناول نگاروں نے قلم اُٹھایا ہے۔ جن ادیبوں نے اس شعبہ ادب کو بہترین تخلیقات سے نوازا، اُن میں ظفر پیامی کا ناول ''ستاروں کے قیدی''، سراج انور کا ''بھیانک جزیرہ''، ''کالی دنیا''، ''نیلی دنیا''، کرشن چندر کا ''ستاروں کی دنیا''، مرزا اطہر بیگ کا ناول ''صفر سے ایک تک''، حجاب امتیاز علی کا ناول ''پاگل خانہ''، بانو قدسیہ کا ناول ''موم کی گلیاں'' اور نجیب وکیل کا ناول ''کمپیوٹان'' شامل ہیں۔

بچوں کے لئے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق، بامقصد اور سائنسی ادب تخلیق کرنے والے ادیبوں میں ایک نام شجاعت علی راہیؔ کا بھی ہے۔ انہوں نے بچوں کے لئے ''سرخ سیارہ'' کے نام سے ایک ایسا ناولٹ تحریر کیا ہے جس میں نظام شمسی، مریخ اور اس کے حوالے سے زندگی کا ایک تصوراتی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس بارے میں فضل ربی راہیؔ کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> ''سرخ سیارہ'' ایک نئے اور اچھوتے موضوع پر لکھا گیا ناولٹ ہے جسے ہم بچوں کے لئے اردو میں لکھی گئی سائنسی کہانیوں (سائنس فکشن) میں ایک گراں قدر اضافہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس ناولٹ کی کہانی کے تانے بانے ایسے بُنے گئے ہیں جس میں بچوں کے لئے نئی معلومات کے ساتھ ساتھ سسپنس اور دلچسپی کا بھی پورا خیال رکھا گیا ہے''(۱۱۴)

ہر ناولٹ کی طرح اس ناولٹ میں بھی راہیؔ نے تحقیقی اور معلوماتی انداز اپنا کر اس امر پر زور دیا ہے کہ بچوں کو خیر و نیکی کا درس دیا جائے اور ان کے دل میں پوری انسانیت کے لئے محبت اور امن و آشتی کے جذبات کو اُجاگر کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ان میں کتابوں سے لگاؤ اور سچ بولنے کی قوتِ ارادی کو مضبوط کیا جائے۔ اس بارے میں راہیؔ نے اپنے ایک انٹرویو میں راقمہ کو بتایا:

"میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ انسانی زندگی اوراس کے رنگا رنگ مذاہب سے اپنا رشتہ جوڑے رکھوں اورنئی نسل کی تعلیم وتربیت میں اپنا حصہ ڈالواور اُنہیں اخلاقی اقدار سے بھی متعارف کراؤں۔ ان کے لئے تفریح کا سامان بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ، ان کے دل و دماغ کے دریچے کھول کر تر و تازہ ہواؤں کے جھونکوں کے آنے کا سلسلہ بحال رکھوں۔ تاکہ وہ ایک صحت مند زندگی گزارنے کے قابل ہوسکیں اورزندگی کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے اور برتنے کی کوشش کریں۔" (۱۱۵)

پس زیرنظر ناولٹ میں راہیؔ نے امن، محبت اور خلوص سے رہنے کا پیغام دیا ہے جو اس ناول کا مرکزی خیال بھی ہے۔ یہ ناولٹ چونکہ راہیؔ نے اپنی چہیتی پوتی زہاب زہرا کی تحریک پر لکھا ہے اس لئے اس کا انتساب بھی انہوں نے ان کے نام کیا ہے۔

کہانی:

ناولٹ میں مصنف کی پوتی انمول، اپنی تیسری اور پیاری بلی کے مرجانے پر بہت افسردہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہے کہ مجھے ایک اور پیاری سی بلی عطا کردے، جو میرے اور میرے گھر والوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے رہے۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے بھی دو بلیاں انمول کا ساتھ چھوڑ چکی ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے، اگر دعا کے باوجود بھی انسان کو کوئی چیز نہیں ملتی تو اُسے نا اُمید نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اُس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اسے بہتر نعمتوں سے نوازتا ہے، سو انمول کو بھی اللہ تعالیٰ نے پھول جیسی بہن سے نوازا، جو اپنے حسن اور خوب صورتی میں کئی بلیوں پر بھاری تھی۔ اس کا نام زہاب زہرا رکھا گیا اور انمول اسے زوہا کہہ کر پکارا کرتی۔ زوہا کی موجودگی میں انمول، اپنی بلیوں کا دکھ بھول کر اس کے ساتھ ہنسی خوشی رہا کرتی ہے۔ اس کا بڑا جی چاہتا ہے کہ وہ زوہا کو اپنے ساتھ کمرے میں بھی سلائے، لیکن چونکہ وہ بہت چھوٹی ہوتی ہے، اس لئے فی الحال ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

ایک دن، ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آتا ہے۔ رات کو زہاب کی امی کی آنکھ کھلتی ہے تو زوہا کو اپنے ساتھ بستر پر نہ پا کر پریشان ہوجاتی ہے۔ وہ پہلے اسے کمرے میں اور پھر پورے گھر میں ہر جگہ تلاش کرتی ہے لیکن وہ کہیں بھی نہیں ملتی۔ اسی شور پر انمول نیند سے بیدار ہوتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ ننھی زوہا اس کے پہلو میں اس کے ساتھ لیٹی ہوئی ہے۔ وہ اسے پیار کر کے اپنی گود میں لے کر اپنے کمرے سے نکلتی ہے تو اس کی امی زوہا کو اس کے ساتھ دیکھ کر حیران ہوجاتی ہے کہ یہ تمہارے کمرے میں کیسے پہنچی؟ انمول کی امی یہ سمجھتی ہے کہ آدھی رات کو انمول، زوہا کو اٹھا کر اپنے ساتھ روم لے کر گئی ہے۔ چنانچہ اسے خوب ڈانٹ پلاتی ہے۔ انمول انکار کرتی ہے کہ وہ زوہا کو لے کر نہیں گئی بلکہ وہ پہلے سے اس کے بستر پر سوئی ہوئی تھی۔ لیکن اس کی بات پر کوئی بھی یقین نہیں کرتا کیونکہ سب یہ سوچتے ہیں کہ اگر انمول اس کو لے کر نہیں گئی، تو اتنی چھوٹی سی بچی خود کیسے ان کے کمرے میں جاسکتی ہے؟ پس اس واقعے پر سب گھر والے اور رشتہ دار طرح طرح کے سوالات اُٹھاتے ہیں اور

مختلف قسم کی کہانیاں گڑھتے ہیں۔

ایک دن انمول کی پھوپھی ویک اینڈ گزارنے کے لیے اپنے بچوں سمیت ان کے گھر (بحریہ ٹاؤن) آتی ہے۔ پھر انمول اپنی پھوپھی زاد بہنوں کے ساتھ خوب مل کر کھیلتی ہے۔ نورالعین تھوڑی سنجیدہ مزاج کی مالک ہوتی ہے جبکہ گل اندام اور انمول کی آپس میں خوب بنتی ہے۔ حسب معمول جب رات کو سب گھر والے سو جاتے ہیں تو انمول اور گل اندام آپس میں گپ شپ میں مشغول ہوتی ہیں۔ انمول، گل اندام کو بتاتی ہے کہ اگلے ہفتے اسے مارننگ اسمبلی کے لیے نظام شمسی کے بارے میں تقریر کرنے کو کہا گیا ہے، چنانچہ وہ اس بارے میں معلومات اکٹھا کر کے گل اندام کے ساتھ شیئر کرتی ہے کہ سورج نظام شمسی کا ایک واحد ستارہ ہے اور باقی سب سیارے ہیں۔ نظام شمسی میں کل آٹھ سیارے ہیں۔ پہلے پلوٹو بھی نظام شمسی کا واحد حصہ تھا لیکن اب سائنس دانوں کی جدید تحقیق کے مطابق پلوٹو نظام شمسی کا حصہ نہیں ہے، اب اسے بونا سیارہ کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سورج کے گرد اپنے مدار میں گردش کرنے والے سیاروں میں زمین بھی شامل ہے۔ انمول گل اندام کو ایک اور معلوماتی بات بھی بتاتی ہے کہ زمین کے علاوہ باقی سیاروں کے نام یونانی اور رومی دیوتاؤں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً Mars یعنی مریخ، جنگ کے دیوتا کا نام تھا۔ Jupitar، مشرقی رومن دیوتاؤں کا بادشاہ اور Uranus بھی قدیم دیوتاؤں کا بادشاہ تھا، جبکہ نیپچون سمندری دیوتا کے بادشاہ کا نام تھا۔ pluto مردوں کا دیوتا، Mercury یعنی عطارد سفر کا دیوتا اور Venus محبت کے دیوتاؤں کے نام تھے۔

گل اندام کے پوچھنے پر انمول اسے مزید بتاتی ہے کہ زمین کے علاوہ مریخ وہ قیمتی سیارہ ہے جہاں زندگی کے امکانات موجود ہیں اور یہ کہ زمینی دن ۲۴ گھنٹے اور سال ۳۶۵ دن کا ہوتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں مریخی دن ۳۹، ۴۰ منٹ طویل ہے اور اسی مناسبت سے مریخی سال بھی ۶۸۷ دنوں پر مبنی ہے۔

اس کے بعد دونوں کے درمیان مریخ سے متعلق ایک مووی ''تھادی مارشین'' (جو کہ ایک سائنس فکشن پر مبنی مووی ہے) پر بات ہوتی ہے۔ انمول اور گل اندام، نظام شمسی کے بارے میں آپس میں بات چیت میں مصروف ہوتی ہیں کہ اچانک انمول کی امی کے کمرے سے دھنک جیسی روشنی نکلنی شروع ہو جاتی ہے اور زہاب کو ہوا میں اٹھا کر لے جاتی ہے۔ انمول اور گل اندام زہاب کو بچانے کے لیے آگے بڑھ کر اس سے پوچھتی ہیں کہ ''تم کون ہو؟'' روشنی سے موسیقی جیسی آواز آتی ہے کہ ''میں مریخ کی شہزادی شمرا ہوں۔''

انمول جرأت کر کے اُس سے زہاب کے بارے میں پوچھتی ہے کہ تم اسے کہاں لے کر جا رہی ہو؟ جس پر شمرا کہتی ہے کہ وہ کچھ دنوں سے پیاری زوہا کو ایک آدھ گھنٹے کے لیے اپنے ساتھ مریخ لے کر جاتی ہے اور پھر اسے واپس بھی لاتی ہے، جس پر انمول اور گل اندام پہلے تو بہت حیران ہوتی ہیں کیونکہ یہ بات اُن کے علم میں نہیں ہوتی۔ پھر سوال کرتی

ہیں کہ اتنے کم وقت میں مریخ تک کا فاصلہ کیسے طے کیا جا سکتا ہے؟

شمزا جواب دیتی ہے کہ مریخی مخلوق اپنی تیز رفتاری کے بناء پر کم وقت میں زیادہ فاصلہ طے کر سکتے ہیں۔ یقین دہانی کے لیے وہ انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر جانے کی دعوت دیتی ہے اور یوں زہاب کے ساتھ انمول اور گل اندام کو بھی اپنے ساتھ مریخ کی سیر کے لیے لے جاتی ہے۔ جب سب سرخی مائل مریخ پر پہنچتے ہیں، تو انمول شمزا سے اتنے مختصر وقت میں پہنچنے کا راز پوچھتی ہے۔ شمزا اسے بتاتی ہے کہ اس نے ان کے جسم کو توانائی میں تبدیل کر کے مریخی تکنیک کے ذریعے انہیں مریخ تک پہنچایا ہے۔ تھوڑی دیر بعد انمول، گل اندام اور زہاب ایک خوب صورت شیش محل میں داخل ہوتی ہیں۔ وہاں ان کی ملاقات شمزا کی ماں، ملکہ مسکان سے ہوتی ہے جو تین سو سالوں سے مریخ کی ملکہ ہوتی ہے۔ شمزا اپنی امی سے باری باری ان زمینی مہمانوں کا تعارف کراتی ہے۔ اس کی امی بھی سارے بچوں سے مل کر بہت خوش ہوتی ہیں اور انہیں نصیحت کرتی ہے کہ تم سب بہت پیارے بچے ہو، سچ بولتے ہو، اس لیے ہمیشہ نیک کام کرو۔ تم لوگ جتنا اچھا کام کرو گے، اتنے ہی خوب صورت اور حسین لگو گے۔ اس کے بعد انمول، گل اندام اور زہاب جیسی معصوم اور پیارے زمینی مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے، مریخ کی روشنیوں کی ننھی منی لکیریں خوب صورت پریوں اور پریزادوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، یوں بہت ساری پریاں وجود میں آتی ہیں۔ پھر یہ سب پریاں مل کر ہلکی ہلکی موسیقی کے ساتھ ایک ویلکم سانگ یعنی گیت گاتی ہیں۔ گیت کے اختتام پر سب زمینی مہمانوں کو خوش آمدید کہہ کر گلدستہ پیش کرتی ہیں اور جاتے جاتے ننھی زہاب کی طرف ایک فلائنگ کس بھی پھینکتی ہیں۔ چند لمحوں بعد دیکھتے ہی دیکھتے ساری پریاں دوبارہ روشنی میں تبدیل ہو کر غائب ہو جاتی ہیں۔

اس خوب صورت منظر کے خاتمے کے بعد شمزا انمول کو اپنا تحقیقی مرکز دکھاتی ہے۔ جہاں زمین سے متعلق بلغاریہ کی ایک خاتون بابا وانگا کے بارے میں، ایک ڈاکومینٹری فلم چل رہی تھی۔ اس خاتون نے امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی، چین کے سپر پاور بننے، اور قطبین پر برف پگھلنے (جس سے سمندر کی سطح بہت بلند ہوگی) کی پیشن گوئی کی تھی۔ جس میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی دہشت گردی کا واقعہ اور سویت یونین یعنی روس کا ٹکڑوں میں تقسیم ہو جانا سچ بھی ثابت ہوا۔

انمول یہ ساری باتیں سن کر بہت حیران ہوتی ہے کہ مریخ کی مخلوق نہ صرف زمین بلکہ پورے نظام شمسی کے بارے میں کتنی اہم اور حیران کن معلومات رکھتی ہے۔ شمزا پھر اسے سائنسی لیبارٹری کے ڈائریکٹر سے بھی ملواتی ہے۔ ڈائریکٹر بڑے پیار اور شفقت سے زمینی مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہے اور انسانوں کے مریخ پر بس جانے کے خیال کو سراہتا ہے اور اس پر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔

انمول، مریخی مخلوق کی ان کاوشوں سے متاثر ہو کر کہتی ہے کہ زمینی سائنس دانوں نے بھی مریخ کے بارے میں

بہت تحقیقات کی ہیں اور اس کی سرخ رنگت کو جنگ اور تباہی کی علامت قرار دیا ہے۔مزید یہ بھی بتاتی ہے کہ مریخ پر انسانی آبادی قائم کرنے کی بھی بھر پور کوششیں تا حال جاری ہیں۔

انمول کی باتیں سن کر ڈائریکٹر کہتا ہے کہ نظام شمسی کی تمام مخلوقات کو آپس میں پیار و محبت سے مل کر رہنا چاہیے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہئے۔بدگمانیوں سے دور رہنا چاہئے کیونکہ اگر ہم ایک دوسرے کا خون کریں گے تو ایک دن ہم سب اکیلے رہ جائیں گے اور یوں خود اپنے ہاتھوں سے اپنا خاتمہ کر دیں گے۔لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم صرف امن و آمان کو فروغ دیں۔

انمول ہاں میں ہاں ملا کر مزید کہتی ہے کہ ''جی ہاں! سر آپ بجا فرما رہے ہیں۔جنگ واقعی ایک تباہ کن شے ہے۔ انسانوں سے پہلے جنوں نے فتنہ وفساد سے اپنی نسلوں کو اجاڑا۔پھر انسانوں میں چنگیز خان اور حجاج بن یوسف جیسے جابر حکمرانوں نے لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا۔اسی طرح امریکہ نے بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہیروشیما اور ناگاساکی، پر ایٹم بم گرا کر قتل وخون کے بازار گرم کیے۔اس لیے ہمیں واقعی امن وامان سے رہنا چاہیے''۔مریخی سائنس دان، انمول کی باتیں سن کر بہت خوش اور مطمئن ہوتا ہے۔اور کہتا ہے کہ ''جب آپ لوگ زمین پر واپس جائیں تو دنیا کے لوگوں کو ہماری طرف سے امن و آشتی کا پیغام دیں کہ وہ ہرگز ہمیں اپنا دشمن نہ جانیں۔خود بھی دنیا میں چین سے رہیں اور دوسروں کو بھی چین وسکون سے رہنے دیں۔

ادھر انمول، گل اندام اور زہاب، شمزا کے ساتھ مریخ کی سیر کر رہے ہوتے ہیں اور اُدھر زمین پر اُن کے گھر والے، اُن کے یوں اچانک غائب ہونے پر پریشان ہوتے ہیں۔گھر میں ایک قیامت بپا ہوتی ہے۔کیونکہ اس دفعہ صرف زہاب نہیں بلکہ انمول اور گل ندام بھی لاپتہ ہو چکی ہوتی ہیں۔سارے گھر والے ان کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں۔بحریہ ٹاؤن کا سارا سیکورٹی عملہ بھی ہائی الرٹ ہوتا ہے یہاں تک کہ بچوں کی گمشدگی کی خبر میڈیا تک بھی پہنچ جاتی ہے۔مریخ پر گھومتے گھومتے اچانک انمول کو گھر کا خیال آتا ہے کہ اب تو صبح ہو چکی ہوگی اور سارے گھر والے اُنہیں نہ پا کر سخت پریشانی کے عالم میں ہوں گے۔چنانچہ جلدی سے شمزا کی امی سے مل کر اجازت لینے کے بعد انمول، گل اندام اور زہاب، شمزا کے ہمراہ زمینی سفر پر روانگی اختیار کرتی ہیں اور تھوڑی دیر میں طویل سفر طے کر کے زمین پر واپس پہنچتی ہیں، جہاں سب ان کے منتظر ہوتے ہیں۔

فکری جائزہ:

ناولٹ ''سرخ سیارہ'' نہ صرف بچوں کے سائنسی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے بلکہ اس کے ذریعے راہیؔ نے بچوں میں اخلاقی اقدار، خیر و نیکی اور سچ بولنے کی اہمیت کو راسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔

راہیؔ ناولٹ کے آغاز میں بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کی دل سے مانگی ہوئی ہر دُعا کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن ان کی مقبولیت کا اپنا ایک خاص انداز ہے۔ بعض اوقات ہماری کوئی دُعا قبول نہیں ہوتی تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری دُعائیں قبول نہیں کرتا، یا ہم سے بے نیاز ہو گیا ہے، بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ وہ ہماری مانگی ہوئی کسی چیز کے بدلے میں ہمیں اس سے بہتر نعمت سے نوازتے ہیں، جس پر ہم زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

چنانچہ جب انمول کی تین بلیاں اس کے ساتھ بے وفائی کر کے اُسے تنہا چھوڑتی ہیں اور ان میں سے تیسری بلی کے مرجانے پر وہ انتہائی غمگین و افسردہ ہوتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے ایک اور پیاری بلی کے گھر میں آنے کی دُعائیں کرتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اُسے اس دفعہ بلی کی بجائے ایک پیاری اور خوب صورت بہن زہاب (زوہا) سے نوازتے ہیں جس کی آنے کی خوشی میں انمول بلیوں کے دُکھ اور غم کو بھول جاتی ہے۔ راہیؔ لکھتے ہیں:

> ''اللہ میاں ہر دُعا قبول فرماتے ہیں۔ لیکن ان کی قبولیت کا اپنا ایک ڈھنگ ہے۔ کبھی تو دعا میں جو چیز مانگی جاتی ہے، مانگنے والے کو اُس سے کہیں بہتر شے عطا کر دیتے ہیں۔ چند ماہ گزرے تو انمول کو ایک پھول جیسی تر و تازہ، نرم و نازک اور دلکش بہن زوہا مل گئی۔ جو خوب صورتی میں کروڑوں بلیوں پر بھاری تھی۔'' (۱۱۶)

اس ناولٹ میں راہیؔ بچوں کو سچ بولنے کی تلقین کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیشہ ایک دوسری کی مدد کرنی چاہیے۔ والدین کی اِطاعت و فرمانبرداری کرنی چاہئے۔ نیکی اور اچھائی کے کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنی چاہئے، کیونکہ انسان کے نیک کام ہی اُسے دین و دنیا میں خوب صورت مقام دلاتے ہیں۔ اس لئے جب انمول، گل اندام اور زہاب شہزادی شمزا کے ساتھ تفریح پر جاتی ہیں اور ان کی ملاقات اپنی ماں ملکہ مسکان سے کراتی ہے تو ملکہ مسکان خوش ہو کر ان سے مخاطب ہوتی ہے:

> ''جب تم دونوں سچ بولتی ہو، کسی کی مدد کرتی ہو، امی ابو سے پیار کرتی ہو، ان کے احکام پر عمل پیرا ہوتی ہو، پڑھتی لکھتی ہو تو بہت خوب صورت ہو جاتی ہو۔ یاد رکھو، بیٹیو! تمہارے نیک کاموں کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا، تمہارے حُسن میں اُسی نسبت سے اضافہ ہوگا۔'' (۱۱۷)

''سرخ سیارہ'' ایک سائنسی فکشن ہے اور سائنسی فکشن میں زیادہ تر حقائق سے بحث کی جاتی ہے، لیکن راہیؔ نے اِس ناولٹ میں کہانی اور حقائق کو اس خوب صورتی سے جوڑا ہے کہ قاری نہ صرف کہانی سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ راہیؔ کے معلومات اور نصائح کو بھی پلو سے باندھتا ہے۔

جب شمزا اُپنے زمینی مہمانوں انمول، گل اندام اور زہاب کو مریخ کا تحقیقی مرکز دکھانے لے جاتی ہے تو انمول وہاں لیبارٹری کے ڈائریکٹر سے تبادلہ خیال کرتی ہے کہ زمینی سائنس دانوں نے مریخ کے متعلق بہت تحقیقات کی ہیں اور اس کی سرخ رنگت کو جنگ اور تباہی کی علامت قرار دیا ہے۔ اس پر ڈائریکٹر امن و آمان سے رہنے اور جنگ اور قتل و غارت سے گریز کرنے کا کہتا ہے کہ اگر ہم آپس میں ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے تو اس میں ہمارا اپنا ہی نقصان ہے۔ راہی ڈائریکٹر کی زبانی لکھتے ہیں:

> ''ہماری تمنا ہے کہ نظام شمسی کی تمام مخلوقات کے ساتھ ہم باہم مل جل کر رہیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔ اور اگر کوئی کسی وجہ سے بڑی پریشانی کے عالم میں ہو تو اس کی بھرپور مدد کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا اور ایک دوسرے کے بارے میں بدگمانیوں میں مبتلا رہے، قتل و خون کیا اور ایلینز کو تباہ کرنے کی کوشش کی تو پھر ہم اکیلے رہ جائیں گے اور کسی وقت ہم بھی آپس میں لڑ مر کے اپنی نسلوں کا خاتمہ کر بیٹھیں گے۔ ہماری بقا اسی میں ہے کہ ہم سب محبت کریں اور سارے نظام شمسی میں امن و آمان کی فضا کو فروغ دیں۔'' (۱۱۸)

ناولٹ میں راہی ایک اور اہم مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنگ ایک ہولناک اور تباہ کن شے ہے۔ اگر کبھی جنات نے فتنہ و فساد برپا کیا تو اس کے نتیجے میں صرف اپنی ہی بستیوں کو اُجاڑا۔ اسی طرح انسانوں نے بھی جنگ و خونریزی کے ذریعے لاکھوں کروڑوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اس سلسلے میں وہ چنگیز خان اور حجاج بن یوسف کا حوالہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امریکہ نے بھی ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر معصوم اور بے گناہ لوگوں کا قتل عام کیا اور ظلم و بربریت کا ہر ریکارڈ توڑا، اس لئے جنگ کی بجائے امن و آمان کا راستہ ہی اختیار کرنا چاہئے۔ راہی کے اس موقف کے مطابق جب انمول جنگ کی بجائے امن و امان سے رہنے کو ترجیح دیتی ہے تو مریخ کے سائنسی لیبارٹری کا ڈائریکٹر اُس سے بہت زیادہ متاثر ہو کر تعریف کرتا ہے، اور کہتا ہے:

> ''جب آپ واپس جائیں تو دنیا کے سارے انسانوں کے لئے ہماری طرف سے امن و آشتی کا پیغام لے کر جائیں۔'' (۱۱۹)

وہ مزید کہتا ہے کہ زمین والے ہم سے بغض و عناد نہ رکھیں اور ہمیں اپنا دشمن خیال نہ کریں۔ آپس میں خود بھی امن کے ساتھ رہیں اور ہمارے ساتھ بھی دوستی اور محبت کا رشتہ استوار کریں۔ علاوہ ازیں راہی ڈائریکٹر کی زبانی ساری دنیا کی مخلوقات سے پیار کرنے کا درس بھی دیتے ہیں:

> ''نفرت، حرص اور ہوس ہم سب کے دُشمن ہیں۔ ان سے چھٹکارا حاصل کریں اور امن، محبت اور خلوص کو اپنائیں۔ خود بھی چین سے رہیں اور دوسروں کو بھی چین سے رہنے دیں۔'' (۱۲۰)

دراصل یہی راہی کا وہ پیغام ہے جو اس ناولٹ کے ذریعے نہ صرف بچوں کو بلکہ پوری دنیا کو دینا چاہتے ہیں۔

فنی جائزہ:

دیدہ زیب اور اپنے نام یعنی سُرخ سیارہ سے مناسبت رکھنے والا معنی خیز سرورق اور ۷۴ صفحات پر مشتمل یہ ناولٹ جس طرح فکری لحاظ سے انمول ہے، اسی طرح فنی تقاضوں کے عین مطابق راہی کا سائنسی ادب میں ایک بہترین اضافہ ہے۔

پلاٹ:

ناولٹ ''سُرخ سیارہ'' کا پلاٹ بہت سادہ ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انتہائی سادہ ہے جو چھوٹے بچوں کی ذہنی استعداد کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں کہیں بھی کسی قسم کی کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی بلکہ تمام واقعات بہت خوب صورتی اور سسپنس کے ساتھ یکے بعد دیگرے رونما ہوتے ہیں۔ ننھی گڑیا زہاب کا پیدا ہونا، پھر اُسی کے وساطت سے انمول اور گل اندام کا مریخ پر جانا، اور ایک دوسرے کے ساتھ نظام شمسی کے بارے میں معلومات شیئر کرنا، مریخی لیبارٹری کے ڈائریکٹر کے ذریعے امن وامان سے رہنے کا درس دینا، اور پھر مریخ سے واپس زمین پر آنا، وغیرہ۔ یہ تمام سلسلہ وار کڑیاں ظاہر کرتی ہیں کہ ناولٹ کا پلاٹ بہت عام فہم ہے جس سے قاری کا ناولٹ پڑھنے میں انہماک بڑھتا ہے اور وہ ایک ہی نشست میں اسے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کردار نگاری:

راہی کی ناولٹ نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت، ان کی حقیقی کردار نگاری ہے۔ یہاں حقیقی سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے تقریباً اپنے ہر ناولٹ میں کم وبیش ایسے کردار شامل کیے ہیں، جو اُن کے اپنے ہی گھر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں زیادہ تر ان کے قریبی عزیز واقارب ہی ہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ادب کا دائرہ کار حقیقی زندگی کے زیادہ قریب تر ہے۔ اس بات کو انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں اظہار خیال کرتے ہوئے بھی بیان کیا ہے:

> ''ادب خلا میں تخلیق نہیں ہوتا۔ بلکہ ادب تخلیق کرنے کے لئے خام مواد ہمیں زندگی اور جیتے جاگتے کرداروں ہی سے ملتا ہے''۔ (۱۲۱)

زیر نظر ناولٹ میں دو طرح کے کردار ہیں۔ ایک زمینی کردار اور دوسرے مریخی کردار۔ زمینی کرداروں میں مرکزی کردار مصنف کی پوتی، زہاب زہرا کا ہے جس کی تحریک پر راہی نے یہ ناولٹ لکھا۔ کہنے کو تو راہی کو اپنے سبھی بچوں سے بے انتہا پیار ہے اور سب انہیں عزیز ہیں لیکن پیاری زہاب کے ساتھ ان کی انسیت اور محبت وشفقت ہی نرالی ہے۔ وہ ہر روز صبح اس کی ایک نئی تصویر فیس بک وال پر اپ لوڈ کرتے ہیں جو اس کی لازوال اور بے پناہ محبت کی نشانی ہے۔ راہی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ناولٹ ''سرخ سیارہ'' کے لکھنے کی تحریک مجھے میری پھول ایسی نرم و نازک، ننھی منی پوتی زہاب زہرا نے دلائی جو اس ناولٹ کے مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہے''۔ (۱۳۲)

جبکہ شایان مصنف کا پوتا اور انمول و زہاب کا بھائی ہے۔ مرتضیٰ نور العین اور گل اندام کا چھوٹا بھائی ہے، جسے گل اندام مریخ کی سیر کرانا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ مصنف یعنی دادا اور دادی کے کردار بھی شامل ہیں۔ مریخی کرداروں میں شمزا اور اُس کی امی ملکہ مسکان، اس کے علاوہ مریخ کے تحقیقی مرکز کے سائنسی لیبارٹری کے ڈائریکٹر کے چیدہ چیدہ کردار کہانی کا حصہ ہیں اور اپنی پوری قطعیت اور وجود کے ساتھ ناولٹ میں اپنی خاص جگہ اور مقام رکھتے ہیں۔

مکالمہ نگاری:

جہاں تک اس ناولٹ کے مکالموں کی بات ہے تو وہ کرداروں کے لب و لہجے کی صحیح عکاسی اور ترجمانی کرتے ہیں۔ اور راہیؔ کے تخلیقی صلاحیتوں کو نمایاں کر کے ہر خاص و عام میں اسے قبولیت کا سند عطا کرتے ہیں۔ مختصر، عام فہم، سادہ اور بر محل مکالمے اس ناولٹ کی خوب صورتی کی بنیادی وجہ ہے۔

جب مریخ کی شہزادی شمزا، زہاب کو اپنے ساتھ مریخ کے سفر پر لے جاتی ہے۔ تو اس موقع پر انمول، گل اندام اور شمزا کے مابین جو گفتگو ہوتی ہے وہ بہترین مکالمہ نگاری کی تعریف میں داخل ہے۔ ملاحظہ ہو:

''انمول بول اُٹھی: ''دیکھا میں نے کہا تھا نا کہ کوئی عجیب و غریب روشنی امی کے کمرے کی طرف جا رہی ہے، یہ وہی روشنی ہے۔''

گل اندام پریشان ہو کر بولی ''مجھے تو یہ کوئی جن لگ رہا ہے۔ کہیں یہ ہماری زہاب کو اٹھا کر لے نہ جائے ۔اس کو روکنا چاہئے۔''

انمول اور گل اندام دونوں تیزی سے اُٹھیں اور روشنی کی جانب بڑھیں۔

گل اندام نے پوچھا ''تم کون ہو؟ کوئی جن ہو کیا؟

روشنی ذرا تیز ہوئی اور اُس میں سے موسیقی جیسی آواز اُبھری: ''میں مریخ کی شہزادی ہوں۔ میرا نام شمزا ہے''۔

انمول نے پوچھا ''یہ میری بہن کو زوہا کو کیوں اٹھایا ہوا ہے؟ کدھر لے کر جا رہی ہو؟'' ''اچھا! تو اس ننھی منی پری کا نام زوہا ہے۔ میں پچھلے چند دنوں سے روز رات کو یہاں آتی رہتی ہوں۔ زوہا پری مجھے بہت پیاری لگتی ہے۔ میں روزانہ ایک آدھ گھنٹے کے لئے اسے لے جاتی ہوں اور پھر اُسے واپس لے آتی ہوں۔''

کہاں لے جاتی ہو؟ گل نے حیرت سے پوچھا۔

''مریخ لے جاتی ہو؟

''مریخ!'' (۱۲۳)

درج بالا مکالمے پُرتجسس ہونے کے ساتھ ساتھ مختصر، سادہ اور رواں ہیں۔

منظر نگاری:

ناولٹ کے فنی تقاضوں میں منظر نگاری کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ راہیؔ منظر نگاری میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ اپنے ہر ناولٹ میں موضوع اور کہانی کے مطابق نہ صرف فطری مناظر کے بیان میں انہیں مہارت و ملکہ حاصل ہے بلکہ روزمرہ حالات وواقعات کے مناظر کا نقشہ بھی اس قدر خوب صورتی سے کھینچتے ہیں جو حقیقی معلوم ہوتا ہے۔

ناولٹ ''تتلیوں کا میلہ'' اور ''باغی چیونٹیاں'' میں ان کا یہ فن عروج پر نظر آتا ہے کیونکہ یہ دونوں ناولٹ باقی ناولٹوں کی نسبت قدرے تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہاں راہیؔ کو اپنی رنگینیٔ خیال اور جادو بیانی کا خوب موقع ملا ہے۔ ناولٹ میں جب زمینی مہمانوں کو مریخی مخلوق خوش آمدید کہتی ہے تو اس حسین منظر کو راہیؔ اپنے دلکش انداز بیان سے یوں حسین تر بناتے ہیں:

> ''ملکہ مسکان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ایک ایک کر کے روشنیوں کی ننھی منی لکیریں جگنوؤں کے ایک عظیم لاؤ لشکر کی شکل میں زہاب زہرا کے گرداگرد کسی حسین دائرے کی طرح جمع ہونا شروع ہو گئیں۔ ہر لکیر دائرے میں شامل ہوتے ہی کسی خوبرو ننھی پری یا پریزاد میں بدل جاتی اور مسکراتی ہوئی معصوم زہاب کے روبرو چہرہ کر کے کورنش بجالاتی۔
>
> جوں جوں ننھی منی پریوں اور پریزادوں کی تعداد بڑھتی گئی، دائرہ پھیلتا چلا گیا اور یہ سب ہلکی موسیقی کی تھاپ پر اتنی نرم روی سے گول گول گھومنے لگیں جیسے کوئی گولائی میں رقص کر رہا ہو، حالانکہ وہ ناچ رہی تھیں۔ بلکہ بہت چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھا کر تیزی روی سے چل رہی تھیں۔ پانچ سات لمحوں کے بعد یہ دائرہ اتنا پھیل گیا کہ ہر طرف ستاروں کی کہکشاں سی نظر آنے لگی۔ پھر ہلکی ہلکی موسیقی سنائی دینے لگی اور سب ننھی پریوں اور پریزادوں نے مل کر بڑی ہم آہنگی سے میٹھی سروں میں ایک گیت سنایا۔'' (۱۲۴)

یہاں راہیؔ نے روشنی کی ننھی ننھی لکیروں کا پریوں میں تبدیل ہونے، ان کا رقص کرنے اور ان سے جنم لینے والے ستاروں کی کہکشاؤں کے منظر کو کتنی خوب صورتی سے قلم بند کیا ہے۔

اسلوب اور زبان و بیان:

چونکہ زیرِ نظر ناولٹ ''سرخ سیارہ'' سائنسی موضوع پر لکھا گیا ہے اس لئے راہیؔ نے اپنے انداز بیان اور اسلوب کو

بھی اُسی کے مطابق ڈھالا ہے۔

نمونے کے طور پر ناولٹ سے ایک پیراگراف ملاحظہ ہو۔ جس میں انمول مریخ کے سائنسی لیبارٹری کے ڈائریکٹر کو اپنے سائنس دانوں اور مریخ کے بارے میں کی گئی تحقیقات کے متعلق بتاتی ہے:

''ہمارے سائنس دانوں نے نظام شمسی کے حوالے سے سب سے زیادہ تحقیق مریخ ہی کے بارے میں کی ہے۔ سولہویں اور ستارھویں صدی سے گیلیلو گیلیلی اور روسی و یونانی تہذیب سے مریخ زمینی داستانوں کا ایک حصہ رہی ہے اور اس کی سُرخ رنگت کی وجہ سے اس کو جنگ اور تباہی کے خدا مارس کا درجہ دیا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے انگریزی مہینے میں مارچ کا نام رکھا گیا۔ موجودہ صدی میں تو مریخ پر پہنچنے اور یہاں انسانی آبادی قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے۔'' (۱۲۵)

جہاں تک ناولٹ میں مستعمل زبان کا تعلق ہے تو وہ مجموعی طور پر زود فہم ہونے کے ساتھ دورِ جدید کی بہترین عکاس و ترجمان ہے۔ مصنف نے اس ناولٹ میں خاص طور پر انگریزی زبان کے الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ یہ الفاظ ایک طرف تو بچوں کے ذخیرہ الفاظ میں اضافے کا سبب ہیں اور دوسری طرف ناولٹ کے موضوع اور جدید دور کے جدید تقاضوں کی بھی تکمیل کرتے ہیں۔ راہیؔ کے طرزِ تحریر کے متعلق ناشر فضل ربی راہیؔ لکھتے ہیں:

''سُرخ سیارہ'' کے تخلیق کار شجاعت علی راہیؔ صاحب کا اندازِ تحریر نہایت رواں دواں ہے۔ زبان و بیان بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق ہے، تاہم کہیں کہیں بچوں کو نئے اور قدرے مشکل الفاظ کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن اس سے بچوں کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوگا اور وہ زبان کے حوالے سے بھی کچھ نیا ہی سیکھ سکیں گے۔'' (۱۲۶)

نمونے کے طور پر کچھ الفاظ ملاحظہ ہوں:

مارننگ واک، فلور، پروجیکٹ، مارننگ اسمبلی، ڈبل پروموشن، مووی، سیکورٹی، ہائی الرٹ، لاوٗنج، بریکنگ نیوز، ٹیکنیک، فلائنگ کس، کامپلیکس اور مانیٹر وغیرہ۔

تاہم چند ایک ہندی الفاظ بھی ناولٹ میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً شانتی، سمے کے الفاظ وغیرہ۔ ہندی زبان کے الفاظ راہیؔ نے دیگر ناولٹوں میں بھی استعمال کیے ہیں اور خاص طور پر ناولٹ ''تتلیوں کا میلہ'' میں دیکھنے کو ملتے ہیں، کیونکہ اس ناولٹ کا اسلوب رومانی ہے اور اس کے فطری مناظر میں ایک دلکشی و رعنائی پائی جاتی ہے۔

الغرض ناولٹ ''سُرخ سیارہ'' ہر لحاظ سے ایک مفید اور معلومات سے بھرپور ناولٹ ہے اور اس میں زبان کا استعمال زماں و مکاں اور وحدت تاثر کا پورا خیال رکھتے ہوئے برتا گیا ہے جس کی وجہ سے قاری بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ راہیؔ کے کچھ غیر مطبوعہ ناولٹوں کا ذکر کیا جارہا ہے جو ابھی چھپ کر منظرِ عام پر نہیں آئے لیکن زیرِ طباعت ہیں۔ مثلاً ان کا ناولٹ ''بچے (ڈور یمان، جاپان اور پاکستان)'' ایک تخیلاتی سفرنامہ ہے جو ناولٹ کے انداز

میں تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں پاکستان اور جاپان کی ثقافت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دنیا کے چند غیر معمولی طور پر ذہین بچوں کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ ''حیرت انگیز'' جو بذات خود ایک مکمل ناولٹ ہے لیکن اگر اسے سُرخ سیارہ کے بعد پڑھیں تو یہ اس کا حصہ دوم معلوم ہوتا ہے۔ ''قہقہہ'' نفسیاتی موضوع پر لکھا ہوا ایک دلچسپ ناولٹ ہے۔ اسی طرح ''عظیم لوگوں کے عظیم خواب'' گوتم بدھ سے عبدالستار ایدھی تک مختلف تاریخی شخصیات سے متعلق ایک ناولٹ ہے جس میں ان کی زندگی سے متعلق ان لمحات کو تحریری و تخلیقی طور پر گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے جو ان کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح ناولٹ ''ماں'' میں مصنف نے ایک ایسی ماں کی کہانی بیان کی ہے جو اپنے اکلوتے بیٹے سے بچھڑ کر طرح طرح کے کرب سہتی ہے اور جی بہلانے کے لئے انسانوں اور جانوروں کو وہ پیار دینے کی بھرپور کوشش کرتی ہے، جو وہ اپنے گمشدہ بیٹے کو دینا چاہتی تھی۔ اس کے بیٹے پر ماں سے جدائی کے بعد جو مشکلات و تکالیف گزرتی ہے، وہ بھی انتہائی کربناک ہے۔ اغوا ہونے کے بعد اسے وزیرستان سے افغانستان پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد حالات، ڈرامائی طور پر جو صورت اختیار کرتے ہیں وہ ابتداء سے اختتام تک قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رفیع الدین ہاشمی: اصناف ادب: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۶

۲۔ Merriam webster's Encyclopedia of Literature: Merriam-Webster, Incorporated Publishers spring field, Massachusetts; USA,1995 ,Page No 820

۳۔ سید: وضاحت حسین رضوی: ڈاکٹر: اردو ناولٹ کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ: ناشر: ڈاکٹر سید وضاحت حسین رضوی، نکیت رائے کالونی، لکھنؤ، ۲۰۰۱ء، ص ۲۱

۴۔ سلیم اختر: ڈاکٹر: افسانہ: حقیقت سے علامت تک: مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۱۳۰

۵۔ سید وضاحت حسین رضوی: اردو ناولٹ کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ: ص ۲۷۳

۶۔ سلیم اختر: ڈاکٹر: افسانہ: حقیقت سے علامت تک: ص ۱۳۱

۷۔ عبادت بریلوی: ڈاکٹر: ناولٹ کی تکنیک: ماہنامہ: ''نقوش''، کراچی، شمارہ نمبر ۱۹۔۲۰، اپریل ۱۹۵۲ ص ۲۰۷

۸۔ محمد: علامہ اقبال: بانگ درا: شیخ غلام علی اینڈ سنز پرائیوٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۷۴

۹۔ شجاعت علی راہی: باغی چیونٹیاں: کے اینڈ ایچ پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱۲

۱۰۔ ایضاً ص ۲

۱۱۔ ایضاً ص ۳۴

۱۲۔ ایضاً ص ۲۴۔۲۵

۱۳۔ ایضاً ص ۲۷

۱۴۔ ایضاً ص ۳۵

۱۵۔ ایضاً ص ۳۷

۱۶۔ ایضاً ص ۲۸

۱۷۔ ایضاً ص ۱۶

۱۸۔ ایضاً ص ۹۷

۱۹۔ ایضاً ص ۲۷

۲۰۔ ایضاً ص ۶۱

۲۱۔ شجاعت علی راہیؔ سے راقمہ کا انٹرویو: بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد، بتاریخ ۲۲ مارچ، ۲۰۱۹

۲۲۔ شجاعت علی راہیؔ سے راقمہ کا انٹرویو: بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد، بتاریخ، ۲۳ مارچ، ۲۰۱۹ء

۲۳۔ شجاعت علی راہیؔ سے راقمہ کا انٹرویو: بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد، بتاریخ، ۲۳ مارچ، ۲۰۱۹ء

۲۴۔ شجاعت علی راہیؔ: تتلیوں کا میلہ: کے اینڈ ایچ پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲

۲۵۔ ایضاً ص ۱۲

۲۶۔ ایضاً ص ۳۹

۲۷۔ ایضاً ص ۹۵

۲۸۔ ایضاً ص ۹۴

۲۹۔ ایضاً ص ۶۸

۳۰۔ ایضاً ص ۸۲

۳۱۔ ایضاً ص ۲۹

۳۲۔ ایضاً ص ۳۰۔۳۱

۳۳۔ ایضاً ص ۷۵۔۷۶

۳۴۔ ایضاً ص ۵۰

۳۵۔ ایضاً ص ۶۱

۳۶۔ ایضاً ص ۸۷

۳۷۔ محمد اقبال: علامہ: بانگ درا: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۳۵

۳۸۔ شجاعت علی راہیؔ: تتلیوں کا میلہ: ص ۹۸۔۹۹

۳۹۔ ایضاً ص ۹۹

۴۰۔ ایضاً ص ۳۸۔۳۹

۴۱۔ ایضاً ص ۳۷

۴۲۔ ایضاً ص ۵۳۔۵۴

۴۳۔ کاظم رشید کاظم: تبصرہ: تتلیوں کا میلہ: روزنامہ ''بے باک''، کوہاٹ، ۲۹ مئی، ۲۰۱۲ء، ص ۳

۴۴۔ کاظم رشید کاظم: تبصرہ: تتلیوں کا میلہ: ص ۳

۴۵۔ شجاعت علی راہیؔ: ڈائناسور کیوں غائب ہو گئے: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۷ء، ص ۸۔۷

۴۶۔ ایضاً ص ۲۰

۴۷۔ ایضاً ص ۲۷

۴۸۔ ایضاً ص ۲۸

۴۹۔ ایضاً ص ۳۰

۵۰۔ ایضاً ص ۳۰

۵۱۔ ایضاً ص ۳۳

۵۲۔ ایضاً ص ۳۸

۵۳۔ ایضاً ص ۴۱

۵۴۔ ایضاً ص ۴۸

۵۵۔ ایضاً ص ۶

۵۶۔ ایضاً ص ۷

۵۷۔ ایضاً ص ۲۸

۵۸۔ ایضاً ص ۱۷

۵۹۔ ایضاً ص ۴۴

۶۰۔ شجاعت علی راہیؔ: بلی کی آپ بیتی: شعیب سنز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۷ء، ص ۱۳۔ ۱۴

۶۱۔ شجاعت علی راہیؔ: بلی کی آپ بیتی: ص ۱۰

۶۲۔ ایضاً ص ۱۵

۶۳۔ شجاعت علی راہیؔ سے راقمہ کا انٹرویو: بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد، بتاریخ ۱۵ اپریل، ۲۰۱۹ء

۶۴۔ شجاعت علی راہیؔ: بلی کی آپ بیتی: ص ۱۲۔ ۱۳

۶۵۔ ایضاً ص ۲۰

۶۶۔ ایضاً ص ۲۱

۶۷۔ ایضاً ص ۲۳

۶۸۔ ایضاً ص ۵۸

۶۹۔ ایضاً ص ۳۳

۷۰۔ ایضاً ص ۵۲

۷۱۔ ایضاً ص ۵۷

۷۲۔ ایضاً ص ۱۴

۷۳۔ ایضاً ص ۱۷

۷۴۔ ایضاً ص ۴۷

۷۵۔ ایضاً ص ۵۰۔۵۱

۷۶۔ ایضاً ص ۶۰۔۶۱

۷۷۔ منور رؤف: پروفیسر: پرندوں کا شاعر: مشمولہ مجلہ ''نایاب''، شجاعت علی راہیؔ نمبر، نازکو آرٹ پرنٹرز، جنوری ۱۹۸۷ء، ص ۸۶۔۸۷

۷۸۔ شجاعت علی راہیؔ: پھول کھلے یا نہ کھلے: ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۶۰

۷۹۔ شجاعت علی راہیؔ: کبوتر: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۷ء، ص ۱۰

۸۰۔ شجاعت علی راہیؔ: کبوتر: ص ۷۔۸

۸۱۔ جگر مراد آبادی: کلیات جگر: عبداللہ اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۳۸۷

۸۲۔ شجاعت علی راہیؔ: کبوتر: ص ۱۹

۸۳۔ ایضاً ص ۲۰۔۲۱

۸۴۔ ایضاً ص ۳۱

۸۵۔ ایضاً ص ۳۹

۸۶۔ ایضاً ص ۳۳

۸۷۔ ایضاً ص ۶۰

۸۸۔ ایضاً ص ۶۱

۸۹۔ ایضاً ص ۱۴

۹۰۔ ایضاً ص ۳۰۔۳۱

۹۱۔ ایضاً ص ۲۱

۹۲۔ ایضاً ص ۵۵

۹۳۔ دیباچہ از میجر جنرل عاشور خان: مشمولہ: بولتے برگد: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۸ء، ص ۹۔۱۰

۹۴۔ پیش لفظ از فضل ربی راہیؔ: مشمولہ بولتے برگد: ص ۱۳

۹۵۔ شجاعت علی راہیؔ: بولتے برگد: ص ۱۵

۹۶۔ شجاعت علی راہیؔ: پھول کھلے یا نہ کھلے: ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۵۵

۹۷۔ شجاعت علی راہیؔ سے راقمہ کا انٹرویو: بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد، بتاریخ ۱۷ جولائی، ۲۰۱۹ء

۹۸۔ شجاعت علی راہیؔ: بولتے برگد: ص ۱۸

۹۹۔ محمد اقبال: علامہ: بانگِ درا: مکتبۂ جمال، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۳۱۴

۱۰۰۔ شجاعت علی راہیؔ: بولتے برگد: ص ۱۹

۱۰۱۔ ایضاً ص ۳۶

۱۰۲۔ ایضاً ص ۴۹

۱۰۳۔ ایضاً ص ۴۹۔۵۰

۱۰۴۔ ایضاً ص ۲۷

۱۰۵۔ ایضاً ص ۵۴

۱۰۶۔ ایضاً ص ۲۹

۱۰۷۔ ایضاً ص ۵۰

۱۰۸۔ ایضاً ص ۱۲

۱۰۹۔ ایضاً ص ۱۷

۱۱۰۔ ایضاً ص ۲۶۔۲۷

۱۱۱۔ ایضاً ص ۱۷

۱۱۲۔ دیباچہ از میجر جنرل عاشور خان: مشمولہ: بولتے برگد: ص ۱۰

۱۱۳۔ اشرف کمال: پروفیسر: ڈاکٹر: اصطلاحات: بک ٹائم کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۲۶۲

۱۱۴۔ پیش لفظ از فضل ربی راہیؔ: مشمولہ: سرخ سیارہ: شعیب سنز اینڈ پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۹ء، ص ۸

۱۱۵۔ شجاعت علی راہیؔ: سے راقمہ کا انٹرویو، بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد، بتاریخ ۲۰ جولائی، ۲۰۱۹ء

۱۱۶۔ شجاعت علی راہیؔ: سرخ سیارہ: ص ۱۵

۱۱۷۔ ایضاً ص ۳۴

۱۱۸۔ ایضاً ص ۴۲۔۴۳

۱۱۹۔ ایضاً ص ۴۳

۱۲۰۔ ایضاً ص ۴۳

۱۲۱۔ شجاعت علی راہیؔ: سے راقمہ کی نجی ملاقات: بمقام بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد، بتاریخ ۲۶ جون، ۲۰۱۹ء

۱۲۲۔ شجاعت علی: راہیؔ: سرخ سیارہ: ص ۱۱

۱۲۳۔ ایضاً ص ۲۸

۱۲۴۔ ایضاً ص ۳۶

۱۲۵۔ ایضاً ص ۴۲

۱۲۶۔ ایضاً ص ۹

باب پنجم

شجاعت علی راہیؔ کی بچوں کے لئے مختصر کہانیاں اور ڈرامے: تحقیقی وتنقیدی جائزہ

شجاعت علی راہیؔ کی بچوں کے لئے مختصر کہانیاں: تنقیدی و تحقیقی جائزہ

۱۔ ہم نے زردہ کھایا:

شجاعت علی راہیؔ نے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے بھی مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کر کے اپنی بہترین تخلیقات پیش کی ہیں۔ شاعری اور ناولٹ نگاری کے علاوہ انہوں نے بچوں کے لئے مختصر اور بامقصد کہانیاں تحریر کر کے ادبِ اطفال کے مقاصد کو حاصل کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اس بارے میں بچوں کے ادیب پروفیسر ڈاکٹر اسحاق وردگ نے راقمہ کو اپنے انٹرویو میں تبصرہ کرتے ہوئے بتایا:

> ''راہیؔ نے مختصر کہانیوں کے ذریعے بھی اطفال کے مقاصد حاصل کیے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں اختصار کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے تفریح اور تربیت کا سامان بہم موجود ہے۔ وہ خیبر پختونخوا کے جدید ادب اطفال کے ان معتبر بنیاد گزاروں میں شامل ہیں جنھوں نے جدید زمانے کی معاشرت اور بدلتے رویوں کو آسان فہم اسلوب میں بچوں کے ادب کا حصہ بنایا۔''(۱)

بچوں کے لئے مختصر کہانیوں پر مبنی ان کا پہلا مجموعہ ''ہم نے زردہ کھایا'' جون ۲۰۱۲ء میں K&H پبلی کیشنز اسلام آباد کی وساطت سے شائع ہوا۔ دیدہ زیب سرورق اور ۷۷ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۲۷ کہانیاں شامل ہیں۔

راہیؔ نے اس کتاب میں شامل تمام کہانیاں بچوں کی نفسیات، ان کے رجحانات اور میلانات کو مدنظر رکھ کر تخلیق کی ہیں۔ ان کہانیوں میں انسانوں کے علاوہ جانوروں اور پرندوں کے کردار بھی شامل کئے گئے ہیں، کیونکہ بچے عموماً ان میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ راہیؔ کی یہ سبق آموز مختصر کہانیاں، کہانی (قصہ) کے تمام لوازمات اور فنی عناصر پر پورا اُترتی ہیں، انہیں پڑھ کر بچے اخلاقی برائیوں جیسے جھوٹ، حسد، بُری صحبت اور شرارت سے خود بخود توبہ کرتے ہیں اور اُن میں نیکی، اچھائی، خوش اخلاقی اور دوسروں کی مدد کرنے کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔

اس مجموعے میں راہیؔ نے جن موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ لڑائی جھگڑوں سے اجتناب پر مبنی کہانیاں

۲۔ حسد

۳۔ جھوٹ بولنے پر سزا دینا

۴۔ شرارتوں سے توبہ کرنا

۵۔ کسی کے غلط مشوروں پر عمل نہ کرنا اور خلاف فطرت کاموں سے دور رہنا

۶۔ برائی کو جڑ سے اُکھاڑ کر ختم کرنے کا درس دینا۔

۷۔ بری صحبت سے بچنا

۸۔ دوسروں کی مدد کرنا

۹۔ اچھائی اور نیک سلوک سے کسی کا دل پھیرنا

یہ کہانیاں اگر بچوں کے لئے جماعت پنجم اور ششم کی سطح پر نصابی کتب میں شامل کی جائیں تو اُن کی شخصیت کی تعمیر میں مثبت کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ذیل میں ان موضوعات پر مبنی کہانیوں کا مختصراً جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ لڑائی جھگڑوں سے اجتناب پر مبنی کہانیاں:

اس موضوع پر شجاعت علی راہیؔ نے زیرِ نظر کتاب میں کئی ایک چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہلکے پھلکے انداز میں تحریر کی ہیں جو پُر مزاح ہونے کے ساتھ ساتھ نصیحت آموز بھی ہیں۔ مثلاً ''دو چیونٹیاں''، ''دو بچے''، ''دو چڑیا''، ''دو طوطے''، ''دو ڈھانچے''، ''دو گھوڑے''، ''دو جوئیں''، ''دو لڑکے''، ''دو سانپ''، ''دو عورتیں''، ''دو مینڈک''، ''دو جگنو'' اور ''دو شیر'' وغیرہ۔

کہانی ''دو چیونٹیاں'' ایک پیلی، بھوری مصری چیونٹی اور ایک ہاتھی کے کرداروں پر مشتمل ہے۔ اس میں دو چیونٹیاں آپس میں لڑتی ہیں، ایک کہتی ہے کہ میں زیادہ طاقتور ہوں اور دوسری کہتی ہے کہ میں زیادہ طاقتور ہوں۔ اتنے میں ایک ہاتھی وہاں سے گزرتا ہے اور اُن دونوں کے درمیان فیصلہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''میں باری باری تم دونوں پر اپنا پاؤں رکھتا ہوں جو زیادہ طاقتور ہوگا وہ زندہ بچ جائے گا۔'' (۲)

یہ کہانی راہیؔ نے چھوٹے بچوں کی نفسیات کو پرکھ کر تحریر کی ہیں کیونکہ عموماً چھوٹے بچے بھی آپس میں خود کو طاقتور ثابت کرنے کے لئے لڑتے ہیں۔

اسی طرح کہانی ''دو بچے'' میں دو سگے بھائی آپس میں لڑتے ہیں ایک بھائی کہتا ہے، ''کہ میرا ابو اچھا ہے'' جبکہ دوسرا کہتا ہے'' کہ تمہارا ابو گندہ ہے میرا ابو اچھا ہے''۔ اتنے میں ان کا ابو آ کر ان کو بتاتا ہے:

''ارے بھئی احمقو! اس میں لڑنے کی کیا بات ہے؟ بھلا ایک کا ابو دوسرے سے بہتر کیسے ہو سکتا ہے، میں تم دونوں کا ایک ہی تو ابو ہوں اور تم دونوں آپس میں سگے بھائی ہو۔'' (۳)

اس کہانی میں تجسس کے ساتھ مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔

کہانی ''دو چڑیاں'' میں چڑیوں کے علاوہ ایک کوے کا کردار بھی ہے۔ دونوں چڑیاں ایک دانے پر لڑتی ہیں کہ اتنے میں ایک کوا آ کر اُن سے لڑنے کی وجہ دریافت کرتا ہے، وجہ معلوم ہونے پر وہ کہتا ہے:

''وہ دانہ جو تم دونوں کے قریب پڑا ہوا تھا، وہ تو میں کب کا کھا چکا ہوں'' (۴)

کہانی ''دو طوطے'' میں طوطے ایک دوسرے سے اپنی چونچ کی خوب صورتی پر لڑتے ہیں۔ لیکن جب جھیل کے صاف شفاف پانی میں اپنی چونچیں دیکھتے ہیں تو شرمندہ ہو جاتے ہیں کہ اُن کی تو سرے سے چونچیں ہی غائب ہیں۔

ان دو مذکورہ کہانیوں کے برعکس کہانی ''دو ڈھانچے'' میں ایک اصلاحی پہلو نظر آتا ہے۔ قبرستان کے قریب ایک بچہ دو ڈھانچوں کو لڑتے ہوئے دیکھتا ہے تو اپنے باپ کو اُن کے لڑنے کی اطلاع دیتا ہے۔ باپ حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے

کہتا ہے کہ بے وقوف! ڈھانچے بھی کبھی لڑتے ہیں؟ اُن کی بات سُن کر ڈھانچے بول اُٹھے:

''او ہو غلطی ہو گئی۔ آئندہ نہیں لڑیں گے۔''(۵)

یعنی ان کے ایسا کہنے سے ڈھانچے خود بخود لڑنے سے منع ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ جان لیتے ہیں کہ لڑنا اچھی بات نہیں ہے۔

''دو گھوڑوں'' کے عنوان پر مبنی کہانی میں گھوڑوں کے ساتھ ایک دوکاندار کا کردار بھی شامل ہے۔ اس میں دونوں گھوڑے اپنی خوب صورتی پر نازاں ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو دیکھنے کے لئے دوکاندار سے ایک آئینہ طلب کرتے ہیں۔ آئینہ دیکھنے پر اُنہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھوڑے نہیں بلکہ گدھے ہیں۔ یوں اس کہانی میں تجسس کے ساتھ مزاح کی ملی جلی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔

اسی طرح کہانی ''دو جوئیں'' میں جوئیں آپس میں کسی چیز کے کھانے پر لڑتی ہیں۔ اُنہیں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اکڑ اکڑ چلنے والی چیز کیا ہے۔ چنانچہ جب وہ اُنہیں کھا لیتی ہیں تو دونوں مر جاتی ہیں۔ کیونکہ اکڑ اکڑ چلنے والی چیز کچھ اور نہیں بلکہ ایک زہریلا بچھو ہوتا ہے۔

کہانی ''دو لڑکے'' میں دو بے وقوف لڑکے ایک ایسے گھوڑے پر سواری کرنے کے لئے لڑتے ہیں، جو شیشہ کا بنا ہوا ہوتا ہے سواری کرنے پر گھوڑا ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

''دو سانپ'' کے عنوان پر لکھی گئی کہانی میں راہیؔ سبق دیتے ہیں۔ کہ ایک دوسرے کی جان لینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اس کہانی میں دو سانپ کسی بات پر لڑ کر ایک دوسرے کو ہی کھا جاتے ہیں۔

کہانی ''دو عورتیں'' ایک مزاحیہ کہانی ہے جس میں دو عورتیں ایک ننھے منّے پر لڑتی ہیں، جو حقیقت میں ایک بونا ہوتا ہے۔ اتفاق سے وہاں موجود ایک بوڑھا آدمی اُن کے درمیان فیصلہ کراتا ہے اور چھوٹے مُنّے کو جگا کر اس سے پوچھتا ہے:

''اِن دونوں عورتوں میں سے تم کس کے مُنّے ہیں؟'' ایک کا بھی نہیں، اُس نے جواب دیا'' میں تو سات بچوں کا باپ ہوں''۔(۶)

اسی طرح کہانی ''دو مینڈک''، ''دو جگنو''، اور ''دو شیر'' میں بچوں کے لئے یہ نصیحت اور سبق موجود ہے کہ وہ لڑائی جھگڑوں سے اجتناب کریں اور آپس میں پیار و محبت سے آپس میں مل جل کر رہیں۔

کہانی ''پھول اور تتلیاں'' میں راہیؔ نے بہترین فطری منظر نگاری کر کے بچوں کی نفسیات کا باکمال تجزیہ پیش کیا ہے کہ چھوٹے بچے پھول اور تتلیوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، اُنہیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور اُن کی غیر موجودگی میں اُداس ہوتے ہیں۔

۲۔ حسد:

اس موضوع پر کتاب میں ''حاسد کوا'' کے عنوان سے لکھی گئی کہانی میں راہیؔ حسد جیسی اخلاقی برائی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ کہانی ایک شہزادے، شہزادی، بادشاہ اور ملکہ کے کرداروں پر مشتمل ہے۔ کہانی کچھ یوں ہوتی ہے:

کسی جنگل میں ایک طوطا اور کوا رہتے ہیں۔طوطا خوب صورت جبکہ کوا بد صورت ہونے کے ساتھ ساتھ بد اخلاق اور بد نیت بھی ہوتا ہے۔ ایک دن کوا، طوطے سے بے جا لڑ کر اُس کی ٹانگ توڑ کر اُسے زخمی کر دیتا ہے۔ کچھ دن بعد کسی شہزادے کا وہاں سے گزر ہوتا ہے۔ وہ طوطے کو خوب صورتی کی وجہ سے پسند کر کے اُسے اپنے ساتھ محل لے جانا چاہتا ہے تو کوا بھی ساتھ میں چلنے کو تیار ہو جاتا ہے۔طوطے کی سفارش پر شہزادہ اُسے بھی محل میں لے جاتا ہے' جہاں سب طوطے کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور کوے کو کوئی بھی لفٹ نہیں کراتا ،جس کی وجہ سے کوے کے دل میں طوطے سے حسد پیدا ہو جاتا ہے۔اس کے ذہن میں سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے گانا گانے کی ترکیب آتی ہے، چنانچہ وہ اپنی بدنما آواز میں کائیں کائیں کر کے سب محل والوں کو پریشان کرنا شروع کر دیتا ہے۔ آخر کار بادشاہ سلامت کوے کو ذبح کرنے کا حکم صادر کرتا ہے، کوا ایک دفعہ پھر طوطے سے جان بخشی کی سفارشیں کرواتا ہے۔طوطے کی سفارش پر آخر کار بادشاہ سلامت اُس کی جان تو بخش دیتا ہے لیکن اُس کے ساتھ ہی اُسے واپس جنگل بھیج دیتا ہے اور یوں کوا اپنی حسد کی وجہ سے محل سے بے دخل ہو کر ذلیل وخوار ہوتا ہے۔

۳۔ جھوٹ بولنے پر سزا دینا:

کہانیوں کے اس مجموعے میں راہیؔ نے ''ہم نے زردہ کھایا'' کے عنوان سے بھی ایک کہانی قلم بند کی ہے جس میں بچوں کو یہ نصیحت کی گئی ہے کہ وہ کبھی بھی جھوٹ نہ بولیں۔اس کہانی میں مرکزی کردار ششو کا ہے جس کے ذریعے سے کہانی ہم تک پہنچتی ہے، ایک دن ششو کو شب برأت کے موقع پر اُس کی خالہ جان گھر کے لئے زردے کی پلیٹ دیتی ہے جسے ششو میاں راستے میں ہی کھا لیتے ہیں، کیونکہ زردے کی ظالم خوشبو اُسے بار بار دستر خوان کھولنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ زردہ کھانے کا آغاز پہلے ایک نوالے سے کرتا ہے اور پھر پوری پلیٹ کھا لیتا ہے۔ راہیؔ اس صورتحال کی منظر کشی بہت خوب صورت الفاظ کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''ایک نوالا چکھا تو شیرینی زبان سے حلق تک اُتر گئی۔لذت کی کیفیت سے مجبور ہو کر ہم نے دو چار نوالے اور لے لئے ،اب ہاتھ کو روکنا مشکل ہو گیا تھا اور ہم دین و دنیا سے بے نیاز یہ بڑے بڑے نوالے لے کر زردہ کھائے جا رہے تھے۔اب جو دیکھتے ہیں تو پلیٹ خالی رہ گئی تھی۔ہم نے دل میں کہا ''ششو میاں ، اگر یہ نصف پلیٹ لے کر گھر گئے تو دھر لئے جائیں گے آپ۔ پوری پلیٹ ہی ہڑپ کر جانے میں آپ کی عافیت ہے۔'' (۷)

ششو ، جب زردہ کھا کر پلیٹ خالی کر دیتا ہے،تو آدھے راستے سے ہی واپس پلٹ کر خالہ جان کے گھر جاتا ہے ۔ ایک دن جب خالہ جان کسی کام کے سلسلے میں اُن کے گھر جاتی ہے تو باتوں باتوں میں زردے کی بات چھڑ جاتی ہے اور ششو میاں کے جھوٹ کا پول کھل جاتا ہے، جس پر اُس کی امی ، اس کی خوب پٹائی کرتی ہے اور یوں ششو آئندہ کے لئے جھوٹ بولنے سے توبہ کرتا ہے۔

اس طرح کہانی ''پپو کا لالی پاپ'' میں پپو کے ابوؑ سے ایک لالی پاپ دلاتے ہیں، جسے وہ آدھا کھا کر، گیلا جیب میں رکھتا ہے۔ نتیجتاً لالی پاپ اس کے جیب کے ساتھ چپک جاتا ہے، جس کو الگ کرنے کے لئے پپو قینچی سے اپنی قمیص کی جیب کاٹتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ رات کو ابو کے ساتھ بستر پر سوتا ہے تو لالی پاپ کو بھی اپنے ساتھ سُلاتا ہے جس کی وجہ سے بہت ساری چیونٹیاں ابو کے بستر پر چڑھتی ہیں۔ ابو یہ دیکھ کر غصے سے لالی پاپ کوڑے میں پھینک دیتا ہے۔ مگر صبح اُسے لالی پاپ کوڑے میں نظر نہیں آتا، تو وہ سمجھتا ہے کہ پپو نے کوڑے سے لالی پاپ اُٹھا کر کھالیا ہے، جو بہت بری حرکت ہے۔ وہ پپو سے اس بارے میں پوچھتا ہے تو پپو صاف انکار کرتا ہے۔ جس پر اس کے ابو غصے میں ہو جاتے ہیں اور اُسے سزا کے طور پر ایک کمرے میں بند کر دیتے ہیں اور ساتھ میں اس کی امی سے کہتے ہیں:

> ''جب تک میں سودا سلف لے کر واپس نہ لوٹوں اس کو باہر نہ نکالنا تاکہ اسے غلط کام کرنے اور جھوٹ بولنے کی سزا مل جائے''۔(۸)

ان دو کہانیوں سے ثابت ہوتا ہے کہ راہیؔ کے ہاں غلط کام کرنے اور جھوٹ بولنے پر سزا کا تصور موجود ہے۔

۴۔ شرارتوں سے منع کرنا:

اس موضوع کے پیشِ نظر کتاب میں ''پُراسرار مینڈک'' کے عنوان سے ایک کہانی تحریر کی گئی ہے۔ یہ کہانی ٹھگو میاں، اس کے ابو، کلاس ٹیچر اور پرنسپل کے کرداروں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک اصلاحی کہانی ہے جس کے ذریعے راہیؔ چھوٹے بچوں کو شرارتوں سے توبہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ کہانی میں ایک شریر بچہ (ٹھگو) ہر روز کلاس روم میں بچوں اور اُستانی کو تنگ کرنے کے لئے کھڑکی کی درز سے مینڈک اندر پھینکتا ہے۔ کئی روز تک یہ عمل جاری رہتا ہے یہاں تک کہ بات پرنسپل تک پہنچ جاتی ہے اور پرنسپل چوکیدار کو خاص تاکید کرتے ہوئے اس بات کا سراغ لگانے پر مامور کرتا ہے۔ چوکیدار ٹھگو میاں کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرتا ہے۔ اس کے گرفتار ہونے کے منظر کو راہیؔ تشبیہ کا استعمال کرتے ہوئے کتنی خوب صورتی سے پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ''چوکیدار بلی کی طرح بے آواز چال چلتا ہوا آگے بڑھا، اُس نے دیکھا کہ کھڑکی کی ایک درز سے ایک گول مٹول ہاتھ نمودار ہوا جس میں تین مینڈک تھے، اس سے پہلے کہ مینڈک کمرے میں پھینکے جاتے، چوکیدار نے لپک کر پھینکنے والی کی کلائی کو مضبوطی سے تھام لیا۔ چوکیدار بوڑھا ہی سہی لیکن اتنا کمزور بھی نہیں تھا کہ ایک شرارتی لڑکا اس کی گرفت سے آزاد ہو سکے۔''(۹)

اس کے بعد پرنسپل صاحب ٹھگو میاں کے والد کو سکول بلا کر اُسے راہِ راست پر لانے کے لئے ایک منصوبہ بناتے ہیں۔ جس کے تحت ٹھگو میاں کے ارد گرد اس کی ہر ایک چیز میں مینڈک رکھے جاتے ہیں جس سے خوفزدہ ہو کر ٹھگو میاں آئندہ ایسی شرارتیں کرنے سے توبہ کرتے ہیں۔

۵۔ کسی کے غلط مشوروں پر عمل نہ کرنا اور خلاف فطرت کاموں سے دور رہنا:

اس موضوع کے تحت راہیؔ نے جو کہانی رقم کی ہے، اُس میں وہ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور ساتھ میں خلاف فطرت کام کرنے سے بھی منع کرتے ہیں، ساتھ میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ مصیبت اور پریشانی میں کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔

یہ کہانی ایک چیل اور چڑیا کے کرداروں پر مبنی ہے۔ چڑیا دانہ دُنکا کھا کر گزارا کرتی ہے جبکہ چیل چھوٹے موٹے جانوروں، پرندوں اور مردار چیزوں کو کھا کر گزارا کرتی ہے۔ وہ ہر روز چڑیا کو اناج کھانے کا طعنہ دیتی ہے کہ بھلا یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے؟ گوشت کھا کر مزے کیا کرو۔ ایک دن جب چڑیا اُس کی باتوں میں آ کر گوشت کھاتی ہے تو رات کو اس کے پیٹ میں شدید درد ہوتا ہے وہ چیل کو مدد اور مشورے کے لئے بُلاتی ہے مگر چیل آنکھیں پھیر کر اُسے بُرا بھلا کہتی ہے۔ اس موقع پر راہیؔ مختصر اور برجستہ مکالمہ نگاری سے کہانی میں جان ڈالتے ہیں:

> ''چڑیا بولی: ''میرے پیٹ میں بہت سخت درد ہے۔
> ذرا چیل آنٹی کو بلاؤ کہ اس سے مشورہ کروں۔''
> چیل کو بلایا گیا وہ غصے سے بولی'' کیا شور مچار کھا ہے کیوں میری نیند خراب کر رہی ہو۔''؟
> چڑیا نے کہا: ''گوشت کھانے سے میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے کوئی علاج بتایئے۔
> چیل نے روکھے پن سے کہا'' پیٹ میں درد تمہارے ہے اور علاج مجھ سے دریافت کر رہی ہو'' کیا مجھے کوئی حکیم سمجھ رکھا ہے؟ جاؤ کسی حکیم سے مشورہ کرو اور مجھے چین سے سونے دو۔ یہ کہہ کر چیل بڑبڑاتی ہوئی واپس چلی گئی۔''(۱۰)

وہ رات چڑیا بڑی تکلیف سے گزارتی ہے۔ اس کے بعد وہ کبھی چیل کے غلط مشوروں پر عمل نہیں کرتی اور حسب معمول اپنی فطرت کے مطابق دانا دُنکا چُگ کر گزارہ کرتی ہے۔

٦۔ بُرائی کو جڑ سے ختم کرنے کا درس دینا:

اس موضوع پر کتاب میں گوریلا اور خرگوش کے نام سے ایک کہانی لکھی گئی ہے، جس میں راہیؔ یہ نصیحت کرتے ہیں کہ ہمیں مصیبت اور پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہئے اور بُرائی کو جڑ سے اکھاڑ کر ختم کرنا چاہیے۔

کہانی کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ایک گندے کیچڑ خور گوریلے کو ایک ننھا خرگوش چچا کہہ کر سلام کرتا ہے جس پر وہ ناراض ہو کر اُسے زخمی کرتا ہے۔ ننھا خرگوش گھر جا کر اپنے والدین سے اُس کی شکایت کرتا ہے، پھر خرگوش کا ابو اپنے دوست ہاتھی کو لے کر گوریلے کو دھمکانے کے لئے جاتا ہے۔ راستے میں اُن کی ملاقات ایک چیتے سے ہوتی ہے وہ انہیں بتاتا ہے کہ گندے

گوریلے کو اُس نے ابھی ابھی خرگوش کے گھر کے سامنے کسی کا انتظار کرتے ہوئے دیکھا ہے جس پر ہاتھی اور خرگوش فوراً گھر کی طرف دوڑتے ہیں اسی اثناء اُنہیں پتہ چلتا ہے کہ گندھے گوریلے نے ننھے خرگوش کو اغوا کرلیا ہے اور اُسے کھانے کے لئے ایک درخت پر چڑھ رہا ہے' تو ہاتھی اور چیتا موقع پر پہنچ کر اُسے درخت سے نیچے گرا کر ننھے خرگوش کی جان بچاتے ہیں۔ گندھا گوریلا معافی مانگتا ہے کہ وہ آئندہ ننھے خرگوش کو کبھی تنگ نہیں کرے گا، جس پر چیتا کہتا ہے:

> ''اگر خرگوش کو تنگ نہیں کرے گا، تو گلہری کو تنگ کرے گا، گلہری کو تنگ نہیں کرے گا، تو ہرن کو تنگ کرے گا، ہرن کو تنگ نہیں کرے گا تو کسی اور جانور کو تنگ کرے گا۔'' یہ کہہ کر چیتا گوریلے کی ٹانگ توڑ ڈالتا ہے اور ہاتھی اس کی گردن میں اپنی سونڈ پھنسا کر اُس کی گردن توڑ دیتا ہے۔''(۱۱)

اور یوں گندے گوریلے کو موت کے گھاٹ اُتار کر بُرائی کا جڑ سے خاتمہ کرتے ہیں۔

۷۔ بری صحبت سے بچنا:

کہانی ''بری صحبت'' میں راہیؔ بچوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ ہمیشہ بری صحبت سے بچنا چاہئے کیونکہ انسان ہمیشہ اپنی صحبت سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ اس کہانی کے بنیادی کرداروں میں گندی مکھی، شہد کی مکھی اور شہد کی چھتے کی ملکہ کے کردار شامل ہیں۔ کہانی میں شہد کی مکھی ایک گندی مکھی سے دوستی کرتی ہے۔ اس کی سہیلیاں اس کو ایسا کرنے سے منع کرتی ہیں لیکن وہ کسی کی بات کی پرواہ نہیں کرتی۔ ایک دن وہ گندھی مکھی کی باتوں میں آ کر اُس کے ساتھ گندگی کے ڈھیر پر چلی جاتی ہے۔ جہاں وہ بدقسمتی سے گندگی اور غلاظت میں پھنس جاتی ہے اور بڑی مشکل سے جان بچا کر وہاں سے نکلتی ہے۔ اس موقع پر گندی مکھی اُس کی کوئی مدد نہیں کرتی اور اُسے اس حالت میں اکیلا چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ گندگی کے ڈھیر سے نکلنے کے بعد جب شہد کی مکھی واپس اپنے چھتے میں جاتی ہے تو بدبو کی وجہ سے وہاں کی دوسری مکھیاں اسے چھتے سے نکال باہر کرتی ہیں۔ پھر وہ مجبوراً گندی مکھی کے ہاں پناہ لینے جاتی ہے، تو وہ بھی اُسے اپنے ساتھ رکھنے پر رضامند نہیں ہوتی۔ یوں بے گھر ہو کر وہ بہت روتی اور پچھتاتی ہے، جس کی وجہ سے آخر کار ملکہ مکھی کو اُس پر ترس آتا ہے اور اُسے دوبارہ چھتے میں آنے کی اجازت دے کر کہتی ہے:

> ''جاؤ اور اُسے واپس لے آؤ، ایک تو وہ صاف سُتھری ہوگئی ہے، دوسرے اس کو اپنے کئے کی سزا بھی مل چکی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ جان چکی ہے کہ اُس نے گندی مکھی سے دوستی کر کے غلط قدم اُٹھایا تھا۔''(۱۲)

۸۔ دوسروں کی مدد کرنا:

اس موضوع پر کتاب میں ''تتلی اور چڑیا'' کے عنوان سے ایک ایسی کہانی لکھی گئی ہے جس میں راہیؔ دوسروں کی مدد کرنے اور جان بچانے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی نصیحت کرتے ہیں کہ خوب صورت چیزیں صرف دیکھنے کے لئے ہی ہوتی ہیں، خراب کرنے یا برباد کرنے کے لئے نہیں۔

اس کہانی میں ایک پیاری سی تتلی ہوتی ہے جو کسی باغ میں پھولوں پر بیٹھتی ہے۔ اس باغ میں ایک گُجری اور جگنو، دو بہن بھائی بھی روز اُس سے ملنے آتے ہیں۔ ایک دن وہ تتلی کسی چیل کو بھاتی ہے اور وہ اُسے اپنے بیٹے کو کھلانے کے لئے پکڑ تا ہے۔ چیل کا بیٹا اُسے کھانے کی بجائے دبوچ کر اُس سے پیار کرتا ہے۔ بچوں کی دلچسپی بڑھانے کے لئے راہیؔ چیل کے بیٹے اور تتلی کے درمیان مکالے کا بہترین استعمال کرتے ہیں۔ ذرا دیکھئے:

''تتلی نے نرمی سے کہا'' چیل بھائی! تم مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہارے لئے پھولوں کا رس لاؤں گی۔'' چیل کا بیٹا بولا! نہیں، تم بھاگ جاؤ گی اور پھر کبھی نہیں آؤ گی۔'' (۱۳)

جب گُجری اور جگنو کو تتلی کے بارے میں پتہ چلتا ہے، تو وہ ایک خرگوش کی رہنمائی میں چیل کے گھونسلے تک پہنچتے ہیں اور چیل کے بیٹے سے اُسے چھڑا کر اُس کی جان بچاتے ہیں۔ جگنو اس موقع پر چیل کو گھونسا مارتے ہوئے ہوا میں مکا لہرا کر اُسے آئندہ خبردار رہنے کو کہتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ کہانی میں جگنو ایک ایسا کیڑا ہے جو چیل کے مقابلے میں جسامت میں بہت چھوٹا ہے۔ وہ بھلا کہاں چیل اور اس کے بیٹے کو ڈرا دھمکا کر گھونسا اور مکا مار سکتا ہے۔ اس لئے مصنف کو کرداروں کا چناؤ ایسا کرنا چاہئے، جسے انسانی عقل تسلیم کر سکے۔

۹۔ اچھائی اور نیکی سے کسی کا دل پھیرنا:

اس موضوع پر راہیؔ نے دو کہانیاں لکھی ہیں ایک ''پیلی خالہ'' اور دوسری ''نک چڑھی مرغی''۔ ان دونوں کہانیوں میں راہیؔ بچوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ ہمیشہ مشکل حالات میں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہئے۔ اپنے ہمسایوں کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہئے اور اُن کے ساتھ مشفقانہ اور ہمدردانہ رویہ رکھنا چاہیے، کیونکہ صرف اچھائی، نیکی اور حسن سلوک سے ہی دوسرے کے دلوں پر حکمرانی کی جا سکتی ہے۔

کہانی ''پیلی خالہ'' دو چیونٹیوں پر مبنی ہے جس میں زرد یعنی پیلی چیونٹی رحم دل اور نیک جبکہ کالی چیونٹی مغرور اور بدمزاج ہوتی ہے۔ ایک دفعہ زرد چیونٹی بہت بیمار ہوتی ہے، وہ اُس سے کھانے کے لئے کچھ مانگتی ہے لیکن کالی چیونٹی اُسے خالی ہاتھ واپس بھیج کر باتیں سناتی ہے حالانکہ جب کالی چیونٹی کا بیٹا پانی میں گرتا ہے تو پیلی خالہ ہی اُس کی جان بچاتی ہے۔ جس کی وجہ سے کالی چیونٹی اپنے کئے پر پشیمان ہوتی ہے اور پیلی خالہ کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

اسی طرح کہانی ''نک چڑھی مرغی'' دو مرغیوں کے کرداروں پر مبنی ایک سبق آموز کہانی ہے۔ اس میں ایک مرغی خوش اخلاق اور دوسری جھگڑالو اور نک چڑھی ہوتی ہے۔ نک چڑھی مرغی ہر وقت شریف اور خوش اخلاق مرغی کو مختلف طریقوں سے تنگ کرتی ہے۔ مثلاً کبھی اُس کے حصے کا کھانا کھا جاتی ہے تو کبھی اُس کا انڈہ توڑ کر پیتی ہے جس کی وجہ سے خوش اخلاق مرغی کو اپنی مالکن سے روز مار پڑتی ہے۔ ایک دن نک چڑھی مرغی کے بچوں پر ایک بلا حملہ کرتا ہے تو خوش اخلاق مرغی اُس کے بچوں کی جان بچاتی ہے، جس پر نک چڑھی مرغی بہت خوش ہوتی ہے اور آئندہ خوش اخلاق مرغی کو تنگ کرنے

سے توبہ کرتی ہے۔ کہانی کے آخر میں راہیؔ سبق دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نک چڑھی مرغی، خوش اخلاق مرغی کے اخلاق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اس سے گھل مل کر بہنوں کی طرح رہنے لگی اور پھر اس روز کے بعد نہ تو اس نے خوش اخلاق مرغی کے انڈے توڑ کر کھائے اور نہ کبھی اس کے حصے کے ٹکڑے ہضم کئے بلکہ وہ اکثر اپنے حصے میں بھی دوسری مرغی کو شامل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔'' (۱۴)

بحیثیت مجموعی راہیؔ نے ''ہم نے زردہ کھایا'' کے مجموعے میں اختصار میں جامعیت کے ساتھ بچوں کے لئے سبق آموز کہانیاں تحریر کی ہیں، جو بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہیں۔ سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا گیا ہے اور کہانیوں میں ایسے کردار پیش کئے گئے ہیں جو بچوں کی توجہ اور دلچسپی کا محور ہیں۔ اِس مقصد کے لئے انسانوں کے علاوہ جانوروں اور پرندوں کے کرداروں سے بھی کام لیا گیا ہے۔ آسان اور عام فہم ضرب الامثال، محاورات اور تشبیہات کا استعمال کیا گیا ہے جسے بچے آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔

۲۔ چڑیوں کی چہکار:

شجاعت علی راہیؔ نے بچوں کے لئے مختصر کہانیوں پر مبنی دوسری کتاب ''چڑیوں کی چہکار'' کے نام سے لکھی ہے۔ ۱۹۲ صفحات پر مشتمل اِس کتاب میں بچوں کے لئے مختلف موضوعات پر کل سو (۱۰۰) کہانیاں تحریر کی گئی ہیں۔

''ہم نے زردہ کھایا'' کے برعکس اُس کتاب میں موضوعات کا تنوع اور وسعت زیادہ نظر آتی ہے۔ کیونکہ ''ہم نے زردہ کھایا'' کی کتاب نسبتاً پرائمری سطح کے بچوں کی نفسیات اور دلچسپیوں کو مدِ نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے جب کہ ''چڑیوں کی چہکار'' مڈل اور ہائی جماعت کے بچوں کے لئے مفید اور معلوماتی قرار دی جا سکتی ہے۔ کتاب کا پیش لفظ راہی صاحب کے بھائی بریگیڈیر طلعت امتیاز نقوی نے لکھا ہے۔ وہ اس کتاب کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بچوں کے لئے اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''ہم نے زردہ کھایا'' تھا۔ ''چڑیوں کی چہکار'' جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، اُس کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں سَو کہانیاں ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ! ایک مرتبہ پڑھنا شروع کریں تو پھر کتاب چھوڑنے کو جی ہی نہ کرے۔ بچے تو بچے، بڑے بھی یقیناً ان کہانیوں کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔ (۱۵)

چونکہ راہیؔ کا مقصد ان کہانیوں کے ذریعے بچوں میں اعلیٰ اخلاقی اقدار، نیکی، ہمدردی، دور اندیشی، فہم و فراست پیدا کرنا ہے، اس لئے مختلف موضوعات کے چناؤ سے اُنھوں نے اپنے اعلیٰ مقصد کے حصول کو ممکن بنایا ہے۔ اِن کہانیوں

کے بارے میں خود راہیؔ صاحب کا کہنا ہے:

"ان کہانیوں میں دو تین سچے قصے ہیں۔ چند کہانیوں میں حقیقت اور افسانے کی آمیزش ہے اور بیشتر تخیل کی گل کاری کا نتیجہ ہیں، اگر ان کہانیوں نے کسی ایک قاری کی زندگی بدلنے میں بھی کوئی کردار ادا کیا تو میں سمجھوں گا کہ میری دُعا قبولیت کا درجہ حاصل کر گئی۔" (۱۶)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ راہیؔ صاحب نے اس کتاب میں متنوع موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ ان موضوعات کے تحت پھر انہوں نے مختلف کہانیاں لکھی ہیں۔ ذیل میں ان موضوعات کی فہرست دی جاتی ہے:

۱۔ اخلاقی اقدار پر مبنی کہانیاں

۲۔ فہم و فراست اور حکمت عملی سے کام لینے پر لکھی گئی کہانیاں

۳۔ مختلف محاورات اور ضرب الامثال پر مبنی کہانیاں

۴۔ منظر نگاری کے حوالے سے لکھی گئی کہانیاں

۵۔ محنت اور ہمت سے کام لینے پر تحریر کی گئی کہانیاں

۶۔ ماں کی ممتا اور محبت پر رقم کی گئی کہانیاں

۷۔ کتاب اور اُستاد کی اہمیت اور برتری پر لکھی گئی کہانیاں

۸۔ سائنس فکشن سے متعلق کہانیاں

۹۔ ہمدردی اور دوسروں کے کام آنے کے موضوع پر تخلیق کی گئی کہانیاں

۱۰۔ اچھے کام اور اچھی عادتیں اپنانے کی ترغیب دینے پر لکھی گئی کہانیاں

۱۱۔ معاشرتی ناہمواریوں پر طنز کی کہانیاں

۱۲۔ شرارتوں سے منع کرنے کی نصیحت پر لکھی گئی کہانیاں

۱۳۔ نیکی کی اہمیت اور اُس کے صلے پر تحریر کردہ کہانیاں

۱۴۔ بچوں کو لکھنے لکھانے کی ترغیب دینے پر لکھی گئی کہانیاں

۱۵۔ حلال اور حرام مال کمانے کے اثرات پر لکھی گئی کہانیاں

۱۶۔ مزاحیہ کہانیاں (تفریح برائے تفریح)

۱۷۔ پرندوں کے ساتھ حُسن سلوک پر مبنی کہانیاں

۱۸۔ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے اور کسی کے تحفے کو حقیر نہ سمجھنے پر تخلیق کردہ کہانیاں

۱۹۔ متفرق موضوعات پر لکھی گئی کچھ کہانیاں

ذیل میں ان موضوعات کے تحت لکھی گئی کہانیوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا:

ا۔ اخلاقی اقدار پر مبنی کہانیاں:

زیرِ نظر کتاب ''چڑیوں کی چہکار'' میں شجاعت علی راہی نے اس موضوع پر سب سے زیادہ کہانیاں تحریر کی ہیں، جن کی تعداد ۱۸ ہے۔ ان کہانیوں میں ''انصاف''، ''انصاف کی تلاش''، ''احسان''، ''ایک سو بیس روپے''، ''شہزادے کے منہ پر تھپڑ''، ''لڈو''، ''مرغے کی اُڑان''، ''کاش میں آپ کا حقیقی بیٹا ہوتا!''، ''گدھا اور فیثا غورث''، ''شجاعت''، ''جنت''، ''چیونٹیوں کی دُعا''، ''حسد''، ''بدگمانی''، ''پرنالے''، ''جادوگرنیاں اور اندھا کنواں''، ''خزانے کی تلاش'' اور ''درخت'' شامل ہیں۔ ان کہانیوں میں بچوں کو اخلاقی اقدار وصفات سے متصف کرنے اور اُنھیں معاشرے کا مُفید اور کارآمد شہری بنانے کے سنہری اُصول بتائے گئے ہیں جن کو اپنا کر بچے از خود اخلاقی برائیوں جیسے جھوٹ، حسد، رشوت، بدنیتی، غرور اور بدگمانی سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور اُن میں ہمدردی، ایثار وانصاف، احسان، محنت، خودداری، انسانیت، بہادری و دلیری اور انسان دوستی کے جذبات اُجاگر ہوتے ہیں جو ادب اور مصنف کا مشترکہ نظریۂ حیات اور حاصل مقصود ہے۔

کہانی ''انصاف'' ایک شیر ببر، ہرن، اُس کے دو بچوں، بندر، مور، ہاتھی، اور چیتے کے کرداروں پر مبنی ایک خوب صورت کہانی ہے۔ قصہ کا آغاز جنگل میں ایک شیر ببر کے پچاس برس کے ہونے پر گولڈن جوبلی کی ایک تقریب سے ہوتا ہے۔ گولڈن جوبلی کی اس تقریب میں شیر ببر کو پوری محفل کے سامنے غائبانہ طور پر ایک تھپڑ رسید ہوتا ہے، جسے بادشاہ اپنی بے عزتی تصور کر کے سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ اُسے یاد آتا ہے کہ یہ دراصل اس ہرن کی بدعا کا نتیجہ ہے جس کے بچوں کو ایک دن اس نے بے دردی سے مارا ہوتا ہے۔ وہ سب کے سامنے اپنے جُرم کا اعتراف کر کے بادشاہت سے سبکدوش ہونے کا اعلان کرتا ہے لیکن جنگل کے سب جانور اُس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اب آپ ہمارے لئے پہلے سے زیادہ قابلِ احترام ہیں کیونکہ:

> ''اب آپ کو احساس ہو چکا ہے کہ ایک بادشاہ کے لئے سب سے ضروری چیز اس کا انصاف ہے۔''(۱۷)

دوسری کہانی کا عنوان ''انصاف کی تلاش'' ہے۔ یہ کہانی ایک ایماندار اور باکردار پولیس افسر عدنان اور اس کی ایڈووکیٹ بیوی ساجدہ (جو مظلوموں اور لاچاروں کی وکالت کر کے ظلم وستم کے خلاف جہاد کرتی ہے) پر مشتمل ہے۔ کہانی کچھ یوں ہوتی ہے کہ عدنان ایک تاریخی اور قدیم، لیکن عالی شان مکان میں قیام پذیر ہوتا ہے۔ اُس مکان میں ہر روز عجیب وغریب واقعات رونما ہوتے ہیں۔ عدنان کی تحقیقات کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مکان کے باسیوں پر (جنھیں ۱۸۵۷ء میں غداری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا) خوب ظلم وتشدد کیا گیا ہے، اس کے علاوہ اس مکان کو جیل کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے یہاں ہر روز خوفناک اور غیر معمولی واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

یہ بات جب عدنان اپنی بیوی کو بتاتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ شاید اُن مظلوم لوگوں کی روحیں آج بھی انصاف مانگنے کے لئے پھر رہی ہیں۔ ہم اگر اُن کو انصاف نہیں دلا سکتے تو کم از کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ:

''ہمارے اردگرد جو لٹیرے، دہشت گرد اور ظالم و جابر لوگ موجود ہیں۔ اُن کے پنجے سے مظلوموں کو بچا کر معاشرے میں مزید ناانصافیوں کو روک سکتے ہیں۔'' (۱۸)

اس طرح 'اس کہانی کا مرکزی خیال ساجدہ کی زبانی ادا ہوتا ہے جس میں راہیؔ صاحب یہ سبق دیتے ہیں کہ ہمیں انصاف پسندی اختیار کر کے معاشرے میں ظالم و جابر لوگوں کے خلاف ہمیشہ جہاد کرنا چاہیے۔ کہانی ''احسان'' میں راہیؔ بچوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ کبھی بھی کسی کا احسان نہیں بھلانا چاہیے۔ ہمیشہ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ کسی کی نیکی کا بدلہ نیکی سے دیں۔ یہ کہانی تین کرداروں جابر، عبدالقہار اور کہانی بیان کرنے والے کردار پر مشتمل ہے۔ کہانی میں مکالماتی انداز اپنایا گیا ہے۔ جابر نے کہانی بیان کرنے والے کردار (راوی) کی جان بچائی ہوتی ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی بات پر لڑ کر اُسے تھپڑ مارتا ہے تو وہ خاموشی اختیار کرتا ہے، جس پر عبدالقہار اُس سے پوچھتا ہے کہ وہ کیوں خاموش رہا۔ وہ جواب دیتا ہے:

''یہ تو ایک تھپڑ تھا اگر وہ مجھے سو تھپڑ بھی مار دیتا تو میں جواب نہ دیتا۔'' (۱۹)

اس مکالمے میں راہی صاحب نے کہانی کے مرکزی خیال کو بہت احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔

احسان مندی کے موضوع پر راہیؔ کی دوسری کہانی (جو ایک حقیقی، سچی اور ان کی اپنی کہانی ہے) ''ایک سو بیس روپے'' کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔ اس کہانی میں ۱۹۶۱ء میں جب شجاعت کا میٹرک کا رزلٹ آتا ہے تو کالج میں داخلے کے لئے اُس کے پاس مطلوبہ رقم نہیں ہوتی کیونکہ اُن کے معاشی حالات بہت خراب ہوتے ہیں۔ والد کا کاروبار بھی ناکام ہو گیا ہوتا ہے۔ چنانچہ شجاعت کا بھائی طلعت اُسے اپنے دوست حنیف کے پاس قرضہ لینے کے لئے لے کر جاتا ہے۔ لیٹ فیس کے ساتھ کل ایک سو بیس روپے کی رقم داخلے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ حنیف اُن کے لئے رقم کا بندوبست کرتا ہے اور اس طرح شجاعت کالج میں داخلہ لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بعد میں شجاعت زندگی میں ترقی کے کئی منازل طے کرتا ہے، بہت کماتا ہے لیکن وہ نیکی اور احسان کرنے والے اُس گھڑی ساز حنیف کو کبھی نہیں بھولتا۔

اس سلسلے میں ''شہزادے کے مُنہ پر تھپڑ'' ایک سبق آموز کہانی ہے جس میں راہیؔ غرور جیسی بُری خصلت سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کہانی کے کرداروں میں ایک بادشاہ، اس کا مغرور بیٹا، دیہاتی غریب لڑکی اور اس کے باپ کے کردار شامل ہیں۔ اس کہانی میں بادشاہ اپنے مغرور بیٹے کی شادی کسی غریب دیہاتی کی بیٹی سے کرنا چاہتا ہے، لیکن لڑکی اس شرط پر شادی کے لئے راضی ہوتی ہے کہ وہ بھرے دربار میں شہزادے کے مُنہ پر ایک تھپڑ رسید کرے گی، بادشاہ کے پوچھنے پر شہزادہ اس شرط پر شادی کے لئے راضی ہوتا ہے۔ کہانی کا کلائمکس وہ لمحہ ہوتا ہے جس میں لڑکی آہستہ آہستہ بڑھ کر ہاتھ اُٹھا کر پیار سے شہزادے کے گال پر چپت لگاتی ہے اور بولتی ہے:

''میں نے سُنا تھا کہ شہزادہ بہت مغرور ہے۔ اس لئے میں اس کا غرور توڑنا چاہتی ہے۔'' (۲۰)

اسی طرح ''قلوپطرہ اور ہیلن'' کے نام سے لکھی گئی کہانی میں دو، زنانہ تاریخی شخصیات کا حوالہ دیا گیا ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے حسین ہونے پر لڑتی ہیں، تو اس موقع پر موجود ایک اُلو' بیر بہوٹی کی عاجزی کی صفت کی تعریف کرتے ہوئے اِن کے درمیان تصفیہ کرتا ہے اور کہتا ہے:

> ''تھوڑی دیر کے لئے نظریں جھکا کر دیکھئے۔ یہ شے اس وقت آپ کے قدموں میں گھاس پر بیر بہوٹی کی شکل میں بغیر کسی غرور کے نرم روی سے حرکت کر رہی ہے۔'' (۲۱)

کہانی ''لڈو'' میں راہیؔ صاحب نے چھوٹے بچوں کی نفسیات اور اُن کی عادات کو مدِ نظر رکھ کر سچ بولنے کی تلقین کی ہے۔ اس کہانی میں دو بچے (جو آپس میں چچا زاد بھائی ہوتے ہیں) باتیں کر رہے ہوتے ہیں کہ اتنے میں اُن کے چچا آ کر اپنے بیٹے عاصم کو بغیر اجازت کے لڈو کھانے پر ڈانتے ہیں اور اس غلط حرکت پر اُس کی ایک ہفتے کی پاکٹ منی بھی بند کرتے ہیں۔ یہ صورتحال دیکھ کر عاصم کا چچا زاد بھائی خود جا کر چچا جان کو بتاتا ہے کہ لڈو عاصم نے نہیں کھائے بلکہ اُس نے کھائے ہیں، جس پر چچا جان خوش ہو کر کہتے ہیں:

> ''شاباش بیٹے! سچ بول کر تم نے میرا دل جیت لیا۔ دراصل میں نے تمہیں لڈو کھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا مگر تمہارا امتحان لینا مقصود تھا کہ تم سچ کا اعتراف کرتے ہو کہ نہیں۔'' (۲۲)

''حسد'' کی عنوان سے تحریر کی گئی اس کہانی میں راہیؔ نے حسد جیسی اخلاقی بُرائی سے بچنے کی نصیحت کی ہے۔ اس کہانی میں چار کردار ہیں چار کردار ہیں سادھو، اس کا بیٹا رنجیت، افسر شیکھر اور دفتر کا مینجر۔

اس میں ایک سادھو کے پاس کچھ جادوئی اور روحانی قوتیں ہوتی ہیں جو وہ مرنے سے پہلے اپنے بیٹے رنجیت کے سپرد کرتا ہے اور نصیحت کرتا ہے کہ اسے ہمیشہ اچھے کاموں کے لئے استعمال کرو۔ ایک دفعہ رنجیت کے دفتر میں شیکھر نامی افسر کو ترقی ملتی ہے، جس سے اُس کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور وہ ایک بچھو کا روپ دھار کر اُسے ڈستا ہے۔ جب لوگ شیکھر کی عیادت کے لئے اس کے گھر تحفے تحائف لے کر جاتے ہیں تو وہ اور بھی جل جاتا ہے اور اس دفعہ اژدہے کا روپ دھار کر شیکھر کو ڈسنے ہی والا ہوتا ہے کہ لوگ لاٹھی لے کر اُس پر ٹوٹ پڑتے ہیں، جس کی وجہ سے رنجیت اپنی جادوئی صلاحیت کھو کر اژدھے کا روپ برقرار نہیں رکھ پاتا، یہ منظر ملاحظہ کیجیے:

> ''جب لاٹھیوں کی برسات ختم ہوئی تو لوگوں نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ اژدہے کی بجائے وہاں رنجیت لہولہان حالت میں پڑا ہوا ہے''۔ (۲۳)

اسی طرح کہانی ''مرغے کی اُڑان'' بھی حسد کے عنوان پر لکھی گئی ایک دلچسپ کہانی ہے، جو دو پرندوں کے کرداروں پر مشتمل ہے جس میں بچے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کہانی میں ایک مرغا، کُونج کی طرح ہوا میں اُونچی اُڑان اڑنے کا خواہش مند ہوتا ہے، اس لئے وہ کونج سے بار بار اونچا اُڑنے کی ترکیب پوچھتا ہے۔ پس ایک دن مرغا گھر کی چھت

سے جس انداز سے چھلانگ لگا کر اُڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ راہیؔ اس منظر کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''وہ موقع دیکھ کر گھر کی دوسری منزل پر جا کر چھت کے چھجے کی طرف دوڑتا ہوا گیا اور وہاں سے اُڑنے کی کوشش کی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ گلی کے فرش پر گرا پڑا نظر آیا اس کی ٹانگیں فریکچر ہو گئیں۔'' (۲۴)

اس کے بعد اُس نے گونج سے حسد اور اپنی صلاحیت سے زیادہ کام کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

کہانی ''کاش میں آپ کا حقیقی بیٹا ہوتا!'' میں راہیؔ ہمارے معاشرے کے ایک بہت بڑے المیے پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اولاد پڑھ لکھ کر اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو کر پھر اپنے ہی والدین کے تعارف کرانے پر شرمندگی محسوس کرتے ہیں جو کہ ایک غیر اخلاقی فعل ہے۔ اس کہانی میں بھی یہی صورتحال پیش کی گئی ہے کہ ایک مالی اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر افسر بنا دیتا ہے جس کی قابلیت کو دیکھ کر اُس کا ڈائریکٹر اقتدار اُسے مزید ترقی دینے کی خوشخبری سنانے کے لئے اس کے گھر جاتا ہے۔ وہاں اُس کی ملاقات ایک مالی سے ہوتی ہے جو دراصل اس افسر کا باپ ہوتا ہے لیکن وہ اُسے اپنا ان پڑھ ملازم کہہ کر بتاتا ہے جس پر ڈائریکٹر اقتدار کو بہت افسوس ہوتا ہے اور کہتا ہے:

''جس شخص کی ذہنیت کا یہ عالم ہو کہ وہ اپنی اوقات بڑھانے کے لئے اپنے اس بوڑھے والد کو اپنا ملازم ظاہر کرے، جس کی زندگی بھر قربانیوں، دعاؤں اور محنت سے وہ ایک اعلیٰ عہدے پر پہنچا ہو وہ اس قابل نہیں ہے کہ اُسے مزید ترقی دی جائے'' (۲۵)

کہانی ''گدھا اور فیثا غورث'' دراصل ایک گدھے اور فیثا غورث کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔ اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ زبان کی وجہ سے انسان ہمیشہ مشکلات کا شکار ہوتا ہے اس لئے اسے قابو میں رکھنا چاہئے۔ ہوتا یوں ہے کہ ایک دفعہ فیثا غورث کسی محفل میں کہتے ہیں کہ حیوانوں کو چونکہ بولنے کی طاقت نہیں دی گئی ہے۔ اس بے زبانی کی وجہ سے ان پر اکثر مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ یہ بات قریب کھڑا ہوا گدھا سُن کر اللہ تعالیٰ سے بولنے کی صلاحیت مانگنے کی دعا کرتا ہے جو قبول بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن قوت گویائی حاصل کرنے کے بعد اس کا ایک دن بھی چین سے نہیں گزرتا، وہ جا کر اپنی پریشانی کا اظہار فیثا غورث کے سامنے کرتا ہے جس پر فیثا غورث کہتا ہے کہ شاید تم نے اُس محفل میں میری یہ بات نہیں سُنی:

''جس طرح حیوانوں پر بیشتر مصیبتیں ان کی بے زبانی کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں، اسی طرح انسانوں پر بہت سی مشکلات ان کی زبان کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں۔'' (۲۶)

''شجاعت کے عنوان'' سے لکھی گئی اس کہانی میں بھی راہیؔ بچوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ ہمیشہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا چاہئے، درحقیقت یہی اصل بہادری ہے۔ اس کہانی میں ایک لڑکا سودا سلف لینے کے لئے بازار جاتا ہے کہ راستے میں غلطی سے کسی دوسرے لڑکے سے ٹکرا جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے سارے چیزیں نیچے گر جاتی ہیں، اس پر وہ لڑکا اسے بہت گالیاں دیتا ہے اور اسے خوب برا بھلا بھی کہتا ہے۔ لیکن وہ خاموش رہ کر کچھ نہیں کہتا اور خاموشی سے گھر چلا جاتا ہے۔

سے جس انداز سے چھلانگ لگا کر اُڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ راہیؔ اس منظر کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''وہ موقع دیکھ کر گھر کی دوسری منزل پر جا کر چھت کے چھجے کی طرف دوڑتا ہوا گیا اور وہاں سے اُڑنے کی کوشش کی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ گلی کے فرش پر گرا پڑا نظر آیا اس کی ٹانگیں فریکچر ہو گئیں۔''(۲۴)

اس کے بعد اُس نے کُونج سے حسد اور اپنی صلاحیت سے زیادہ کام کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

کہانی ''کاش میں آپ کا حقیقی بیٹا ہوتا!'' میں راہیؔ ہمارے معاشرے کے ایک بہت بڑے المیے پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اولاد پڑھ لکھ کر اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو کر پھر اپنے ہی والدین کے تعارف کرانے پر شرمندگی محسوس کرتے ہیں جو کہ ایک غیر اخلاقی فعل ہے۔ اس کہانی میں بھی یہی صورتحال پیش کی گئی ہے کہ ایک مالی اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر افسر بنا دیتا ہے جس کی قابلیت کو دیکھ کر اُس کا ڈائریکٹر اقتدار اُسے مزید ترقی دینے کی خوشخبری سنانے کے لئے اس کے گھر جاتا ہے۔ وہاں اُس کی ملاقات ایک مالی سے ہوتی ہے جو دراصل اس افسر کا باپ ہوتا ہے لیکن وہ اُسے اپنا ان پڑھ ملازم کہہ کر بتاتا ہے ،جس پر ڈائریکٹر اقتدار کو بہت افسوس ہوتا ہے اور کہتا ہے:

''جس شخص کی ذہنیت کا یہ عالم ہو کہ وہ اپنی اوقات بڑھانے کے لئے اپنے اس بوڑھے والد کو اپنا ملازم ظاہر کرے ،جس کی زندگی بھر قربانیوں ،دعاؤں اور محنت سے وہ ایک اعلیٰ عہدے پر پہنچا ہو وہ اس قابل نہیں ہے کہ اُسے مزید ترقی دی جائے''(۲۵)

کہانی ''گدھا اور فیثا غورث'' دراصل ایک گدھے اور فیثا غورث کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔ اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ زبان کی وجہ سے انسان ہمیشہ مشکلات کا شکار ہوتا ہے اس لئے اسے قابو میں رکھنا چاہئے۔ ہوتا یوں ہے کہ ایک دفعہ فیثا غورث کسی محفل میں کہتے ہیں کہ حیوانوں کو چونکہ بولنے کی طاقت نہیں دی گئی ہے۔ اس بے زبانی کی وجہ سے ان پر اکثر مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ یہ بات قریب کھڑا ہوا گدھا سُن کر اللہ تعالیٰ سے بولنے کی صلاحیت مانگنے کی دعا کرتا ہے جو قبول بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن قوت گویائی حاصل کرنے کے بعد اس کا ایک دن بھی چین سے نہیں گزرتا ،وہ جا کر اپنی پریشانی کا اظہار فیثا غورث کے سامنے کرتا ہے جس پر فیثا غورث کہتا ہے کہ شاید تم نے اُس محفل میں میری یہ بات نہیں سُنی:

''جس طرح حیوانوں پر بیشتر مصیبتیں ان کی بے زبانی کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں ،اسی طرح انسانوں پر بہت سی مشکلات ان کی زبان کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں۔''(۲۶)

''شجاعت کے عنوان'' سے لکھی گئی اس کہانی میں بھی راہیؔ بچوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ ہمیشہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا چاہئے ،درحقیقت یہی اصل بہادری ہے۔ اس کہانی میں ایک لڑکا سودا سلف لینے کے لئے بازار جاتا ہے کہ راستے میں غلطی سے کسی دوسرے لڑکے سے ٹکرا جاتا ہے ،جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے سارے چیزیں نیچے گر جاتی ہیں ،اس پر وہ لڑکا اسے بہت گالیاں دیتا ہے اور اسے خوب برا بھلا بھی کہتا ہے۔ لیکن وہ خاموش رہ کر کچھ نہیں کہتا اور خاموشی سے گھر چلا جاتا ہے۔

راہیؔ لکھتے ہیں:

''بظاہر تو یہ بزدلی ہی لگتی ہے مگر اصل شجاعت یہ ہے کہ انسان غصے کے عالم میں اپنے جذبات کو قابو میں رکھے۔''(۲۷)

اسی طرح کہانی ''دو غضب ناک اژدہے'' میں بھی یہی نصیحت کی گئی ہے کہ ہمیشہ اندر کی آگ یعنی غصے کو قابو میں رکھنا چاہئے۔

زیرِ نظر مجموعے میں شامل کہانی ''جنت'' ایک ماں اور بیٹے شمشاد کے کرداروں پر مشتمل کہانی ہے، جس میں شمشاد ایک میوزیکل چیئر پر سو چکر پورے کرنے کے بعد نیم غنودگی کے عالم میں خوابوں کی جنت میں چلا جاتا ہے، وہ جو منظر خواب میں دیکھتا ہے، راہیؔ اُس کی منظر نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چاروں جانب ننھی منی پریاں رقص کرتی جارہی ہیں۔ فضا میں ایسے منفرد رنگ بکھرے ہوئے ہیں جو دھنک کے رنگوں سے مختلف ہیں اور جن میں کچھ ایسی رسیلی موسیقی سنائی دی رہی ہے جو دل میں ایک خوب صورت کیفیت پیدا کرتی ہیں۔''(۲۸)

شمشاد کو غنودگی کے عالم میں پا کر اس کی امی اسے پیشانی پر بوسہ دیتی ہے، جس پر شمشاد آنکھیں کھول کر خوابوں کی دنیا سے نکل کر اپنی سچ مچ کی جنت یعنی اپنی امی کے سامنے خود کو پاتا ہے۔

''چیونٹیوں کی دعا'' کے عنوان سے تحریر کی گئی کہانی کا مرکزی خیال عبدالرزاق کے کردار کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے۔ ایک دن عبدالرزاق اپنے اہل وعیال کو بیٹھا کر اپنے خوشحال و فارغ البال ہونے اور رزق میں فروانی کی وجہ پوچھتا ہے جس پر اس کے بیٹے کہتے ہیں کہ یہ سب آپ کی محنت اور ہم سب کا اللہ کا شکر ادا کرنے کی وجہ سے ہے۔ عبدالرزاق حامی بھر کر کہتا ہے کہ ایک وجہ اور بھی ہے اور پھر اُنہیں اپنا ایک خواب سناتا ہے، جس میں چیونٹیوں کا ایک وفد اس سے گلہ کرتا ہے کہ آپ ہمیں غلے کے قریب بھی جانے نہیں دیتے، حالانکہ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے۔ چنانچہ اس دن کے بعد سے عبدالرزاق ہر روز ایک مٹھی آٹا چیونٹیوں کے آگے ڈالتا ہے اور چیونٹیاں اس کے لئے رزق میں برکت کی دعا مانگتی ہیں۔ آخر میں راہیؔ ان الفاظ میں نصیحت کرتے ہیں:

''یاد رکھو، تم جو کچھ بھی کماتے ہو اور کھاتے ہو پیتے ہو، بوتے اور اُگاتے ہو، خریدتے اور بیچتے ہو، اس میں دوسروں کا بھی حصہ ہے''۔(۲۹)

کہانی ''بدگمانی'' میں راہیؔ اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ ہمیشہ بدگمانی جیسی بری خصلت سے بچنا چاہیے، کیونکہ یہ اچھے اچھے رشتوں کو خراب کر دیتی ہے۔ کہانی کے کردار سیف اور مرشد دو بہترین دوست ہوتے ہیں، جو اکھٹے سکول آتے جاتے اور اکھٹے ہوم ورک کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ان کے درمیان بہت ہی معمولی سی بات پر بدگمانی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان دوستی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے کچھ دن بعد جب مرشد کو یہ خبر ملتی ہے کہ سیف گھر میں بجلی کے جھٹکے سے

مر گیا ہے تو اپنی حرکت پر بہت پچھتاتا ہے، اُسے یاد آتا ہے:

''اس نے اس کی موت سے ایک روز پہلے بدگمانی سے کام لے کر کتنی بڑی زیادتی کی تھی''۔(۳۰)

کہانی ''پرنالے'' میں راہیؔ نے دوستی کی اہمیت بتائی ہے۔اس کہانی میں گل شیر اور دلاور خان دو بہترین دوست ہوتے ہیں، ان کے والدین ایک پرنالے کی وجہ سے آپس میں ہر وقت لڑتے رہتے ہیں، جن کا پانی ایک دوسرے کے گھروں میں جا کر گرتا ہے لیکن جب ان کے بچوں کو امتحان میں کامیابی کے ساتھ ساتھ بہترین دوستی کا اعزاز بھی ملتا ہے تو دونوں خوش ہو کر آپس کی رنجشوں کو بھلا دیتے ہیں:

''یوں دو نوجوان دوستوں کی دوستی نے دو خاندانوں کو امن اور سکون کی نعمت سے آشنا کر دیا۔''(۳۱)

اسی طرح کہانی ''جادوگرنیاں اور اندھا کنواں'' میں راہیؔ یہ سبق دیتے ہیں کہ جو لوگ دوسروں کے لئے کنواں کھودتے ہیں وہ خود اس میں جا گرتے ہیں۔اس کہانی میں دو آدم خور جادوگرنیاں پہلے مسافروں کو اندھا کر کے' اندھے کنویں میں دھکیلتی ہیں اور پھر مزے سے اُنہیں نوچ نوچ کر کھاتی ہیں۔ایک دن وہ خود آپس میں لڑ کر ایک دوسرے کو اندھا کرتی ہیں اور کنویں میں گرتی ہیں۔کہانی ''خزانے کی تلاش'' میں کاشف نامی ایک شخص خواب میں ایک خزانہ دیکھتا ہے، وہ اُسے بشارت سمجھ کر خزانے کی تلاش میں نکلتا ہے اور کسی غار کے دہانے پر پہنچتا ہے، وہاں اس کی ملاقات ایک بوڑھے شخص سے ہوتی ہے جو اسے سمجھاتا ہے کہ صحت وتندرستی ہی انسان کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔سونا، چاندی اور ہیرے وجواہرات نہیں۔یہ ایک سبق آموز کہانی ہے اور اس میں پلاٹ کے ساتھ مکالمہ نگاری کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔''درخت'' کے عنوان سے لکھی گئی کہانی میں راہیؔ درختوں سے حاصل ہونے والے فوائد پر روشنی ڈالتے ہیں۔جس میں ایک بوڑھا شخص، ایک درخت کو دعاوے کر، اسے پیار کر کے چومتا ہے اور گلے لگاتا ہے، وہ یہ سب کچھ اس لئے کرتا ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر درختوں نے اس کا ساتھ دیا ہوتا ہے۔اُسے سایہ، پھل، لکڑی، فرنیچر سب کچھ درختوں ہی سے ملا ہوتا ہے، اس لئے وہ اس کا شکریہ ادا کر کے اس کے لئے دعا کرتا ہے۔یاد رہے کہ راہیؔ نے درختوں کی اہمیت وافادیت پر بچوں کے لئے ایک ناولٹ ''بولتے برگد'' بھی تحریر کیا ہے۔جو ادبِ اطفال میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

۲۔ فہم وفراست اور حکمت عملی سے کام لینے پر مبنی کہانیاں:

اس موضوع پر راہیؔ نے دو کہانیاں تحریر کی ہیں۔ (۱) جل پری سے شادی (۲) حکمت عملی۔کہانی ''جل پری سے شادی'' میں مرکزی کردار شہزادہ سلیم کے علاوہ جل پری شہزادی، ان کا بادشاہ اور سلیم کی والدہ کے کردار شامل ہیں۔اس کہانی میں راہیؔ فتنہ وفساد سے بچنے کے لیے ہوشیاری اور فہم وفراست سے کام لینے پر زور دیتے ہیں۔جل پری شہزادی، شہزادہ سلیم کو شادی کے لیے پسند کرتی ہے لیکن ان کا بادشاہ، شہزادہ سلیم کو اپنی سلطنت چھوڑنے کا کہتا ہے، جس پر شہزادے کا والد راضی نہیں ہوتا۔انکار کی صورت میں جل پری شہزادی کا بادشاہ طیش میں آ کر اعلان جنگ کرتا ہے اور

بات فتنہ وفساد تک پہنچ جاتی ہے۔ایسی صورت میں شہزادہ سلیم کی ماں جو تجویز پیش کرتی ہے، وہ معاملہ فہمی کی بہترین مثال ہے۔ ملاحظہ ہو:

''سلیم کی والدہ کی تجویز کے مطابق ایک ہفتہ شہزادہ اپنے باپ کی سلطنت میں گزارتا اور دوسرا ہفتہ جل پری کے والد کی سلطنت میں، پھر ایک وقت آیا کہ سلیم دونوں سلطنتوں کا مشترکہ بادشاہ مقرر ہوا اور تاحیات کامیابی سے بادشاہت کے فرائض نبھاتا رہا۔'' (۳۲)

اسی طرح کہانی ''حکمت عملی'' میں بھی راہیؔ اس بات کا درس دیتے ہیں کہ ہر کام باقاعدہ منصوبہ بندی اور حکمت عملی سے کرنا چاہیے، تاکہ بعد میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔کہانی میں ایک افریقی کسان کو کھیتوں میں کام کرنے کے لئے مدد کی ضرورت پڑتی ہے جس پر چڑیوں کا بادشاہ اسے سو پرندے بھیجتا ہے جو کھدائی، کاشت اور کٹائی تک کا سارا کام کرنے کے بعد کسان کا سارا غلہ بھی کھا جاتے ہیں' کیونکہ اُس نے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی ہوتی' اور نہ ہی غلے کو محفوظ کرنے کا کوئی انتظام کیا ہوتا ہے۔لیکن جب ایک ایشیائی کسان کو مدد کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ پرندوں کے بادشاہ سے ایک معاہدہ کرتا ہے کہ کام کرنے کے بعد ہی پرندوں کو کچھ کھانے کے لئے دیا جائے گا:

''معاہدے کے مطابق چڑیوں نے بڑی نفاست سے اپنا کام پورا کیا۔جس کے بعد کسان نے وہ ساری گندم حفاظت سے ڈھانپ کر رکھ دی اور قریب ہی باجرے کی بوریاں چڑیوں کے لیے کھول کر رکھ دی گئیں۔'' (۳۳)

چڑیوں نے باجرا کھایا اور اُڑ گئیں اور یوں ایشیائی کسان حکمت عملی سے کام لے کر نقصان اُٹھانے سے بچ گیا۔

۳۔ مختلف محاورات اور ضرب المثال پر مبنی کہانیاں:

اس موضوع پر لکھی گئی کہانیوں میں کہانی ''غبی خان'' اور ''نقلی زیبرا'' شامل ہیں۔ راہیؔ صاحب نے ان کہانیوں میں تفریحی انداز میں بچوں کو محاورات اور ضرب المثال سکھانے کی کوشش کی ہے۔کہانی غبی خان، میں ایک ایسے سیدھے سادے لڑکے کے بارے میں بتایا جاتا ہے جو بے وقوف ہونے کی وجہ سے ہر بات، محاورے، ضرب المثل کا غلط مطلب سمجھ کر طرح طرح کے سوالات کرتا ہے۔ مثلاً:

''ایک روز کسی نے کہا'' میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ یہ
سن کر بڑی سنجیدگی سے پوچھ بیٹھا:
''آپ کے ہاتھوں پر کتنے طوطے بیٹھے ہوئے تھے؟'' (۳۴)

اسی طرح راہیؔ صاحب نے کہانی میں مندرجہ ذیل محاورات اور ضرب المثال کا ذکر بھی کیا ہے:

۱۔ ''وہ دن لد گئے کہ خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے۔''

۲۔ ''میں تمہیں چھٹی کا دودھ یاد دلاؤں گا۔''

۳۔ ''میں غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔'' وغیرہ وغیرہ

کہانی ''نقلی زیبرا'' میں ایک گدھا زیبرے کی مشابہت اختیار کرنے کے لیے اپنے اوپر رنگ چڑھاتا ہے۔ ایک آدمی اُسے زیبرا سمجھ کر اپنے ساتھ لے بھی جاتا ہے کہ راستے میں بارش شروع ہو جاتی ہے۔ بارش میں بھیگنے پر اس کا سارا رنگ اتر جاتا ہے اور وہ پھر گدھے کا گدھا رہ جاتا ہے۔ اس موقع پر راہیؔ صاحب جو ضرب المثل استعمال کرتے ہیں۔ ذرا دیکھیے:

''لوٹ کے بدھو گھر کو آئے''(۳۵)

۴۔ منظر نگاری کے حوالے سے کہانیاں:

اس موضوع کو ذہن میں رکھتے ہوئے زیرِ نظر کتاب میں راہیؔ صاحب نے جو کہانیاں لکھی ہیں ان میں ''پری کا لہو''، ''بونوں کا جزیرہ'' اور'' آبشاروں کی سرزمین'' شامل ہیں۔ ان کہانیوں میں راہیؔ صاحب نے معلومات کے ساتھ ساتھ بہترین منظر نگاری کرتے ہوئے بچوں کی دلچسپی میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں پریوں، بونوں جیسی عجیب الخلقت مخلوق اور جزیروں کا ذکر کر کے کہانیوں میں حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے خوب صورتی کا عنصر پیدا کیا ہے۔ راہیؔ صاحب نے چونکہ خود ایڈ بنرا، ناروے اور سویڈن جیسے یورپی ممالک کی سیر کی ہے، اس لیے ان ممالک کے حسن و خوب صورتی کو انھوں نے'' آبشاروں کی سرزمین'' میں ایک پری کے کردار کے ذریعے نمایاں کر کے دلفریب منظر کشی کی ہے:

> ''پری ہر منظر کے پاس رکی اور پانی کی دھاروں کے نیچے جا کر برف جیسے پانی سے غسل کیا۔ اس کے بدن سے ٹکرانے والا پانی ململ کی طرح اس سے لپٹتا تھا اور جب وہ آبشار سے برآمد ہوتی تو پہاڑی میں جیسے کسی نے ململ کے تھان بچھا دیے ہوں۔ آبشاروں کا حسن دو چند اور سہ چند ہوتا گیا اور اس کی سریلی آواز نے آبشاروں کے ہر قطرے میں گھل مل کر جل ترنگ جیسی کیفیت پیدا کر دی۔''(۳۶)

اسی طرح کہانی ''پری کا لہو'' میں پاکستان کے شمالی علاقہ اسکردو کے پہاڑوں کی منظر نگاری اور ''بونوں کا جزیرہ'' میں بونوں سے متعلق ایک خیالی دنیا کی کہانی تخلیق کی گئی ہے۔

۵۔ محنت اور ہمت سے کام لینے کے موضوع پر لکھی گئی کہانیاں:

اس موضوع پر کتاب میں چار کہانیاں ''اندھا، گونگا، بہرا، لنگڑا''،'' اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں''، ''عظیم'' اور ''خوش رنگ چوڑیاں'' تحریر کی گئی ہیں۔ ان کہانیوں کے کردار اور واقعات ایسے ہیں جو بچوں کی عملی زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ زبان و بیان کے حوالے سے بھی بچوں کی ذہنی سطح کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ مضامین کے اعتبار سے بھی یہ کہانیاں انوکھی اور سبق آموز ہیں۔ راہیؔ صاحب ان کہانیوں میں بچوں کو محنت، ہمت اور عزم سے کام لینے کا درس دیتے ہیں کہ ہمیشہ دل لگا کر پڑھنے اور نقل پر بھروسہ نہ کر کے معاشرے میں اپنا مقام بنانا چاہیے۔ کہانی '' اندھا، گونگا، بہرا، لنگڑا'' میں بری صحبت میں بیٹھنے والے ایک لڑکے نعیم کی کہانی بیان کی گئی ہے جو نقل سے میٹرک پاس کرنے کے بعد بے کار

کہانی ''نقلی زیبرا'' میں ایک گدھا زیبرے کی مشابہت اختیار کرنے کے لیے اپنے اوپر رنگ چڑھاتا ہے۔ایک آدمی اُسے زیبرا سمجھ کر اپنے ساتھ لے بھی جاتا ہے کہ راستے میں بارش شروع ہو جاتی ہے۔ بارش میں بھیگنے پر اس کا سارا رنگ اتر جاتا ہے اور وہ پھر گدھے کا گدھا رہ جاتا ہے۔اس موقع پر راہی صاحب جو ضرب المثل استعمال کرتے ہیں۔ذرا دیکھیے:

''لوٹ کے بدھو گھر کو آئے''(۳۵)

۴۔ منظر نگاری کے حوالے سے کہانیاں:

اس موضوع کو ذہن میں رکھتے ہوئے زیر نظر کتاب میں راہی صاحب نے جو کہانیاں لکھی ہیں ان میں ''پری کا لہو''، ''بونوں کا جزیرہ'' اور'' آبشاروں کی سرزمین'' شامل ہیں۔ان کہانیوں میں راہی صاحب نے معلومات کے ساتھ ساتھ بہترین منظر نگاری کرتے ہوئے بچوں کی دلچسپی میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔علاوہ ازیں پریوں، بونوں جیسی عجیب الخلقت مخلوق اور جزیروں کا ذکر کر کے کہانیوں میں حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے خوب صورتی کا عنصر پیدا کیا ہے۔راہی صاحب نے چونکہ خود ایڈنبرا، ناروے اور سویڈن جیسے یورپی ممالک کی سیر کی ہے، اس لیے ان ممالک کے حسن وخوب صورتی کو انھوں نے'' آبشاروں کی سرزمین'' میں ایک پری کے کردار کے ذریعے نمایاں کر کے دلفریب منظر کشی کی ہے:

> ''پری ہر منظر کے پاس رکی اور پانی کی دھاروں کے نیچے جا کر برف جیسے پانی سے غسل کیا۔اس کے بدن سے ٹکرانے والا پانی ململ کی طرح اس سے لپٹتا تھا اور جب وہ آبشار سے برآمد ہوتی تو پہاڑی میں جیسے کسی نے ململ کے تھان بچھا دیے ہوں۔آبشاروں کا حسن دو چند اور سہ چند ہوتا گیا اور اس کی سریلی آواز نے آبشاروں کے ہر قطرے میں گھل مل کر جل ترنگ جیسی کیفیت پیدا کر دی۔''(۳۶)

اسی طرح کہانی ''پری کا لہو'' میں پاکستان کے شمالی علاقہ اسکردو کے پہاڑوں کی منظر نگاری اور ''بونوں کا جزیرہ'' میں بونوں سے متعلق ایک خیالی دنیا کی کہانی تخلیق کی گئی ہے۔

۵۔ محنت اور ہمت سے کام لینے کے موضوع پر لکھی گئی کہانیاں:

اس موضوع پر کتاب میں چار کہانیاں ''اندھا، گونگا، بہرا، لنگڑا''،'' اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں''، ''عظیم'' اور''خوش رنگ چوڑیاں'' تحریر کی گئی ہیں۔ان کہانیوں کے کردار اور واقعات ایسے ہیں جو بچوں کی عملی زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔زبان وبیان کے حوالے سے بھی بچوں کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھا گیا ہے۔مضامین کے اعتبار سے بھی یہ کہانیاں انوکھی اور سبق آموز ہیں۔راہی صاحب ان کہانیوں میں بچوں کو محنت، ہمت اور عزم سے کام لینے کا درس دیتے ہیں کہ ہمیشہ دل لگا کر پڑھنے اور نقل پر بھروسہ نہ کر کے معاشرے میں اپنا مقام بنانا چاہئے۔کہانی '' اندھا، گونگا، بہرا، لنگڑا'' میں بری صحبت میں بیٹھنے والے ایک لڑکے نعیم کی کہانی بیان کی گئی ہے جو نقل سے میٹرک پاس کرنے کے بعد بے کار

کاموں میں اپناوقت ضائع کرتا ہے، اور آخر کار ماں سے اُلجھ کر گھر چھوڑ دیتا ہے، ایک روز کسی جنگل سے گزرتے ہوئے چار دوستوں (جن میں ایک گونگا، دوسرا اندھا، تیسرا بہرہ، چوتھا لنگڑا ہوتا ہے) سے نصیحت حاصل کر کے اپنی والدہ سے معافی مانگ کر پڑھائی مکمل کر کے ذاتی کاروبار میں خوب محنت کرتا ہے اور بہت جلد ملک کا اہم تاجر بن جاتا ہے۔ راہیؔ لکھتے ہیں:

''کل کا نکھٹو نعیم، اب اپنی محنت اور ماں کی دعاؤں کی بدولت قابل احترام سیٹھ نعیم بن گیا تھا۔'' (۳۷)

اسی طرح کہانی ''اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں'' میں بھی صادق نامی ایک طالب علم، نقل کی بجائے محنت کے بل بوتے پر ملک کا نامور سرجن بنتا ہے۔ کہانی ''عظیم'' میں عظیم نامی ایک معذور بچہ (جو ایک موچی کا بیٹا ہوتا ہے) حوصلے اور عزم سے کام لے کر محنت کر کے امتحان میں نمایاں کامیابی پر انعام پاتا ہے اور کہانی ''خوش رنگ چوڑیاں'' میں ایک غریب لڑکی ''نادرہ'' خوب صورت مگر ٹوٹی ہوئی رنگین چوڑیوں سے ایک مونتاژ (مختلف ٹکروں سے بنی ہوئی تصویر) بنا کر بیچتی ہے اور محنت کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر والدین کا ہاتھ بٹاتی ہے۔

۶۔ ماں کی ممتا اور محبت پر رقم کی گئی کہانیاں:

راہیؔ نے اس موضوع پر ''چڑیوں کی چہکار'' میں دو کہانیاں ''فاختہ کی امی'' اور ''جنت گم گشتہ'' کے نام سے لکھی ہیں۔ ان کہانیوں میں ماں کے لازوال جذبہ محبت کو موضوع بنایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ماں اپنی اولاد سے بے پناہ محبت کرتی ہے، اس لیے اللہ نے اس کے قدموں تلے جنت رکھی ہے۔ ''فاختہ کی امی'' میں شایان نامی ایک لڑکا پہاڑ کے اس طرف جا کر راستہ بھٹک کر دیر سے گھر آتا ہے، تو اس کی امی اس کے لئے پریشان ہو کر روتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب شایان واپس گھر آتا ہے تو راستے میں فاختہ کے بچے کو بھی اٹھا کر گھر لے آتا ہے۔ گھر پہنچ کر جب وہ اپنی ماں کے چہرے کو آنسوؤں سے تر پاتا ہے، تو اسے احساس ہوتا ہے کہ فاختہ کے بچے کو اٹھا کے گھر لا کر اس نے کتنی بڑی غلطی کر دی ہے۔ چنانچہ وہ اسے واپس اپنی امی کے پاس لے کر جاتا ہے اور کہتا ہے:

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک ماں اپنے بچھڑے ہوئے بچے کے لیے کتنی پریشان ہو جاتی ہے۔'' (۳۸)

اسی طرح کہانی ''جنت گم گشتہ'' میں بھی ایک ماں اپنے بچے کی جدائی میں بدحال ہوتی ہے اور دن رات روتی اور ماتم کرتی ہے۔ اس کہانی میں ریشم جان، اس کا خاوند روخان، ننھا بچہ نوروز، نوکرانی بی بو اور اس کی بیٹی کے کردار شامل ہیں۔ نوکرانی ریشم جان کے بچے نوروز کو اٹھا کر اپنی بیٹی کی گود میں ڈالتی ہے، جس کا حال ہی میں بچہ فوت ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن اس کی بیٹی نوروز کو اپنی ماں کے پاس خود لے کر جاتی ہے، اس لیے کہ اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے، کہ نوروز کی ماں کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟ ان کہانیوں میں ماں کے جذبات اور ممتا کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔

۷۔ کتاب اور استاد کی اہمیت و برتری پر لکھی گئی کہانیاں:

اس موضوع پر راہیؔ نے دو کہانیاں تحریر کی ہیں۔جن میں ''زلزلہ'' بہترین پیشہ''اور''بہترین تحفہ'' شامل ہیں۔ کہانی ''زلزلہ'' میں راہیؔ نے ۲۰۰۵ء میں بالاکوٹ میں پیش آنے والے زلزلے میں متاثر ہونے والے ایک گھر کی کہانی بیان کی ہے۔نوشیروان اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر سپورٹس کا سامان لینے سیالکوٹ گیا ہوتا ہے کہ اسے اچانک زلزلے کی خبر ملتی ہے۔وہ فوراً اپنے گھر کی طرف لوٹتا ہے،لیکن جب بالاکوٹ پہنچ کر اسے اپنے بال بچوں کی لاشیں ملبے تلے دب کر ملتی ہیں تو اسے شدید صدمہ پہنچتا ہے۔اس صدمے کو بھلانے کے لیے وہ خود کو سنبھال کر ایک خیمہ اسکول میں پڑھانے کا کام شروع کرتا ہے اور بہت جلد ایک اسکول کا ہیڈ ٹیچر بن جاتا ہے۔اب وہ اسکول میں پڑھنے والے تمام بچوں کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتا ہے:

> ''کسی نے اس سے پوچھا کہ آپ کی کتنی اولاد ہے؟بولا پچھلے سال میرے تین بچے تھے،آج الحمد اللہ میرے تین سو بچے ہیں۔''(۳۹)

اسی طرح کہانی ''بہترین پیشہ'' میں راہیؔ مختلف پیشوں کا ذکر کر کے ان کی اہمیت اور افادیت کو بیان کرتے ہیں اور سب سے آخر میں استاد کی اہمیت اور برتری کو واضح کرنے کے لیے استاد ہی کے زبانی مکالماتی انداز میں سوال کرتے ہیں:

> ''آپ میں سے ہر شخص اپنے پیشے میں آگے بڑھنے کے لیے ایک ہستی سے بہت کچھ سیکھنے کا محتاج ہے۔
> اگر آپ اسکول میں زندگی گزارنے اور اپنے پیشے کو فروغ دینے کا ڈھنگ نہ سیکھتے تو کیا آج اس بلند مقام پر فائز ہو سکتے تھے جہاں آپ کھڑے ہیں؟۔''(۴۰)

یوں سوال کے ذریعے راہیؔ بچوں کے ذہن پر دستک دے کر انہیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ استاد کی اہمیت اور مقام و مرتبے کا تعین خود کریں۔کہانی ''بہترین تحفہ'' میں کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔جس میں عنایت اپنے دوست وقار کو اس کی سالگرہ کے موقع پر فیروز اللغات کا ایک نسخہ تحفے کے طور پر دے کر سات سال بعد شکر گزار ہو کر کہتا ہے:

> ''دوست حقیقت میں تمہارا دیا ہوا تحفہ بہترین تحفہ تھا''(۴۱)

۸۔ سائنس فکشن سے متعلق کہانیاں:

اس موضوع پر بہت کم ادیبوں نے قلم اٹھایا ہے لیکن راہیؔ صاحب کو یہ کمال حاصل ہے کہ انہوں نے ادب اطفال میں اس موضوع پر بھی اچھا خاصا کام کیا ہے۔اس حوالے سے انہوں نے بچوں کے لیے''سرخ سیارہ'' کے نام سے ایک ناولٹ بھی تحریر کیا ہے اور زیر نظر کتاب میں بھی تقریباً آٹھ کہانیاں لکھی ہیں جن میں'' ایک مقام کی کہانی''، ''پہاڑوں کی شکست و ریخت''،''چندا ماموں کا خط''،''حیرت انگیز تبدیلی''،''دھنک بستی''،''مایال آئینے میں''،''اور میں جلتا

رہا‘‘ اور’’تین پراسرار سرنگ‘‘ شامل ہیں۔’’ایک مقام کی کہانی‘‘ میں راہیؔ نے فلسفیانہ انداز میں ایک آباد جگہ کے ریگستان میں تبدیل ہونے‘ پھر طویل عرصے کے بعد دوبارہ اس جگہ کے ہرے بھرے ہونے اور بعد میں بدلتے بدلتے شہروں میں منتقل ہونے کا ذکر کیا ہے۔’’پہاڑوں کی شکست وریخت‘‘ میں لاوے سے سونے بننے کے عمل کو بیان کیا گیا ہے۔اس حوالے سے راہیؔ لکھتے ہیں:

’’خوش قسمتی سے شہر میں پانی کا ایک بڑا ڈیم موجود تھا اور لاوے کے بیشتر حصے کا رخ اس ڈیم کی طرف تھا۔گرم لاوے کی حرارت سے ڈیم کا پانی بخارات میں تحلیل ہو کر فضا میں غائب ہو گیا اور اب اس کی جگہ لاوے نے لے لی جو ٹھنڈا ہوا، تو لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔‘‘(۴۲)

اسی طرح کہانی’’چندا ماموں کا خط‘‘ میں چاند کی روشنی کے پیدا ہونے کے سبب کو بہت خوب صورتی سے کہانی کا حصہ بنایا گیا ہے۔’’چندا ماموں‘‘ چھوٹے بچوں کا ایک پسندیدہ کردار ہے، جسے سب بچے بہت پسند کرتے ہیں۔کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ سپنا خواب میں چندا ماموں کو ایک خط لکھتی ہے۔جس میں سپنا چندا ماموں سے اس کے روشن ہونے کا سبب پوچھتی ہے:

’’چندا ماموں!

آپ ہمیں اور سب بچوں کو بہت اچھے لگتے ہیں۔آپ کی ہلکی ہلکی روشنی مجھے بہت پسند ہے۔میں حیران ہوں کہ آپ کی یہ روشنی آتی کہاں سے ہے اور یہ سورج کی روشنی سے اتنی مختلف کیوں ہے؟‘‘(۴۳)

راہیؔ چندا ماموں کی طرف سے بھیجے جانے والے خط کے ذریعے سے دراصل چاند کی روشنی کا سبب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’میری روشنی پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ! یہ روشنی دراصل سورج کی وجہ سے ہے، جب سورج کی روشنی مجھ پر پڑتی ہے تو میں روشن ہو جاتا ہوں اور نظر آنے لگتا ہوں‘‘۔(۴۴)

کہانی’’حیرت انگیز تبدیلی‘‘ دو بچوں شائق اور ثمینہ کے مرکزی کرداروں پر لکھی گئی ہے۔جو ایلینز کے زیر اثر عجیب و غریب حرکات و سکنات کرتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے والدین پریشان ہوتے ہیں اور جب وہ اس سلسلے میں ایک ماہر نفسیات کی خدمات لے کر تحقیقات کراتے ہیں، تو پتہ چلتا ہے:

’’حقیقت میں کسی اور سیارے سے دو ایلینز شائق اور ثمینہ کے قالب میں داخل ہو کر انسانی روپ اختیار کر کے آپس میں بات چیت کرتے ہیں اور پھر ان کے جسموں سے خارج ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔‘‘(۴۵)

’’مایال آئینے میں‘‘ میں ایک چھوٹی بچی مایال، ایک آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا عکس دیکھ کر امی سے کہتی ہے کہ مایال دو ہیں۔یہ مایال نمبر ایک اور میں مایال نمبر دو، پھر وہ اس آئینے کو لے کر لاتعداد اور آئینوں کا عکس بناتی ہے۔جسے

راہیؔ منظر کشی کرتے ہوئے یوں پیش کرتے ہیں:

''مایال نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا آئینہ اٹھایا، اسے لے کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی اور امی کو اشارے سے پاس بلایا۔ امی نے آئینے میں جھانک کر دیکھا تو اس میں لاتعداد آئینے دور تک پھیلے نظر آئے اور ہر آئینے میں ایک مایال کھڑی مسکرا رہی تھی۔'' (۴۶)

کہانی ''اور میں جلتا رہا'' میں راہیؔ نے فطری منظر نگاری سے کہانی کا آغاز کر کے ایک قدیم درخت سے ہیرا بننے کے عمل کو بیان کیا ہے۔ کہانی کے آخر میں درخت ہی کی زبانی لکھتے ہیں:

''میں نے ہزاروں تکلیف سہی لیکن مجھے اس کا پھل بھی ملا۔ اب میں دنیا کا سب سے قیمتی پتھر ہوں۔ آج کل برطانیہ کی ملکہ ایلزبتھ کے تاج کی زینت ہوں۔ مجھے کوہ نور ہیرا کہا جاتا ہے۔'' (۴۷)

اسی طرح کہانی ''تین پر اسرار سرنگ'' میں روحانیات سے دلچسپی رکھنے والا ایک انجینئر تین سرنگ بناتا ہے۔ یہ سرنگ حقیقت میں وقت کے سرنگ (Time Tunnel) ہوتے ہیں، جس میں داخل ہو کر انسان اپنی زندگی کے پچھلے مختلف ادوار دیکھ سکتا ہے۔

۹۔ ہمدردی اور دوسروں کے کام آنے کے موضوع پر تخلیق کی گئی کہانیاں:

اس موضوع پر راہیؔ نے کل چھ کہانیاں لکھی ہیں جن میں ''بارش میں ایک گٹھڑی''، ''اکیلی لڑکی''، ''بولتی مچھلی''، ''پسندیدہ شخصیت''، ''دو وقت کا کھانا'' اور ''بے فیض کنواں'' شامل ہیں۔ ان کہانیوں میں وہ نصیحت کرتے ہیں کہ ہمیشہ دوسروں کے کام آنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا چاہئے کیونکہ درحقیقت دوسروں کے لیے جینا ہی اصل زندگی ہے۔ اس لیے ہمیشہ نیکی، ہمدردی اور حسن سلوک سے کام لینا چاہئے۔ راہیؔ کی یہ کہانیاں بچوں کی کرداری تربیت سے گہرا تعلق رکھنے کی بنیاد پر ان کی شخصیت سازی میں بھرپور کردار ادا کرتی ہیں۔

کہانی ''بارش میں ایک گٹھڑی'' میں مصنف ایک طرف دوسروں کے ساتھ شفقت اور ہمدردی کا درس دیتے ہیں اور دوسری طرف ہمارے معاشرے کے اس المیے پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ پاکیزہ جیسی نجانے کتنی معصوم بچیاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ کہانی میں پاکیزہ نامی لڑکی رات کو سخت سردی میں خود کو اپنی باہوں میں لپیٹے ہوئے گٹھڑی سی بنی ہوتی ہے، اس دوران یوسف نامی ایک شخص کی نظر گھر جاتے ہوئے اس پر پڑتی ہے، تو وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے جا کر اپنی بیٹی بناتا ہے اور جب اس کی اپنی سگی بیٹی عالیہ کسی متعدی مرض کی وجہ چل بستی ہے تو یہی پاکیزہ ان کے گھر کی شہزادی بنتی ہے۔ اسی طرح کہانی ''اکیلی گڑیا''، صغریٰ، انمول، اس کی امی اور ابو کے کرداروں پر مشتمل ہے۔ انمول کے گھر کے قریب صغریٰ نامی ایک ننھی منی بچی رہتی ہے جو رو رہی ہوتی ہے، کیونکہ اس کی امی فوت ہو چکی ہوتی ہے۔ انمول اسے اپنی ایک بڑی جاپانی گڑیا ہمدردی کے طور پر دیتی ہے اور جب اس کے ابو اس سے ایسا کرنے کی وجہ پوچھتے ہیں

تو وہ جواب دیتی ہے:

''اس لیے کہ میرے پاس تو میری ماما ہیں ۔لیکن وہ چھوٹی گڑیا بے چاری اکیلی ہے۔اس کی کوئی ماما نہیں ہے۔یہ گڑیا اس کے پاس ہوگی تو اسے لگے گا کہ اس کی ماما اس کے پاس ہیں۔''(۴۸)

کہانی ''بولتی مچھلی'' میں ایک غریب مچھیرے کی دعا سے مچھلی ایک شہزادے کا روپ اختیار کرتی ہے۔شہزادہ جب مچھیرے کو اپنے ساتھ محل جانے کے لیے کہتا ہے تو مچھیرا حامی نہ بھرتے ہوئے کہتا ہے:

''میری بادشاہت تو میری غریبانہ زندگی اور محنت ہے''(۴۹)

مچھیرے کی خودداری سے متاثر ہو کر شہزادہ اسے یہ ذمہ داری سونپتا ہے کہ ملک کے غریب وغرباء کی مدد کر کے انہیں میری طرف سے رقم یا عہدہ دیا کرو۔مچھیرا اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے عبدالستار ایدھی کی طرف مسکینوں،غریبوں ،یتیموں اور ضرورت مندوں کی حاجتیں پوری کر کے اپنے اور شہزادے کے لیے دعائیں سمیٹتا ہے۔کتاب میں شامل ''پسندیدہ شخصیت'' کے عنوان سے لکھی گئی کہانی میں مصنف بچوں کو تین عظیم شخصیات قائداعظم محمد علی جناح،حکیم محمد سعید اور عبدالستار ایدھی سے متعارف کرواتے ہیں اور ان کی وجہ شہرت اور خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے خدمت خلق کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔''دو وقت کا کھانا'' کی سبق آموز کہانی کے بارے میں مصنف کہتے ہیں کہ یہ ایک سچی کہانی ہے،جو حکیم محمد سعید کے ابتدائی حالات زندگی،ان کی خدمت خلق اور وفات کے واقعہ پر مبنی ہے۔اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ حکیم محمد سعید نے طب کا پیشہ اختیار کر کے ساری زندگی لوگوں کا مفت علاج کیا۔بچوں اور بڑوں کے لئے متعدد کتابیں لکھیں،جس سے وہ مستفید ہوتے رہے،اس کے علاوہ مصنف یہ بھی بتاتے ہیں کہ حکیم محمد سعید کے معاشی حالات ابتداء میں بہت ناگفتہ بہ تھے جس کی وجہ سے انہوں نے دو وقت کے کھانے کو معمول بنایا،لیکن بعد میں حالات اچھے ہونے کے باوجود بھی انہوں نے اس سنت رسولؐ کو نہیں چھوڑا اور تادم حیات اچھی صحت پائی۔''بے فیض کنواں'' کی کہانی دو مرکزی کرداروں فیضان اور اس کے بیٹے عبدالقہار پر مبنی ہے۔فیضان کی زمین میں ایک کنواں ہوتا ہے جس سے گاؤں کے چھوٹے موٹے کاشتکار اور دوسرے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔لیکن اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبدالقہار اپنی تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لوگوں پر کنوئیں کا پانی بند کر دیتا ہے جس کی وجہ سے کنواں سوکھ جاتا ہے۔اس پر اس کے ماموں اسے نصیحت کرتے ہیں:

''برخوردار! جو چشمہ یا کنواں لوگوں کو فیض پہنچاتا ہے وہ چلتا رہتا ہے۔اگر چشمے یا کنوئیں کا پانی استعمال نہ ہو تو وہ سوکھ جاتا ہے یا اپنی افادیت کھو بیٹھتا ہے۔(۵۰)

۱۰۔ اچھے کام اور اچھی عادتیں اپنانے کی ترغیب دینے پر لکھی گئی کہانیاں:

اس موضوع پر مختلف عنوانات کے تحت چار کہانیاں مرتب کی گئی ہیں۔جن میں ''سفر آخرت''،''ہائی جیکنگ''، ''نور، گل اور انمول'' اور ''چیزیں کیا سوچتی ہیں؟'' کی کہانیاں شامل ہیں۔یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایسی اچھوتی

اور انوکھی کہانیاں ہیں جن میں بچوں کو اچھے اچھے کام کرنے کی نصیحت کے ساتھ غور وفکر کی بھی دعوت دی گئی ہے کہ وہ خود سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ کون سی عادتیں اور باتیں اچھی ہیں اور کون سی بری ہیں۔ ''کہانی سفرِ آخرت'' میں نہ صرف بچوں کے لیے نصیحت موجود ہے بلکہ بڑوں کے لیے بھی اس میں ایک خاص سبق ہے کہ ہر شخص کو اپنی آخرت کے لیے نیک اور صالح اعمال کر کے تیاری کرنی چاہیے۔ کہانی میں ملک الموت کسی اَسّی سالہ بوڑھے شخص کی روح قبض کرنے کے لیے آتا ہے تو وہ اس سے تھوڑی سی مہلت اپنی زندگی کے اچھے برے کاموں کا حساب کتاب کرنے کے لیے مانگتا ہے۔ جب برائی کے مقابلے میں اپنے اچھے کاموں کا پلڑا بھاری پاتا ہے تو آخر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی شفاعت پر بھروسہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''میں سفرِ آخرت پر جانے کے لیے بالکل تیار ہوں۔'' ''آیئے اپنا فریضہ پورا کیجئے۔'' (۵۱)

کہانی ''ہائی جیکنگ'' میں ایک سیدھے سادے بچے شاہین کو بچپن سے ہوائی جہاز ہائی جیک کرنے کا بہت شوق ہوتا۔ لیکن ہوائی جہاز میں سفر کے دوران جب بیچ میں جہاز ہائی جیک ہوتا ہے، تو شاہین بڑی ہوشیاری اور دلیری سے نہ صرف جہاز کو ہائی جیک ہونے سے بچاتا ہے بلکہ مسافروں کی جان بھی بچاتا ہے۔ اسی طرح کہانی ''نور، گل اور انمول'' میں بھی راہیؔ بچوں کو اچھے اچھے کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں کہ اچھے بچے وہ ہوتے ہیں جو صبح سویرے اٹھ کر وقت پر اپنا کام کرتے ہیں اور اپنے والدین کا کہا مان کر ان سے پیار کر کے ان کی خدمت کرتے ہیں۔ ''چیزیں کیا سوچتی ہیں'' کے عنوان سے تحریر کی گئی کہانی بھی بچوں کے لیے ایک سبق آموز اور قابلِ غور کہانی ہے۔ اس کا مرکزی کردار سمیرا ہے۔ اس میں راہیؔ بچوں کی توجہ کچھ ایسے اہم امور کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو عموماً چھوٹے بچوں سے سرزد بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً دیواروں پر لکھنا، پردوں سے ہاتھ منہ صاف کرنا، صوفوں پر چھلانگیں لگا کر ان کے کونوں کھدروں میں کھانے پینے کی چیزیں پھینکنا۔ مصنف بچوں کو ایسی تمام بری عادتوں سے بچنے اور اچھے اچھے کام کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

۱۱۔ معاشرتی ناہمواریوں پر طنز کی کہانیاں:

راہیؔ نے ہمارے معاشرے میں سیاست دانوں کے لوٹ کھسوٹ اور مذہب کے نام پر لوگوں کو گمراہ کرنے کے عنوان سے جو کہانیاں لکھی ہیں، ان میں ''ٹارزن شہر میں''، ''بے چارہ ڈریکولا'' اور'' طالبان مردوں کے درمیان'' شامل ہیں۔ کہانی ''ٹارزن شہر میں'' شہزار نامی کردار ایک ٹارزن کو جنگل سے شہر کی زندگی کی طرف لاتا ہے، لیکن وہ چند دنوں کے بعد یہ کہہ کر واپس جنگل چلا جاتا ہے کہ شہر کے لوگوں میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہاں لوگوں کے دل حسد، جھوٹ، رشوت اور کینے سے بھرے ہوئے ہیں۔ ''بے چارہ ڈریکولا'' میں مصنف نے ہمارے ملک کے سیاست دانوں پر طنز کیا ہے۔ اس کہانی میں کسی آدمی کو ایک قبرستان میں ڈریکولا نظر آتا ہے وہ اس سے پوچھتا ہے کہ تم قبرستان میں کیا کر رہے ہو، تمھیں تو انسانوں کی بستی میں ہونا چاہیے تھا تو ڈریکولا جواب دیتا ہے کہ وہاں جا کر کیا کروں گا، وہاں تو میرے پینے کے لئے

کسی انسان میں خون ہی نہیں بچا ہے کیونکہ:

> ''لوگوں کے خون کا ایک بڑا حصہ یہاں کا پچھلا حکمران پی چکا ہے، باقی ماندہ ایک ایک قطرہ نئے حکمران، ان کے خاندان اور حواریوں نے نچوڑ لیا ہے۔'' (۵۲)

اسی طرح کہانی ''طالبان مردوں کے درمیان'' میں بھی مصنف نے مذہب کے نام پر گمراہ کرنے والے لوگوں پر طنز کیا ہے۔

۱۲۔ شرارتوں سے منع کرنے کی نصیحت پر لکھی گئی کہانیاں:

اس موضوع پر زیرِ نظر کتاب میں دو کہانیاں ''فاران کہاں غائب ہو گیا'' اور ''جن کے بیٹے کی موت'' شامل ہیں۔ مصنف نے چونکہ بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اس لئے انہیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ بعض اوقات بچے خواہ مخواہ کی شرارتوں سے اپنے والدین کو پریشان کرتے ہیں۔ کہانی ''فاران کہاں غائب ہو گیا'' میں ایک بچہ فاران' جان بوجھ کر مارکیٹ میں کپڑے بدلنے والے ایک کیبن میں خود کو چھپاتا ہے، جس کی وجہ سے والدین پوری رات اس کو تلاش کر کے پریشان رہتے ہیں۔ اسی طرح کہانی ''جن کے بیٹے کی موت'' میں ایک شخص کو بے جا شرارت بہت مہنگی پڑتی ہے جس میں اُس کی جان تک بھی چلی جاتی ہے۔ اس لئے راہیؔ ہر اس شرارت سے منع کرتے ہیں جس سے نقصان اٹھانے کا اندیشہ ہو۔

۱۳۔ نیکی کی اہمیت اور اس کے صلے پر تحریر کردہ کہانیاں:

اس موضوع پر مجموعے ''چڑیوں کی چہکار'' میں کل آٹھ کہانیاں شامل ہیں مثلاً ''گداگر سے رشتہ''، ''تتلی کے رنگ''، ''دعائیں''، ''نیکی کا ثمر''، ''کالا چاند''، ''خوب صورتی کا راز''، ''سلطنت کی قیمت'' اور ''چند اکھی'' وغیرہ۔ کم و بیش ساری کہانیوں میں مصنف نے نیکی کی اہمیت کو اُجاگر کر کے بتایا ہے کہ نیک اور اچھے کام ہی انسان کے کردار و شخصیت کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ''گداگر سے رشتہ'' میں ایک غریب لڑکا سعد، روزانہ سکول جاتے ہوئے اپنی پاکٹ منی سے ایک سکہ راستے میں بیٹھے ہوئے معذور گداگر کو دیتا ہے۔ گداگر مرنے سے پہلے اپنی ساری جمع پونجی اس لڑکے کے نام کرتا ہے۔ کچھ دن بعد ایک وکیل سعد کے باپ کے پاس آ کر اس گداگر کے بارے میں کہتا ہے:

> ''اس نے سعد کی تعلیم کے لئے میرے پاس اتنی رقم چھوڑی ہے کہ آپ کا بیٹا کم از کم کالج تک بالکل مفت تعلیم حاصل کر سکے گا۔'' (۵۳)

اس کہانی میں جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ قصے (کہانی) کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح کہانی ''تتلی کے رنگ'' میں گل اندام ایک ایسی تتلی کی جان بچا کر نیکی کماتی ہے جس کے ایک پنکھ پر کنکر پڑا ہوتا ہے۔ راہیؔ اس منظر کی حقیقی منظر کشی بہت باریک بینی سے یوں کرتے ہیں:

> ''تتلی گھاس پر پڑی تھی اور نہ جانے کہاں سے ایک کنکر آ کر اس کے ایک پنکھ کو دبائے ہوئے تھا۔ وہ بے چاری بار بار خود کو کنکر کے بوجھ سے آزاد کرنے کی جدوجہد کر رہی تھی لیکن اپنی نزاکت کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔'' (۵۴)

''دعائیں'' کے موضوع پر لکھی گئی کہانی بھی ایک لڑکا عباس، کسی غریب خوانچہ فروش کی مالی مدد کرتا ہے جس کی دعاؤں کے نتیجے میں عباس نہ صرف جماعت میں اوّل آتا ہے، بلکہ ایک ہزار روپے کے انعام کا مستحق قرار پاتا ہے۔ ''نیکی کی عمر'' میں ایک لڑکا ارسلان، ایک بوڑھے نابینا بھکاری کی مالی مدد کرتا ہے جو اُسے کچھ بیج بونے کے لئے دیتا ہے۔ اس سے ایک تناور، سایہ دار درخت اگتا ہے۔ جس پر ارسلان اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ نابینا بھکاری کہتا ہے:

''برخوردار! یہ شاید اس ایک نیکی کا صلہ ہے۔ جو تم نے کبھی مجھ سے کی تھی۔'' (۵۵)

کہانی ''کالا چاند'' میں راہیؔ یہ نصیحت کرتے ہیں کہ بُرے خصلتوں کی وجہ سے جس طرح چاند کا رنگ کالا پڑ گیا تھا۔ اسی طرح انسان کا دل بھی بُرائیوں اور بُرے کاموں کی وجہ سے کالا ہو جاتا ہے اور اس کے چہرے پر رعنائی نہیں رہتی۔ کہانی میں جب ایک پری اپنی جادوئی چھڑی سے چاند میں اچھی اچھی باتیں ڈال کر پیدا کرتی ہیں تو چاند برف کے گالوں کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''جوں جوں کالے چاند میں نئی نئی چیزیں شامل ہوتی چلی گئیں، اس کا چہرہ روشن اور روپ رسیلا ہوتا چلا گیا۔''(۵۶)

''خوب صورتی کا راز'' کے نام سے لکھی گئی کہانی میں ایک ضعیف العمر شخص' کسی آدمی کو بتاتا ہے کہ جب وہ کوئی غلط اور برا کام کرتا ہے تو اس کا اثر نحوست کی صورت میں اس کے چہرے پر ظاہر ہوتا ہے جبکہ اچھے کاموں کا حسن اس کی خوب صورتی کو بڑھاتا ہے۔ چنانچہ وہ نیک اور اچھے کاموں کو اپنا وطیرہ بناتا ہے جس کے نتیجے میں مرتے دم تک اس کے چہرے پر حسن کا نکھار چھایا رہتا ہے۔ ''سلطنت کی قیمت'' بھی ایک سبق آموز کہانی ہے جس میں ایک نوجوان اپنی چھاگل سے ایک پیاسے بادشاہ کو پانی پلاتا ہے۔ اُس وقت اس کے لئے پانی کی قدر و قیمت' اس کی پوری سلطنت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ جس کے لئے وہ اُس نوجوان کا بے حد شکر گزار ہوتا ہے۔ ''چندا مکھی'' کی کہانی میں چندا مکھی نامی پیاری سی بچی کو، ایک پری اچھی اچھی باتیں یوں سکھاتی ہے:

''کم از کم کسی ایک نیک کام کا تصور اپنے ذہن میں لایا کرو جو تم اگلے روز کر سکو، جیسے کسی بھوکے کو تھوڑا بہت کھلانا، اپنی پاکٹ منی سے کسی مسکین کی مدد کرنا، کسی چھوٹے بچے بچی سے پیار کی باتیں کرنا، بڑوں کا ادب کرنا، اسکول کا سبق یاد کرنا، اپنا کام وقت پر سرانجام دینا، وغیرہ وغیرہ۔''(۵۷)

اس طرح اس کہانی میں راہیؔ نے بچوں کو اچھے کاموں کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۴۔ بچوں کو لکھنے لکھانے کی ترغیب دینے پر لکھی گئی کہانیاں:

اس موضوع پر کتاب میں دو کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ ''کارٹون قبضہ گروپ'' اور ''لمبا پیڑ'' ان دونوں کہانیوں میں مصنف نے بچوں کو کھیل اور مزاح مزاح میں لکھنے لکھانے کی ترغیب دی ہے کہ جس طرح وہ کہانیاں شوق سے پڑھتے ہیں اسی طرح چھوٹی موٹی کہانیاں وہ خود بھی اخذ کر کے تحریر کر سکتے ہیں۔ ''کارٹون قبضہ گروپ'' میں تصویر نامی ایک لڑکی، مختلف

کارٹونز کے کرداروں پر مبنی ایک خیالی کہانی سوتے ہوئے نیند میں تحریر کرتی ہے، جس کے مطابق پورے گھر پر کارٹونوں کا قبضہ ہوتا ہے۔ جب وہ نیند سے بیدار ہوتی ہے، تو اپنے گھر والوں کو یہ کہانی سناتی ہے جس پر سب اُسے داد دیتے ہیں۔

کہانی ''لمبا پیڑ'' میں بھی ایک اور بچی اس طرح کی ایک خوب صورت اور پر مزاح کہانی تخلیق کرتی ہے۔ کہانی میں ایک ہاتھی، اونٹ اور زرافہ کے کردار ہیں۔ ان تینوں جانوروں کے بارے وہ لکھتی ہیں کہ اُنہوں نے اپنی گردنیں ایک لمبے پیڑ سے لٹک کر لمبی کی ہیں۔ جبکہ کونج اور سارس کے بارے وہ کہتی ہے کہ ان پرندوں نے لٹک کر اپنی ٹانگیں لمبی کی ہیں، حالانکہ ان سب جانوروں اور پرندوں کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر ایسا پیدا کیا ہے، لیکن بچی صرف مزاح پیدا کرنے کی غرض سے اُن کے بارے میں ایسا لکھتی ہیں۔ اُس کی تحریر کردہ کہانی، جب اُس کے گھر والے پڑھتے ہیں تو اسے سب بہت پسند کرتے ہیں۔

۱۵۔ حلال وحرام مال کمانے کے اثرات پر لکھی گئی کہانیاں:

محنت سے کمانے والا اللہ کا دوست ہے یعنی محنت اور کوشش سے حلال رزق کمانا ایک عین عبادت ہے جبکہ غلط اور ناجائز طریقوں سے مال جمع کرنا، حرام کے زمرے میں داخل ہے۔ حرام مال کھانے اور کمانے کے منفی اثرات نہ صرف انسان پر خود مرتب ہوتے ہیں بلکہ اس کی اولاد اور آئندہ آنے والی نسلوں پر بھی اس کے اثرات جاری وساری رہتے ہیں۔ اس لیے راہیؔ نے بھی حلال کمانے اور حرام مال سے بچنے کی تلقین کے ضمن میں زیر نظر کتاب میں چار کہانیاں ترتیب دی ہیں جس میں انہوں نے یہی سبق دیا ہے۔ ان کہانیوں میں ''مکان کی آپ بیتی''، ''پانچ نسلوں کی کہانی''، ''حلال وحرام'' اور ''میں قرضہ چکا رہا ہوں'' وغیرہ شامل ہیں۔ کہانی ''مکان کی آپ بیتی'' میں ایک مکان میں رہنے والے ایماندار دوکاندار، ایک رشوت خور کسٹم افسر اور ان کے اہل وعیال کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ حلال اور حرام کمانے کے ان پر کیا مثبت اور منفی اثرات مرتب ہوئے۔ ''پانچ نسلوں کی کہانی'' کو راہیؔ نے ایک مختصر داستان کی صورت میں بیان کیا ہے کہ کس طرح پہلی نسل کا راہزن، چنگیز کی نسل، آہستہ آہستہ حلال کمائی کی طرف راغب ہو کر قدر ومنزلت حاصل کرتی ہے۔

اسی طرح کہانی ''حلال وحرام'' میں ایک ادیب، کسی کتاب فروش سے ایک کتاب لیتا ہے۔ لیکن غلطی سے وہ اس کتاب کی کم قیمت ادا کر چلا جاتا ہے۔ بعد میں جب اُسے پتہ چلتا ہے کہ کتاب کی قیمت تو ادا کی ہوئی رقم سے زیادہ ہے تو بقایا رقم کتاب فروش کو واپس کر کے یہ کہتا ہے:

> ''میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح کوئی شے بیچتے وقت زائد قیمت لینا حرام ہے، اسی طرح خریدتے وقت کم قیمت ادا کرنا بھی حرام ہے۔'' (۵۸)

اس حوالے سے کہانی ''میں قرضہ چکا رہا ہوں'' بھی ایک نصیحت آموز کہانی ہے۔

۱۶۔ مزاحیہ کہانیاں (تفریح برائے تفریح):

شجاعت علی راہی نے سنجیدہ تحریروں کے علاوہ کتاب میں بچوں کی دلچسپی اور تفریح کے غرض سے کچھ مزاحیہ کہانیاں بھی شامل کی ہیں۔ ان کہانیوں کے عنوانات ہی، ان کے متن کی توضیح کے لیے کافی ہیں مثلاً ''ملا نصیرالدین کے رونے کا فن''، ''ہنسنے کا مقابلہ''، ''مجھے پیٹو''، ''نذر گڈو''، ''پیٹھو دیو''، ''پیٹھا کدو ہاؤس''، ''سنو مین''، ''فصلوں کی غارت گری'' اور ''جن کی زبردستی'' وغیرہ۔

کہانی ''ملا نصیرالدین کے رونے کا فن'' میں مصنف نے صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ ایک کامیاب صورت واقعہ کے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق لکھتے ہیں:

> ''مزاحیہ صورت واقعہ کی کامیابی اس بات میں ہے کہ یہ کسی شعوری کاوش کی رہین منت نہیں، بلکہ از خود حالات و واقعات کی ایک مخصوص نہج یا کردار کی مخصوص ناہمواریوں سے پیدا ہوتی چلی جائے۔'' (۵۹)

اس کے علاوہ کہانی ''ملا نصیرالدین کے رونے کا فن'' میں ملا نصیرالدین کی والدہ فوت ہو چکی ہوتی ہے، اس موقع پر وہ جس انداز سے روتا ہے، راہی اُس کو اتنی خوب صورتی سے بیان کرتے ہیں کہ بندے کو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''پہلے ملا نصیرالدین کی آنکھیں روئیں مگر کچھ اس انداز سے کے کچھ لوگ بیساختہ مسکرا دیئے۔ اس کے بعد اس کی ناک روئی اس پر اکثر حاضرین ہنسنے لگے۔ بعدازاں اس کا پیٹ رونے لگا۔ اس کے بھاری بھرکم پیٹ کو یوں اچھلتا کودتا دیکھ کر بعض لوگوں کے قہقہے نکل پڑے۔
> آخر میں نصیرالدین سر سے پاؤں تک اس مضحکہ خیز انداز میں زاروقطار رونے لگا کہ لوگ قہقہے لگاتے ہوئے اپنا پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئے۔'' (۶۰)

اسی طرح کہانی ''ہنسنے کا مقابلہ'' میں ایک آدمی مقابلے میں حصہ لے کر سات مہینوں تک مسلسل ہنستا ہے، یہاں تک کہ وہ جان دے دیتا ہے یعنی فوت ہو جاتا ہے اور انعام اس کے لواحقین کو مل جاتا ہے۔ کہانی ''مجھے پیٹو'' میں ایک چالاک بچہ خود کو دوسرے بچے سے زبردستی پٹوا کر اس کی ساری جلیبیاں کھا لیتا ہے۔ ''نذر گڈو'' میں بھی مصنف چھوٹے بچوں کی نفسیات کے مطابق مکالمہ نگاری سے کام لیتے ہیں اور ایک سات سالہ چھوٹے بچے اور بھتنے کے درمیان بات چیت سے کہانی میں دلچسپی کا عنصر پیدا کرتے ہیں۔ ''پیٹو دیو'' میں بے شمار روٹیاں کھانے والے ایک دیو کی کہانی بیان کی گئی ہے جس میں اس کی روٹیاں کھانے کی تعداد عربوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ''پیٹھا کدو ہاؤس'' کی کہانی میں ایک کسان اپنے گھر کے قریب پیٹھا کدو بوتا ہے جو بڑھتے بڑھتے دو منزلہ مکان تک پہنچ جاتا ہے، پھر ایک راجا اُس کسان سے پیٹھا کدو سے ایک دل کش مکان بنانے کی اجازت مانگتا ہے جس پر کسان کہتا ہے:

> ''مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے مجھے خوشی ہوگی کہ میرا پیٹھا کدو اور یہ جگہ آپ کے کام آ سکے۔'' (۶۱)

کہانی ''سنو مین'' میں مصنف نہ صرف بچوں کو مری جیسی صحت افزا مقام کی سیر کرواتے ہیں بلکہ انہیں سنو مین بنانے کا طریقہ

بھی سکھاتے ہیں۔ کہانی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''جب سنو مین کافی حد تک مکمل ہو گیا تو انمول نے اپنے بیگ سے گاجر نکال کر سنو مین کی ناک بنا دی پھر کانچ کی دو چمکتی گولیوں سے اس کی آنکھیں لگا دیں، آخر میں اسے رنگا رنگ ٹوپی پہنا دی تو سب نے مل کر تالیاں پیٹیں اور سنو مین کے ہمراہ کھڑے ہو کر تصویریں اتاریں۔'' (۶۲)

کہانی ''فصلوں کی غارت گری'' میں بھی ایک طرح سے مزاح کا پہلو پایا جاتا ہے۔

۱۷۔ پرندوں کے ساتھ حسن سلوک پر مبنی کہانیاں:

مصنف اس موضوع پر تین کہانیاں ''ایک لاکھ چڑیاں''، ''سہیلی چڑیاں'' اور ''طوطوں کی اسیری'' لکھ کر اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ ان کی نظر میں اچھائی اور حسن سلوک کا دائرہ صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ چرند و پرند بھی اس میں شامل ہیں۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے ہمیں پرندوں کو قید کر کے ان سے ان کی فطری آزادی نہیں چھیننی چاہیے۔ کہانی ''سہیلی چڑیاں'' میں دو کردار شائستہ اور سعدیہ شامل ہیں۔ شائستہ کے گھر میں پنجرے میں بند ایک مینا ہوتی ہے، جسے وہ اپنی سہیلی کہتی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں سعدیہ باجرہ ڈال کر بہت ساری چڑیوں کو سہیلی بناتی ہے اور شائستہ سے کہتی ہے:

''یہ ساری چڑیاں تمہاری مینا کی طرح پنجرے میں قید نہیں ہیں، ہر وقت آزادی سے پھر پھر اُڑتی پھرتی ہیں۔'' (۶۳)

۱۸۔ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے، کسی کے تحفے کو حقیر نہ سمجھنے کے موضوع پر لکھی گئی کہانیاں:

اللہ کے ہر کام اور ہر تخلیق میں اپنی مصلحت ہوتی ہے جو انسان کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے، اس لیے ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور آہ و فریاد کر کے ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔ اس موضوع پر زیر نظر کتاب میں آٹھ کہانیاں ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں: ''آب حیات''، ''چڑیا کا گھونسلا''، ''برف کا صحرا''، ''گوشت کا پہاڑ''، ''چوہے''، ''پنک پینتھر کی مصوری''، ''سیٹی'' اور ''گڑیا''۔ کہانی ''آب حیات'' اپنے موضوع اور مرکزی خیال کی بدولت راہیؔ کے قلم کا نایاب شاہکار ہے۔ کتاب کا آغاز اسی کہانی سے ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے بادشاہ کے مرکزی کردار پر مشتمل ہے، جو آب حیات پی کر دائمی زندگی کی لالچ میں طویل عمری کے عذاب میں مبتلا ہوتا ہے اور پھر اپنے مرنے کی دعائیں کرتا ہے کہانی کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

''بادشاہ کے لیے جینا عذاب ہو گیا تھا اس کی عمر سو سال سے تجاوز کر چکی تھی لیکن موت اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ اب اسے احساس ہو چکا تھا کہ اس نے اپنے لیے مفت کا عذاب خرید لیا ہے۔ وہ دن رات دعائیں کرتا کہ اسے موت آجائے، لیکن بظاہر وہ اس نعمت سے محروم ہو چکا تھا۔'' (۶۴)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طویل عمری ایک عذاب ہے جس سے حضورؐ بھی پناہ مانگتے تھے۔ اس سلسلے میں مشکاۃ المصابیح کی ایک حدیث ملاحظہ ہو:

> ''ترجمہ: اے اللہ! میں تیرے ساتھ عاجزی، کاہلی، بزدلی، بخل، بڑھاپے اور عذاب قبر سے پناہ طلب کرتا ہوں۔'' (۶۵)

''چڑیوں کا گھونسلا'' کی کہانی میں فہیم ایک تیز آندھی میں اپنے مکان کی دیوار گرنے پر بہت پریشان ہوتا ہے۔ جس پر اس کا دوست اسے تسلی دیتے ہوئے ایک ایسی چڑیا کی مثال دیتا ہے جس کا گھونسلا بھی اس آندھی میں ٹوٹ چکا ہوتا ہے لیکن وہ پھر بھی پر امید نظر آتی ہے:

> ''دیکھو، یہ اپنے ٹوٹے ہوئے گھونسلے کا ماتم کرنے کی بجائے اپنے لیے دوبارہ آشیانہ بنانے میں مصروف ہے اور اس کی نغمہ سرائی سے لگتا ہے جیسے اللہ کا شکر ادا کر رہی ہو کہ وہ نیا گھونسلا بنانے کی ہمت رکھتی ہے۔'' (۶۶)

کہانی ''برف کا صحرا'' میں ہارون نامی ایک لڑکا برف باری دیکھنے اپنے پاپا کے ہمراہ ناروے جاتا ہے۔ لیکن وہاں برف باری نہ پا کر بددلی سے واپس سویڈن ہوائی جہاز کے ذریعے جاتا ہے کہ اچانک جہاز ڈولنے لگتا ہے اور مدد کے لئے ایک برفیلے مقام پر ٹھہرتا ہے، جس کے نتیجے میں سب مسافروں کو بھی اس علاقے میں ایک دن اور رات کے لیے ٹھہرنا پڑتا ہے ،ہارون جب دن رات برف میں ٹھٹھرتا ہے تو اس کے دل میں برف سے کھیلنے ،سومین بنانے ، اسکیٹنگ کرنے کی کوئی خواہش باقی نہیں رہتی اور وہ توبہ کر کے یہ عزم کرتا ہے:

> ''وہ آئندہ اسی حالت میں رہنا پسند کرے گا جس میں اللہ چاہے گا۔'' (۶۷)

اسی طرح کہانی ''گوشت کا پہاڑ''، ''چوہے'' اور ''پنک پینتھر کی مصوری'' میں بھی مصنف ایسے واقعات کو کہانی کی روپ میں پیش کر کے یہ نصیحت کرتے ہیں کہ ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ جبکہ ''سیٹی'' اور ''گڑیا'' کے عنوانات پر لکھی گئی کہانیاں تحفے کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ چونکہ تحفہ خلوص دل سے دیا جاتا ہے، اس لیے اسے کسی بھی صورت میں حقیر جان کر اس کی بے قدری نہیں کرنی چاہیے۔

۱۹۔ متفرق موضوعات پر مبنی کچھ کہانیاں:

راہیؔ کے اس مجموعے ''چڑیوں کی چہکار'' میں کچھ متفرق موضوعات پر بھی کہانیاں تحریر کی گئی ہیں۔ جن میں تاریخی، اصلاحی اور اخلاقی وعظ و نصیحت کا مجموعی رجحان ملتا ہے۔ ان کہانیوں میں ''اصلی شرلاک ہومز''، ''افلاطون اور شعراء''، ''بہترین انتخاب''، ''سرخ لومڑ''، ''کسان اور اس کی بیٹی'' اور ''نامکمل کہانی'' وغیرہ شامل ہیں۔ کہانی ''اصلی شرلاک ہومز'' میں بتایا گیا ہے کہ یہ دنیائے سراغ رسانی میں سر آرتھر کانن ڈائل کے ذہن کا ایک تراشا ہوا کردار ہے، جو اتنا حقیقی لگتا ہے کہ لوگ اسے سچ مچ کی ایک شخصیت سمجھتے ہیں۔ ''افلاطون اور شعراء'' میں افلاطون کے مشہور نظریے

''مثالی ریاست'' سے شعراء کے نکالنے کا جواز اور اس کی وضاحت پیش کی گئی ہے جس میں افلاطون کہتا ہے:

''شعراء غیر معمولی فنکار ہیں۔ ان کے کلام میں جادو ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس جادو کا اثر مثبت ہو لیکن کبھی اس کے منفی اثرات مرتب ہوں گے تو مثالی ریاست کا نظام منتشر ہو کر رہ جائے گا۔'' (۶۸)

اسی طرح کہانی ''بہترین انتخاب'' میں امن کا پیغام، ''سرخ لومڑ'' میں ہوشیاری سے کام لینے، ''کسان اور اس کی بیٹی''، میں قناعت اور خودداری کا درس اور ''نامکمل کہانی'' میں تجسس کے ساتھ غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے۔

المختصر شجاعت علی راہیؔ نے اپنے مجموعے ''چڑیوں کی چہکار'' میں بچوں میں اعلیٰ صفات، اخلاقی اقدار اور خصوصیات پیدا کرنے کے لیے مختلف موضوعات کا سہارا لے کر ادب اطفال کے بنیادی مقاصد کے حصول کو ممکن بنانے کی ایک عمدہ کاوش کی ہے۔ ان کہانیوں میں فنی لحاظ سے پس منظر، موضوع، کہانی پن، پلاٹ، کردار، مکالمہ، بیانیہ، تخلیقی زبان، بچوں کے ادب کے مقاصد کے حصول کا تناسب اور تجسس سبھی کچھ پایا جاتا ہے۔ گو راہیؔ کی تمام افسانوی تحریری ان کی تخلیقات اور کہانیاں بچوں کی عملی ضروریات سے منسلک ہیں اور حقیقی معنوں میں اس خلا کو پر کرنے کی اہلیت وصلاحیت رکھتی ہیں، جو تعلیم اور سماجی کمزوریوں کے سبب پیدا ہوتی ہیں۔

شجاعت علی راہیؔ کے بچوں کے لئے ڈرامے: تحقیقی وتنقیدی جائزہ

ا۔ شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا:

ڈراما افسانوی ادب کی ایک قدیم صنف ہے جو آج بھی نہ صرف مقبول ہے بلکہ فلم، ریڈیو اور ٹی وی ڈرامے کی شکل میں ایک اہم اور منافع بخش صنف کے طور پر اپنی اہمیت منوا چکی ہے۔

افسانوی ادب کے چار اصناف ہیں۔ (۱) داستان (۲) ناول (۳) افسانہ (۴) ڈراما۔ ان چاروں اصناف میں کہانی، کردار اور مکالمے مشترک اقدار ہیں۔ تاہم ہر صنف میں کہانی کی شکل وصورت مختلف ہے۔ ڈرامے کی نسبت دیگر تین اصناف کا تعلق پڑھنے سے ہے جبکہ ڈراما بنیادی طور پر دیکھنے یا سننے کی صنف ہے۔

پروفیسر انور جمال نے اپنی کتاب ''ادبی اصطلاحات'' میں ڈرامے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''یہ نثر کی قدیم ترین صنف شمار کی جاتی ہے۔ لفظ ڈراما یونانی لغت کا حصہ ہے جس کا مفہوم عمل یا حرکت ہے، یوں ڈراما زندگی کی عملی تصویر ہے۔ ڈرامے کو ادب کی اصناف میں قدامت کا افتخار حاصل ہے۔ دنیا کے پہلے انسان کے ساتھ ہی ڈرامے کا آغاز ہو گیا ہوگا۔ ''اظہار ذات اور نقل'' انسان کی جبلتیں ہیں اور یہی ڈرامے کے محرکات بھی۔ گویا خوشی سے ناچنا، کودنا، اور غم میں افسردہ ہونا اور رونا انسانی جبلت بھی ہے اور ڈراما بھی۔'' (۶۹)

ڈاکٹر اشرف کمال ''اصطلاحات'' میں ڈرامے پر تفصیلی گفتگو کر کے اس کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''ڈراما یونانی لفظ ''ڈراؤ'' سے مشتق ہے جس کے معنی ''کرنا یا کر کے دکھانا'' ہے۔ ڈراما کی بنیاد عمل اور تحرک پر ہے۔ ڈرامے کے ذریعے زندگی کی نقل اور معاشرے کے رسم و رواج کی عکاسی کی جاتی ہے۔ ڈراما ایک وسیع اور ہمہ گیر صنف ادب ہے جس میں انسانی خیالات و احساسات کو خوب صورت انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ڈراما اظہار و ابلاغ کی موثر ترین صورت ہے جس میں گفتگو اور حرکات و سکنات کے ذریعے اپنی بات دوسروں تک پہنچائی جاتی ہے۔ (۷۰)

جبکہ مرزا ادیب ڈرامے کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ڈراما نام ہے ایک ایسی کہانی کا جسے اداکاروں کے توسط سے سٹیج پر سٹیج کے لوازم کے ساتھ تماشائیوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔'' (۷۱)

ڈرامے میں کہانی' کرداروں کے اعمال اور مکالمے کے ذریعے آگے بڑھتی ہے اور تجسس پیدا کرتے ہوئے اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ کرداروں کا ٹکراؤ' کشمکش ڈرامے کی جان ہے اور اسی کے ذریعے ڈرامے میں حاضرین کی دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ ڈرامے کے کئی مقاصد رہے ہیں۔ قدیم زمانے میں ڈراما مذہبی رسومات استعمال ہوتا تھا۔ ابتداء میں ڈراما صرف سٹیج کے لئے لکھا جاتا تھا' تاہم وقت کے ساتھ ساتھ سائنسی ایجادات نے ڈرامے کی شکل و صورت بدل ڈالی اور ڈرامے نے مختلف ارتقائی مراحل طے کر کے ریڈیو، فلم، اور ٹی وی ڈرامے کے روپ میں ہم آہنگی اختیار کی۔ ڈراما اگرچہ زیادہ تر بڑوں کے لئے لکھا جاتا ہے، تاہم بچوں کے لئے بھی ڈرامے نگاری کی روایت موجود ہے۔

برصغیر میں ڈرامے کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں بچوں کے ڈرامے کی تاریخ پرانی نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈرامے کے ذریعے بچوں کی ذہنی تربیت کا نظریہ' ماہرین تعلیم نے بعد میں متعارف کروایا۔ اگر ہم برصغیر میں بچوں کے ڈراموں کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے کام جامعہ ملیہ، دہلی نے کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور کئی ماہرین تعلیم نے خود ڈرامے لکھ کر سٹیج کئے۔ استاد مولوی عبدالغفور مدھولی نے بچوں کے لیے پانچ ڈرامے ''چور لڑکا''، ''قوم پرست طالب علم''، ''محنت''، ''اسکول کی زندگی'' اور ''کایا پلٹ کے نام'' سے لکھے۔

محمد نور الٰہی، سید امتیاز علی تاج، مولانا چراغ حسن حسرت اور غلام عباس نے اس باب میں اپنی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ نور الٰہی نے ''بور کا لڈو''، سید امتیاز علی تاج نے ''انوکھا دربار'' مولانا چراغ حسن حسرت نے ''میاں ظفر نکالے گئے'' اور غلام عباس نے ''ننھی گڑیا'' کے نام ڈرامے لکھے۔ یہ بچوں کی ڈراما نگاری کے سلسلے میں ابتدائی کوششیں تھیں جو بعد میں وسعت اختیار کرتی چلی گئی۔ خان احمد حسین خان نے بچوں کے لیے تاریخی ڈرامے ''بچوں کے تھیٹر'' کے نام شائع کئے۔ غلام جعفر جرنلسٹ نے ''بندھن''، ''سفارشی چٹھی'' اور ''جمعہ برادران'' کے مشہور ڈرامے لکھے۔ ان کے علاوہ جن حضرات نے بچوں کے ڈرامے کے فن کو بام عروج پر پہنچایا ان میں عشرت رحمانی، شوکت تھانوی، بیگم قدسیہ، حبیب تنویر، لطیف فاروقی، نظر زیدی، عزیز اثری، ابوالحسن نغمی، فاروق علی خان، راجہ آمین الرحمان، میاں لطیف الرحمان اور کمال احمد رضوی کے نام شامل

ہیں۔

بچوں کے لئے ڈراما نگاری کے تقاضے مختلف ہیں۔ بچوں کا ڈراما وہی تخلیق کار لکھ سکتا ہے جسے بچوں کی نفسیات کا کما حقہ علم ہو اور اسے یہ ادراک حاصل ہو کہ بچوں کے لئے ڈراما لکھتے وقت کن کن ذمہ داریوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ادب اطفال کی دیگر اصناف کی طرح بچوں کا ڈراما بھی مثبت تفریح کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ مقصد پورا کرتا ہے۔

شجاعت علی راہیؔ نے شاعری، کہانی، ناولٹ نگاری کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے صنفِ ڈراما نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس سلسلے میں ان کے دو ڈرامے کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ ڈراموں کے ان مجموعوں میں ''شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا'' اور ''بچے ہوں تو ایسے ہوں'' شامل ہیں۔

''شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا'' ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جو ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ڈراما پاکستانی معاشرے کے ایک اہم مسئلے بلکہ المیے کی عکاسی کرتا ہے۔ حرف اول کے نام سے فضل ربی راہیؔ کتاب میں شامل دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا'' ۱۰ منٹ کے دورانیے پر مشتمل ایک مختصر سا ڈراما ہے لیکن اس میں بچوں کے لئے ہمت اور عزم سے کام لینے کا جو پیغام پوشیدہ ہے اس کے ذریعے وہ بے یقینی اور مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں سے نکل کر امید اور یقین کی بلندیوں تک پہنچ سکتے ہیں۔''(۷۲)

فضل ربی راہیؔ کی اس رائے سے پتا چلتا ہے کہ راہیؔ صاحب نے کتنے اہم انسانی المیے کو ڈرامے کے روپ میں پیش کیا ہے۔ یہ ڈراما دراصل عظیم نام کے ایک معذور بچے کی کہانی ہے۔ جو بچپن میں پولیو کے قطرے نہ پلانے کے سبب معذوری کا شکار ہو جاتا ہے۔ چونکہ معذوری نہ صرف جسمانی مسئلہ ہے بلکہ درحقیقت یہ بے پناہ نفسیاتی مسائل کی جڑ بھی ہے۔ راہی صاحب نے فن ڈراما نگاری کے تقاضوں کے مطابق عظیم کے کردار کی نفسیاتی پیچیدگی اور اُلجھنوں کی گرہ کشائی کی ہے اور مکالمے نگاری کے ذریعے ایک معذور بچے کی نفسیات کی نہ صرف عکاسی کی ہے بلکہ ایک مثبت پیغام کے ذریعے معذور بچوں کو یہ پیغام بھی دیا ہے کہ وہ معذوری کو زندگی کی رکاوٹ نہ سمجھیں بلکہ حالات کا مقابلہ کر کے زندگی کے اصل مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ڈرامے کے مرکزی خیال کی وضاحت میں شجاعت علی راہیؔ لکھتے ہیں:

> ''ڈرامے کی صنف میں یہ تحریر میرا پہلا قدم ہے۔ ڈراما دس بارہ
> منٹ پر محیط ہے اور پولیو کے شکار ہونے والے ایک طالب علم کے
> عظیم مقاصد کے گرد گھومتا ہے۔(۷۳)

راہیؔ صاحب کے مطابق یہ ڈراما نگاری میں ان کا پہلا قدم ہے، تاہم ان کا یہ ڈراما اپنے فکری حوالوں سے لے کر زبان و بیان تک ایک ایسی پختہ تحریر ہے، جو ایک طرف ڈراما نگاری کے فنی لوازمات کو نبھاتا ہے تو دوسری طرف موضوع کے

تقاضوں کے مطابق اپنے مقصد سے بھی ہمکنار ہوتا ہے۔اس بارے میں فضل ربی راہی لکھتے ہیں:

''زیرِ نظر ڈراما'' شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا'' زبان اور بیان، مدلل مکالموں اور پلاٹ کے لحاظ سے بہت پر اسرار اور اعلیٰ معیار کا حامل ہے جو عظیم جیسے بچوں میں عزم وہمت اور عملی زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔(۷۴)

ڈرامے کے دو ابواب (مناظر) ہیں۔ پہلا منظر عظیم اور اس کی امی کے مکالموں پر مشتمل ہے۔اس پہلے حصے میں ڈرامے کے پوری فضا پر مایوسی چھائی ہوئی ہے۔ یہاں پر کہانی' مکالموں کے ذریعے آگے بڑھتی ہے۔ ماں اور بیٹے کا مکالمہ دراصل مایوسی سے اُمید کی طرف بڑھنے کی ایک کوشش ہے۔اس حصے میں عظیم کا کردار اپنی معذوری کے آگے، ہارے ہوئے شخص کی طرح ذات کے خول میں بند ہو چکا ہے۔اسے کہیں پر بھی روشنی نظر نہیں آتی، وہ احساس کمتری میں مبتلا ہے اور اس کا ڈپریشن اس کو، اس کی زندگی سے لاتعلق کر چکا ہے۔ ڈرامے کے آغاز کو سمجھنے کے لئے عظیم کا اپنی امی کے ساتھ مکالمہ دیکھئے:

'' عظیم: امی! گلی کے سارے بچے اکٹھے کھیلتے ہیں، میں کیوں نہیں کھیل سکتا؟

ماں: عظیم بیٹا! تمہیں اللہ نے ایسا بنایا ہی نہیں کہ تم کھیل سکو۔

عظیم: کیا اللہ صرف انہی بچوں کے ہیں، میرے نہیں؟

ماں: بیٹا! ایسی بات نہیں کرتے۔ اللہ ناراض ہوتے ہیں۔

عظیم: ایسا کیوں ہے کہ اللہ مجھے کھیلنے بھی نہیں دیتے اور پھر مجھ سے ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔

ماں: بیٹا! ایسا نہیں سوچا کرتے۔ ذرا سوچو تو کیا میں تم سے پیار نہیں کرتی؟

عظیم: آپ تو مجھ سے سب سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔

ماں: اب ذرا سوچو تمہیں امی کس نے دی؟

عظیم: اللہ میاں نے۔''(۷۵)

اس حصے کا سب سے بڑا حسن' ماں کے مثالی کردار کا اجاگر کرنا ہے۔اسے پوری طرح احساس ہے کہ اگر عظیم' مایوسی کے بوجھ تلے دب گیا تو وہ پوری زندگی جسمانی معذوری کے ساتھ ساتھ ذہنی معذوری کا شکار ہو کر معاشرے پر بوجھ بن جائے گا۔اس لئے وہ ایک ماہر نفسیات کی طرح اسے اُمید دلاتی ہے۔ یہاں راہی صاحب نے ماں کی زبان سے معذور بچوں کی ماؤں کو بھی یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ وہ ہمہ وقت اپنے بچوں کو ڈپریشن سے بچانے کے لئے ان کے ساتھ گفتگو کریں اور ان کے ذہن میں موجود نفسیاتی اُلجھنوں کو دور کریں، اس حصے کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ماں' خدا اور دعا کی طاقت کے ذریعے عظیم کے کمزور ارادوں کو مضبوط کرتی ہے اور عظیم کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف مائل کرتی ہے۔ ڈرامے کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

''ماں: ذرا سوچو تمہیں امی کس نے دی؟

عظیم: اللہ میاں نے۔

ماں: تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تم سے پیار نہ کرتے ہوں۔ اگر پیار نہ کرتے تو تمہیں پیار

کرنے والی امی ہی نہ دیتے۔

عظیم: مگر ایسا کیوں ہے کہ باقی سب بچے بہت کچھ کر سکتے ہیں جبکہ میں کچھ نہیں کر سکتا؟

ماں: عظیم بیٹا! تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ دنیا میں لاکھوں اندھے، بہرے، اور گونگے موجود ہیں۔
تم تو دیکھ بھی سکتے ہو، سن بھی سکتے ہو بات بھی کر سکتے ہو۔(۷۶)

اس حصے میں عظیم کا کردار چھوٹے چھوٹے مکالموں کے ذریعے کھلتا ہے۔ اس کے مکالمے اس کی نفسیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ چونکہ بچے فطرتاً تجسس مزاج ہوتے ہیں، اس لئے وہ معاملے کے تہہ تک پہنچنے کے لئے اور بھرپور تسلی کے لئے چھوٹے چھوٹے سوالات کرتے ہیں۔ راہیؔ صاحب بچوں کی اس فطرت کا جائزہ لینے کے بعد اسے یوں ڈرامے کا حصہ بناتے ہیں:

(1) ''عظیم: امی! میں چاہتا ہوں میں بھیک مانگ کر نہ کھاؤ۔ خود کماؤں اور خود کھاؤں۔ آپ پر پر اور ابو پر بوجھ نہ بنوں'' (۷۷)

(2) ''عظیم: مجھ لولے لنگڑے کو بھلا کون نوکری دے گا؟'' (۷۸)

(3) ''عظیم: مسکرایا، ایسا کیوں ہے کہ باقی سب بچے تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ جبکہ میں کچھ نہیں کر سکتا؟''(۷۹)

ان چھوٹے چھوٹے سوالات کے ذریعے عظیم کا دکھ اور اُداسی کے اسباب ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مکالمے کی زبان آسان فہم، رواں دواں ہے۔ اس میں ادب کا لطف بھی ہے اور کردار نگاری کا حسن بھی۔

اس ڈرامے کا دوسرا منظر یا باب عظیم کے نئے کردار کو سامنے لاتا ہے۔ وہ اپنی نفسیاتی اُلجھنوں سے چھٹکارا پا چکا ہے اُس کی زندگی سے اندھیرے ختم ہو چکے ہیں۔ اب وہ معذوری کو اپنی مجبوری نہیں سمجھ رہا ہے۔ اس منظر میں وہ سکول میں تقریری مقابلے میں حصہ لے رہا ہے، اس کی تقریر اس کی خود اعتمادی کا مظہر ہے۔ اب وہ سکول کے بچوں کے لئے رول ماڈل بن چکا ہے۔ دوسری منزل میں ڈرامے کی کہانی آگے بڑھتی ہے اور نئے رخ پر نظر آتی ہے۔ عظیم کی تقریر کا موضوع ہے۔ ''میں بڑا ہو کر کیا کچھ کر سکتا ہوں؟'' یہ تقریر دراصل ان صحت منداور معذور بچوں کے لئے ایک نصیحت ہے جو شرمیلے ہوتے ہیں اور تقریر کرنے سے گھبراتے ہیں۔ یہاں راہیؔ صاحب بچوں کو سمجھاتے ہیں کہ کہاں عظیمؔ جو اپنے خول میں بند تھا اور کسی کا سامنا نہیں کر سکتا تھا اور یہاں وہ تقریر کے ذریعے اپنے نئے عظم کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں تقریر حرف تقریر نہیں ہے بلکہ زندگی کے نئے سفر کا آغاز بھی ہے۔ ڈرامے کا یہ منظر دیکھیے:

''عظیم: صدرِ ذی وقار! اور قابل صد احترام سامعین! میں آپ سب کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے اتنے خوب صورت انداز سے میرا استقبال کیا۔ آپ کی بھرپور تالیوں کا بہت بہت شکریہ! مگر دوستوں! میں ابھی تالیوں کا مستحق نہیں ہوں۔ آج تو شاید یہ سمجھ کر تالیاں پیٹی گئی ہیں کہ میں معذور ہوں لیکن مجھے بصد ادب یہ کہنے دیجئے کہ کچھ لوگوں کے مقابلے میں، میں جسمانی

طور پر معذور ضرور رہوں گا مگر ذہنی طور پر معذور نہیں، مضبوط ہوں۔'' (۸۰)

اس تقریر کی خصوصیت یہ ہے کہ عظیم کسی جذباتیت کا شکار نہیں ہے بلکہ دلائل کے ساتھ اس میں معذوری کے بوجھ سے آزاد ہونے کا عزم موجود ہے۔ مثال کے طور پر عظیم' تاریخی انسانی کے ان معذور افراد کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے معذوری کے باوجود زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنا مقام بنایا۔ ان کامیاب افراد میں فلورنس نائٹ انگیل ، مدر ٹریسا، ہیلن کیلر جیسے افراد کا حوالہ شامل ہے اس کے ساتھ ساتھ حکیم محمد سعید، عبدالستار ایدھی اور ملالہ یوسف زئی کی جدوجہد بھی ایک علامت کے طور پر ڈرامے کا حصہ بنتی ہے۔

ڈرامے کا آخری حصہ اپنے مقصدیت کو سامنے لاتا ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ خیبر پختونخوا کے بعض علاقوں میں پولیو کے قطرے نہیں پلائے جاتے اور اسے متنازعہ بنایا گیا ہے۔ راہیؔ صاحب نے بطور خاص اس پہلو سے ڈرامے میں اصلاحی پیغام دیا ہے۔ تقریر کا یہ حصہ بھی ملاحظہ کیجیے:

> ''صدر گرامی القدر! میں یہ بھی عہد کرتا ہوں کہ میں شہر شہر، قریہ قریہ، گاؤں گاؤں جا کر یہ پیغام پہنچاؤں گا، کہ مجھے دیکھو اور عبرت حاصل کرو! میں تمام والدین کو قائل کرنے کی کوشش کروں گا کہ بچوں کی صحت کے لئے پولیو کے چند قطرے اتنی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر ہو سکا تو اس نیک مقصد کے حصول کیلئے میں تین پہیوں کی گاڑی خرید کر، گھر گھر پہنچ کر اپنا مشن پھیلاؤں گا۔ اگر میں یہ گاڑی نہ خرید سکا تو اپنی بیساکی کے سہارے قریہ قریہ پہنچوں گا......اور اگر یہ بیساکی ٹوٹ گئی تو میرا آپ سے وعدہ ٹھہرا کہ میں زمین پر گھسیٹتا ہوا چلوگاں مگر چلوں گا ضرور، تاکہ کل کے بچوں کو اُس مرض سے بچانے کی کوشش کروں جس نے ایک مدت تک مجھے محرومیاں عطا کیں۔'' (۸۱)

اور یوں یہ ڈراما ایک اصلاحی مقصد کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا ہے جس میں ایک ایسے انسانی المیے کو خوب صورتی کے ساتھ ادب کا حصہ بنایا گیا ہے جس کی طرف بہت کم ادیبوں نے توجہ دی ہے۔

اس ڈرامے میں مقصدیت کا عنصر سامنے رکھا گیا ہے جس سے ہم راہیؔ صاحب کے نظریہ ادب کو بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ادب برائے مقصدیت یا ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ گویا راہیؔ صاحب بچوں کے ادب کے افادی پہلو سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''ادب اور بالعموم بچوں کا ادب' بالخصوص مقصدیت کے بغیر بے روح جسم سے زیادہ کچھ نہیں۔ دنیا کے عظیم ادیبوں اور سخنوروں کی تخلیقات سے اگر مقصدیت کو منہا کیا جائے تو ان کی تحریروں کی روح ہی خارج ہو جائے اور ان کا قد کاٹھ سمٹ کر رہ جائے''۔ (۸۲)

اس ڈرامے کا عنوان علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل مشہور شعر سے لیا گیا ہے:

؎ شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پر دم ہے اگر تُو تو نہیں خطرۂ افتاد (۸۳)

اقبال کے اس شعر میں ان کا مشہور نظریۂ خودی جھلکتا ہے۔ شاہین اُن کی شاعری میں علامت ہے اور نظامِ فکر کا ایک اہم حصہ بھی ہے۔ اقبال نے شاہین کو خودی کی علامت کے طور پر نوجوان نسل کے لئے بطور مثال پیش کیا ہے۔ راہیؔ صاحب کا یہ ڈراما اور اقبال کے مصرعے سے عنوان لینے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ راہیؔ صاحب فکرِ اقبال کے ہم خیال ادیب ہیں۔

اس ڈرامے کی زبان، روزمرہ زندگی میں بولی جانی والی زبان کی طرح اپنے کرداروں کی نمائندہ زبان ہے۔ بالعموم ناتجربہ کار ادیب ادبی اور بول چال کی زبان میں فرق نہیں کرتے اور مکالمے کی زبان میں ادبی زبان کا رنگ شامل کر کے یہ بھول جاتے ہیں کہ مکالمے کی زبان دراصل کردار کی نفسیات کو ظاہر کرتی ہے۔

اس ڈرامے کی کہانی کو اگر دیکھا جائے تو یہ بچوں کو وہ لطف دیتی ہے جو ایک کہانی کا مقصود ہے۔ پہلے حصے میں ہی کہانی تجسس کو تخلیق کرتی ہے اور قاری کے ذہن میں تجسس اور کشمکش کی کیفیت کو جنم دیتی ہے۔

۲۔ بچے ہوں تو ایسے ہوں:

بچوں کے لئے شجاعت علی راہیؔ کا دوسرا ڈراما ''بچے ہوں تو ایسے ہوں'' کے نام سے فروری ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا۔ اس ڈرامے کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ شجاعت علی راہیؔ کی حقیقی زندگی سے وابستہ کرداروں پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے کا مقصد بھی بچوں کو اچھے اخلاق کی طرف راغب کر کے اُن کی تعلیم تربیت کرنا ہے اور انہیں رول ماڈل کے ذریعے یہ حقیقت سمجھانی ہے کہ خوشحال اور پُرامن معاشرے کا قیام صرف حکومتی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس میں قوم کے ہر فرد کا اپنا ایک خاص کردار ہے۔ قوم تب ہی مہذب بن سکتی ہے جب قوم کے بچے اور بوڑھے بغیر کسی غرض کے اپنے ملک کے لوگوں کی مشکلات دور کریں۔ اس حوالے سے کتاب کے دیباچے میں پروفیسر جاوید احساس لکھتے ہیں:

> ''ادب کا مطالعہ ہمیں زندگی سے منسلک اور تہذیب سے مربوط ہی نہیں کرتا، ہمیں فطرت کے ان دونوں مظاہر اور ان میں جوہر کی مانند مضمر بے حد وحساب امکانات پر اعتماد عطا کر کے ہمیں اخلاقیاتی اور نفسیاتی سطح پر مضبوط بھی کرتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں ادب حسن، حق اور خیر جیسے ادبی اقدار پر مبنی تخلیقی وتہذیبی مثلیث کے فروغ وحصول کا ایک فنی جمالیاتی مظہر اور تخلیق کار مذکورہ مظہر کے ایک ذمہ دار ترجمان کی صورت میں سامنے آتا ہے۔'' (۸۴)

ادب کے اس افادی پہلو کا ذکر شجاعت علی راہیؔ نے اپنی اس کتاب میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''لفظ میں بڑی قوت ہے۔ لفظوں کی ترتیب سے جملے تشکیل پاتے ہیں جو ہمارے خیالات اور محسوسات

کے عکاس ہوتے ہیں۔ چاہے تقریر ہو یا تحریر، اپنا اثر مرتب کرتی ہے، بالخصوص جب وہ فن کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے انقلابات کے پس منظر میں وہ کتابیں، وہ تحریریں اور وہ تقریریں ہیں جن سے عظیم الشان تاریخی شخصیتوں کے نام جڑے ہوئے ہیں۔ شاعری، فکشن، ڈراما، فلسفہ، مکالمہ ہر ایک اپنا جادوئی اثر رکھتا ہے۔ ان سب کی اپنی ایک جمالیاتی اور تخلیقی کشش بھی ہوتی ہے اور یہ افکار کی نسل در نسل ترسیل کی سبیل بھی بنتے ہیں۔(۸۵)

راہیؔ صاحب نے ''بچے ہوں تو ایسے ہوں'' میں سماج کے سدھارنے میں بچوں کے کردار کو واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک بچے کسی بھی ملک کا مستقبل ہیں اور ان کے بغیر سماج اپنے اعلیٰ مقاصد حاصل نہیں کر سکتا۔ اس ڈرامے کی کہانی راہیؔ صاحب کی حقیقی زندگی سے لی گئی ہے اور کردار بھی ان کے خاندان کے چھوٹے بڑے افراد پر مشتمل ہیں، جن میں اُن کے بھائی اور بھائیوں کے بچے اور نواسے شامل ہیں۔ اِن کرداروں کی کل تعداد ۷۱ ہے۔ کتاب کے آغاز میں ان کرداروں کا تعارف دیا گیا ہے۔ اس ڈرامے کی کہانی خاندان کے ایک محفل شروع ہوتی ہے جس میں سب اپنے اپنے حصے کی نیکیاں کمانے پر متفق ہوتے ہیں۔ آغاز میں راہیؔ صاحب اپنے بھائیوں ریاض لالا اور امتیاز لالا سے مکالمہ کرتے ہوئے ماضی کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ اس مکالمے کا مقصد ماضی کے اُن اقدار کو یاد کرنا ہے جو اب تیزی سے مٹ چکی ہیں یا مٹ رہی ہیں۔ اس حصے کے ایک مکالمے پر نظر ڈالیے:

امتیاز: کیا خوب صورت دن تھے۔ کیا سادگی تھی۔ نہ گھروں میں بجلی ہوا کرتی تھی۔ نہ ٹیلی وژن تھا، نہ موبائل تھا۔ بس سکون کا عالم ہوا کرتا تھا۔

ریاض لالا: زندگی مشکل سے گزرتی تھی مگر پھر بھی اچھی گزرتی تھی۔

شجاعت: اب تو ایک افراتفری ہے۔ ٹی وی پر ڈھیروں چینل ہیں۔ دیکھو تو آدمی حیران کم اور پریشان زیادہ ہو جاتا ہے۔'' (۸۶)

ڈرامے کے آغاز سے ہی اس کے مزاج اور پیغام کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس مکالمے میں بچے بھی شامل ہوتے ہیں اور یوں بچوں اور بڑوں پر مشتمل ۴ گروپ بنائے جاتے ہیں، جو سماج کی اصلاح کی کوششوں کا آغاز کرتے ہیں اور پھر چند دنوں بعد ایک اور اجلاس میں بچے اپنی کارکردگی پیش کرتے ہوئے ان واقعات کا ذکر کرتے ہیں جن میں انہوں نے معاشرے کی اصلاح کی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں چند واقعات ملاحظہ کیجیے:

۱) ملائکہ: ہم ایک پبلک پارک میں گھوم رہے تھے۔ دیکھا اک انکل گلاب کے پھول توڑ رہے ہیں۔ میں اُن کے قریب گئی اور اُن سے کہا: انکل! کیا آپ یہ گلاب پودے پر دوبارہ لگا سکتے ہیں؟ وہ حیران ہو کر بولے: کیا مطلب؟ میں نے کہا: یہ پھول اس پودے پر کتنا اچھا لگ رہا تھا! ہم سب اُسے

دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اب توڑ لیا گیا ہے تو جلد ہی مرجائے گا۔ انکل نے سر ہلایا اور بولے: بیٹی! آپ نے بہت اچھی بات بتائی۔ میں نے کبھی ایسے سوچا ہی نہیں تھا۔ آئندہ احتیاط کروں گا۔'' (۸۷)

۲) انمول: ہمارے کلاس میں ایک بچی نے میڈم سے بدتمیزی کی۔ ان کو ٹھینگا دکھایا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ استانی تو ہماری ماما جیسی ہوتی ہے۔ بالآخر اس نے میڈم سے سوری کہا اور میڈم نے ہم دونوں کو خوب پیار کیا۔'' (۸۸)

۳) گل اندام: میں گھر کے باہر فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔ میں نے کیلے کا ایک چھلکا پڑا ہوا دیکھا۔ اسے اُٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا تاکہ کوئی بچہ بچی یا بلی کتا چلتے ہوئے اس پر پاؤں پڑنے سے اس پر پھسل کر گر نا جائیں۔ (۸۹)

ان سب واقعات کا تعلق بچوں کی روزمرہ زندگی سے ہے۔ بچوں کی دنیا گھر، گلی، سکول اور پارک تک ہی محدود ہوتی ہے۔ راہیؔ صاحب نے اسی محدود دنیا کو ڈرامے کا مرکز بنا کر عملی کرداروں کے ذریعے بچوں کو یہ تصور دیا کہ وہ نیک بن کر کس طرح معاشرے میں نیکی کو فروغ دے سکتے ہیں۔ ڈرامے کی کہانی اور مکالمے زندگی کی اچھی اور اعلیٰ اقدار کو سیدھے سادے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ راہیؔ صاحب اس ڈرامے کے مقصد پر خود ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

> ''میرا ہدف وہ پیغام ہے جو میں نے نئی نسل تک پہنچانا ہے۔ یہ میرا دوسرا ڈراما ہے اس ڈرامے کے کردار سو فیصد حقیقی ہیں اور چند واقعات کا بھی حقائق سے قریبی رشتہ ہے۔ یوں یہ ایک طرح سے ہمارا فیملی ڈراما ہے۔ مقصد نئی نسل تک اُن اخلاقی اور سماجی قدروں کی ترسیل ہے جو دوسروں سے ہم تک پہنچیں، چاہے پہنچانے والے خاندان کے بزرگ تھے، شعراء و ادباء تھے یا اساتذہ تھے۔'' (۹۰)

اس ڈرامے میں ہلکے پھلکے انداز میں اخلاقی مضامین اور دانائی کی باتیں ملتی ہیں۔ یہ مضامین چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہیں۔ بچوں کی نفسیات کے مطابق چھوٹے جملے اور آسان الفاظ میں دانائی کی باتیں لکھنا اچھی خاصی مہارت کا ادبی کام ہے۔ ان جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ راہیؔ صاحب اس حوالے سے قادر الکلام ادیب ہیں۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

۱) ''انسان کو دوسروں کے لئے آسانی پیدا کرنی چاہئیں۔'' (۹۱)

۲) ''اس تیز رفتاری کا کیا فائدہ جس میں جان ہی جاتی رہے۔'' (۹۲)

۳) ''دوسروں میں خاطر خواہ تبدیلی لانے کے لئے اپنے اندر مثبت تبدیلی لانے ہی کے ذریعے ممکن ہے۔'' (۹۳)

۴) ''تم کو اللہ نے اچھے اچھے کام کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ آج کے بچے کل کے باپ ہوتے ہیں۔ تم چھوٹے ہو لیکن اب بھی عظیم ہو''۔ (۹۴)

راہیؔ صاحب کا یہ ڈراما پہلے ڈرامے کی بہ نسبت طویل ہے۔ یہ ڈراما چھ منازل پر مشتمل ہے، جو اپنی طوالت کے باوجود نئے نئے واقعات کی شمولیت سے نہ صرف دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔ بلکہ تفریح اور تربیت کے مقاصد کو بھی حاصل کرتا ہے۔ اس ڈرامے کی زبان چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہے۔ خاندان کے بزرگوں کے کرداروں کی زبان پر سنجیدگی اور دانشوری کا رنگ غالب ہے جبکہ بچوں کے کرداروں کی زبان' اُن کی معصومیت اور جوش خروش کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ دونوں ڈرامے بچوں کے ادب میں ایک کامیاب اضافہ ہیں کیونکہ صنف ڈراما نگاری' کتابی شکل میں بچوں کے ادب میں کمیاب ہے۔ راہیؔ صاحب کے یہ ڈرامے اس کمی کو سہولت سے پورا کرتے ہوئے ادبِ اطفال کے مقاصد کی تکمیل کی عمدہ مثالیں ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر اسحاق وردگ سے راقمہ کا انٹرویو: مقام پشاور، بتاریخ ۲۵ جولائی ۲۰۱۹ء

۲۔ شجاعت علی راہیؔ: ہم نے زردہ کھایا: کے اینڈ ایچ پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۶

۳۔ ایضاً ص ۷

۴۔ ایضاً ص ۸

۵۔ ایضاً ص ۱۰

۶۔ ایضاً ص ۱۵

۷۔ ایضاً ص ۳۶۔۳۷

۸۔ ایضاً ص ۴۴

۹۔ ایضاً ص ۴۵

۱۰۔ ایضاً ص ۵۰۔۵۱

۱۱۔ ایضاً ص ۳۳

۱۲۔ ایضاً ص ۶۶

۱۳۔ ایضاً ص ۴۶

۱۴۔ ایضاً ص ۷۷

۱۵۔ پیش لفظ از طلعت امتیاز نقوی: مشمولہ: چڑیوں کی چہکار: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۸ء، ص ۱۲

۱۶۔ آواز دے کے دیکھ لو از شجاعت علی راہیؔ: مشمولہ: چڑیوں کی چہکار: ص ۱۴

۱۷۔ شجاعت علی راہیؔ: چڑیوں کی چہکار: ص ۳۰

۱۸۔ ایضاً ص ۱۸

۱۹۔ ایضاً ص ۱۹

۲۰۔ ایضاً ص ۱۳۴

۲۱۔ ایضاً ص ۱۵۱

۲۲۔ ایضاً ص ۱۶۹

۲۳۔ ایضاً ص ۱۰۱

۲۴۔ ایضاً ص ۱۷۳

۲۵۔ ایضاً ص۱۵۵

۲۶۔ ایضاً ص۱۶۴

۲۷۔ ایضاً ص۱۳۲

۲۸۔ ایضاً ص۸۲

۲۹۔ ایضاً ص۹۹

۳۰۔ ایضاً ص۴۱

۳۱۔ ایضاً ص۶۱

۳۲۔ ایضاً ص۸۱

۳۳۔ ایضاً ص۱۰۲

۳۴۔ ایضاً ص۱۴۱

۳۵۔ ایضاً ص۱۸۴

۳۶۔ ایضاً ص۱۹

۳۷۔ ایضاً ص۲۷

۳۸۔ ایضاً ص۱۴۶

۳۹۔ ایضاً ص۱۲۰

۴۰۔ ایضاً ص۵۲

۴۱۔ ایضاً ص۵۴

۴۲۔ ایضاً ص۶۷

۴۳۔ ایضاً ص۹۰

۴۴۔ ایضاً ص۹۱

۴۵۔ ایضاً ص۱۰۵

۴۶۔ ایضاً ص۱۷۱

۴۷۔ ایضاً ص۳۳

۴۸۔ ایضاً ص۲۴

۴۹۔ ایضاً ص۴۵

۵۰۔ ایضاً ص۵۷

۵۱۔ ایضاً ص ۱۲۳
۵۲۔ ایضاً ص ۵۵
۵۳۔ ایضاً ص ۶۲
۵۴۔ ایضاً ص ۴۷
۵۵۔ ایضاً ص ۱۸۷
۵۶۔ ایضاً ص ۱۵۸
۵۷۔ ایضاً ص ۹۳
۵۸۔ ایضاً ص ۱۰۳
۵۹۔ وزیر آغا: ڈاکٹر: اردو ادب میں طنز و مزاح: مکتبۂ عالیہ، لاہور، س۔ن، ص ۴۶۔ ۴۷
۶۰۔ شجاعت علی راہیؔ: چڑیوں کی چہکار: ص ۱۷۷
۶۱۔ ایضاً ص ۴۷
۶۲۔ ایضاً ص ۱۲۶
۶۳۔ ایضاً ص ۱۲۸
۶۴۔ ایضاً ص ۱۷
۶۵۔ محمد بن عبداللہ ولی الدین خطیب تبریزی: مؤلف: مشکاۃ المصابیح: حدیث نمبر ۲۴۶۶، مکتبۂ محمدیہ، لاہور، جنوری ۲۰۰۸ء، ص نمبر ۴۰
۶۶۔ شجاعت علی راہیؔ: چڑیوں کی چہکار: ص ۸۹
۶۷۔ ایضاً ص ۴۳
۶۸۔ ایضاً ص ۲۳
۶۹۔ انور جمال: پروفیسر: ادبی اصطلاحات: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۰۴
۷۰۔ محمد اشرف کمال: ڈاکٹر: اصطلاحات: بک ٹائم کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۲۱۳۔ ۲۱۴
۷۱۔ مرزا ادیب: بچوں کا ادب (ایک جائزہ): مقبول اکیڈیمی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۶۱
۷۲۔ حرف اوّل از فضل ربی راہیؔ: مشمولہ: شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات ص ۶
۷۳۔ شجاعت علی راہیؔ: شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا: ص ۱۰
۷۴۔ حرف اوّل از فضل ربی راہیؔ: مشمولہ: شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا: ص ۸
۷۵۔ شجاعت علی راہیؔ: شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا: ص ۱۱۔ ۱۳

۷۶۔ ایضاً ص ۱۲

۷۷۔ ایضاً ص ۱۲

۷۸۔ ایضاً ص ۱۳

۷۹۔ ایضاً ص ۱۲

۸۰۔ ایضاً ص ۱۵

۸۱۔ ایضاً ص ۱۷۔۱۸

۸۲۔ ایضاً ص ۹

۸۳۔ محمد اقبال: علامہ: ضرب کلیم: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۷۲

۸۴۔ دیباچہ از جاوید احساس: پروفیسر: مشمولہ: بچے ہوں تو ایسے ہوں: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۰ء، ص ۶

۸۵۔ شجاعت علی راہیؔ: بچے ہوں تو ایسے ہوں: ص ۹

۸۶۔ ایضاً ص ۱۳

۸۷۔ ایضاً ص ۲۶۔۲۷

۸۸۔ ایضاً ص ۲۷

۸۹۔ ایضاً ص ۲۸

۹۰۔ ایضاً ص ۱۰

۹۱۔ ایضاً ص ۲۱۔۲۲

۹۲۔ ایضاً ص ۲۴

۹۳۔ ایضاً ص ۲۶

۹۴۔ ایضاً ص ۲۹

محاکمہ

جدید اردو ادب کو اپنے اسالیب، مزاج اور نظریات کے تناظر میں مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے اور انہی بنیادوں پر ادب کے مختلف مکاتب فکر وجود میں آرہے ہیں، اسی طرح اس کے تجزیے اور تفہیم کے لئے نفسیاتی تنقید، ساختیاتی تنقید اور رومانی تنقید جیسے تنقیدی نظریات بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ تاہم ادب کی تخلیق میں کچھ اسالیب کی حیثیت دائمی ہوتی ہے، اور یہ رجحان یا تحریک دنیا کے ہر ترقی یافتہ ادب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ بچوں کا ادب یا ادبِ اطفال اس دائمی اور آفاقی ادب کا ایک حصہ ہے اور اس کا اعتراف ہر دور میں ہوتا چلا آرہا ہے۔ بچوں کے ادب کی اہمیت بہت سے حوالوں سے واضح ہے۔ اکثر ناقدین اور ماہرین ادب اس ضمن میں قطعیت کے ساتھ یہ رائے دے چکے ہیں کہ بچوں کا ادب ایک مرکزی تربیت گاہ کا کردار ادا کرتی ہے۔ انگریزی زبان سمیت دیگر عالمی زبانوں میں بچوں کے ادب کی روایت مستحکم ہو چکی ہے، تاہم اردو میں اسے بہت کم توجہ دی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود گذشتہ دو صدیوں میں بچوں کے ادب کا اچھا خاصا سرمایہ وجود میں آچکا ہے اور اُمید رکھنی چاہئے کہ اب ادب اطفال کی اہمیت مزید بڑھی گی۔ پاکستان کے مختلف شہروں سے بچوں کے رسائل چھپ رہے ہیں، خصوصاً لاہور اور کراچی ادب اطفال کے بہترین مراکز ہیں۔ خیبر پختونخوا میں ادب اطفال کی روایت زیادہ قابل رشک نہیں ہے، اس لئے اس صوبے میں بچوں کے ادب سے وابستہ ادیبوں کی تعداد انگلیوں پر ہی گنی جاسکتی ہے۔

خیبر پختونخوا میں بچوں کے وہ ادیب جنہوں نے پاکستان کی سطح پر نام کمایا، بہت کم ہیں۔ ان میں خاطر غزنوی، شجاعت علی راہیؔ، ڈاکٹر اسحاق وردگ، رئیس احمد مغل نسبتاً زیادہ قابل ذکر ہیں۔ تاہم شجاعت علی راہیؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ خیبر پختونخوا کے پہلے ادیب ہیں جنہوں نے بچوں کے ادب کو سب سے زیادہ کتابیں دی ہیں۔

راہیؔ صاحب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخصیت ہیں۔ انگریزی ادب میں ایم۔ اے کر چکے ہیں اور بہت سے ممالک کا سفر اور سیاحت بھی کر چکے ہیں۔ اس دوران انہیں مختلف ممالک کی ثقافتوں اور تہذیبوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُنہوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ۱۹۶۸ء کیڈٹ کالج کوہاٹ سے کیا، بعد میں برٹش کونسل کی طرف سے منتخب ہو کر برطانیہ (ایڈنبرا) چلے گئے۔ وہاں سے تعلیمی ٹیلی وژن کا کورس کرنے کے بعد کچھ عرصے تک اس سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد انہیں سعودی عرب میں سعودی ائیر لائنز میں بطور انگریزی انسٹرکٹر ملازمت مل گئی اور سعودی عرب (جدہ) میں تقریباً سترہ سال تک مقیم رہے۔ سعودی عرب سے وطن واپسی پر تقریباً آٹھ سال تک ملک کے باوقار تعلیمی اداروں کی سربراہی کی اور آخر میں گیارہ برس تک کوہاٹ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں انگریزی کے پروفیسر اور صدر شعبۂ انگریزی بھی رہے۔ اس طرح سفر اور مطالعے نے آپ کے قوتِ مشاہدہ کو وسعت بخشی، بلکہ یوں کہیں کہ آپ نے ہر تہذیب اور

معاشرے کو بہت باریک بینی سے دیکھا اور اس کا اثر قبول کیا۔

اپنے وسیع تجربات، مشاہدات اور جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے راہیؔ نے شاعری کا انتخاب کیا۔ جس میں نظم اور غزل دونوں شامل ہیں۔ تخصیص کے ساتھ غزل کے میدان میں اُنہوں نے ہر طرح کے مضامین میں طبع آزمائی کی اور یہی اُن کے اظہار کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔ اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کا آغاز زمانہ طالب علمی سے ہی ہوا تھا۔ جب وہ چھٹی جماعت میں تھے تو اُنہوں نے اپنی پہلی کہانی ''بہار'' لکھی۔ جماعت ہشتم میں اُنہوں نے شعر و شاعری شروع کر دی اور مختلف بین الکلیاتی مشاعروں میں شرکت کر کے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

شجاعت علی راہیؔ بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ ان کی پہچان شاعری کے حوالے سے زیادہ مستحکم ہے۔ اُن کے سات شعری مجموعے چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''برف کی رگیں'' ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا، جس پر اُنہیں آباسین آرٹ کونسل پشاور کا سالانہ ایوارڈ ملا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''پھول کھلے یا نہ کھلے'' کے نام سے ۱۹۸۵ء میں ماؤرا پبلشرز کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ تیسرا شعری مجموعے ''چراغ گل نہ کرو'' ۲۰۰۹ء میں چھپا، جس پر اُنہیں سردار عبدالرب نشتر ایوارڈ ملا۔ اسی طرح چوتھا شعری مجموعہ ''ہجرت مسلسل'' ۲۰۱۲ء میں، پانچواں شعری مجموعہ ''نور علی نور'' بھی ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا جبکہ چھٹا شعری مجموعہ ''نالہ شب گیر'' جو مناجات پر مشتمل ہے، ۲۰۱۷ء میں چھپا۔ ''ابابیلیں (سونشتر)'' ان کا ساتواں مختصر شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آیا۔

ان کی شاعری داخلیت اور خارجیت کا ایک حسین امتزاج ہے۔ انہوں نے متنوع موضوعات پر قلم اُٹھایا۔ اچھوتے اور نرالے مضامین کو انہوں نے اپنے انداز بیان سے اور بھی زیادہ نرالہ اور انوکھا رنگ بخشا۔ بہترین الفاظ اور شعور و فکر کی رفعت راہیؔ کی شاعری کا خاصہ ہے۔ ان کے کلام میں کہیں بھی ابتذال، پست خیالی اور غیر مانوس الفاظ نہیں ملتے۔ ان کی غزل میں غنائیت اور رنگینی کی بڑی وجہ موضوع الفاظ کا انتخاب اور ان کا برمحل استعمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی نامور گلوکاروں نے ان کی غزلیں سروں کے ساتھ گائی ہیں جن میں مہناز بیگم، کمار سانو، خورشید بیگم اور اخلاق احمد وغیرہ شامل ہیں جو مختلف ویب سائٹس پر بھی موجود ہیں۔

غزل کے ساتھ ساتھ راہیؔ کے مختلف مجموعہ ہائے کلام میں شامل نظمیں بھی اس لحاظ سے انفرادیت کی حامل ہیں کہ یہ فطرت کے ہر رنگ کی عکاسی کرتے ہیں۔ انہوں نے نظم کو صرف انفرادیت تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ اس میں مختلف اصناف کو برت کر خارجی اثرات کے امتزاج سے اور بھی حسین تر بنایا۔ آزاد نظم، پابند نظم، نظم معرا، نثری نظم، مسدس، ہائیکو، دوہے، قطعات، ثلاثیاں غرض ہر ہیئت میں اپنے جذبات اور احساسات کا خوب اظہار کیا۔ حمدیہ نظمیں، نعتیہ کلام، منقبت، مناجات، مراثی، معراج نامہ، منظوم سیرت النبیؐ اور سلام آپ کے کلام کا نمایاں حصہ ہے۔ غرض راہیؔ کی شاعری غزل اور نظم

ہر دو اعتبار سے ایک ہمہ جہت شاعری ہے۔

راہی کو چونکہ مختلف اصناف میں طبع آزمائی کا شوق تھا، چنانچہ شاعری کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے نثر میں افسانے بھی تخلیق کئے۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ ''آوازوں کا جنگل'' کے نام سے موسوم ہے۔ جس میں کل ۱۸ افسانے شامل ہیں۔ اپنے افسانوں میں اُنہوں نے عام آدمی کے مسائل، خواتین کے استحصال، تعلیم، جنسی مسائل، غربت، اقدار کی تنزلی اور طبقاتی کشمکش کو موضوع بنایا۔

افسانہ نگاری کے علاوہ انہوں نے ''بلیک باکس'' کے نام سے اپنی ایک خودنوشت بھی تحریر کی ہے جو شعیب سنز پبلشرز نے ۱۹۱۸ء میں شائع کی۔ اس خودنوشت میں راہیؔ نے اپنے زمانہ طالب علمی، جائے پیدائش و رہائش، خاندان، بہن بھائیوں، لڑکپن، جوانی، تعلیم، پیشہ ورانہ زندگی، بیرون ملک قیام، پاکستان ٹیلی وژن سے وابستگی، سرزمین حجاز میں سترہ برس قیام، مختلف تعلیمی اداروں کی سربراہی اور آخر میں کوہاٹ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی سے سبکدوشی اور اپنے ہم عصر عزیز واحباب کا ذکر کیا ہے۔ یوں یہ ایک خودنوشت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دور اور ایک عہد کی مکمل تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ راہیؔ نے اپنی زندگی کے مختلف مراحل اور مدارج طے کرنے کے ساتھ ساتھ اُس وقت کے موجودہ سیاسی وسماجی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

چونکہ زیرِ نظر مقالہ ادبِ اطفال کے فروغ میں شجاعت علی راہیؔ کی شعری و نثری خدمات کے متعلق ہے، اس لئے اس ضمن میں ان کی بچوں کے لئے لکھی گئی تخلیقات کا تفصیلی محاکمہ پیش کیا جائے گا۔

شجاعت علی راہیؔ نے نہ صرف ادبِ اطفال کو مُفید کتب سے نوازا ہے بلکہ انہوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر کے بیک وقت بچوں کے لئے شاعری اور نثر نگاری میں اپنی اعلیٰ تخلیقات پیش کیں۔ بچوں کے لئے شاعری کے ضمن میں پانچ شعری مجموعے تحریر کیے ہیں جن میں ''زرم شگوفے''، ''الف سے ائی''، ''ذرا سوچو تو''، ''مطلب بے مطلب'' اور مشاعرے شامل ہیں۔ یہ تمام مجموعے اپنے موضوعات، مقصدیت، تعلیمی اور اخلاقی تربیت کے لحاظ سے بہترین شہ پارے ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''زرم شگوفے'' کے نام سے طفیل آرٹ پرنٹرز کی وساطت سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اُس وقت صوبہ خیبر پختونخوا میں شاعری کے باب میں بچوں کے لئے بہت کم ادیبوں نے لکھا تھا۔ ''زرم شگوفے'' میں کل ۱۸ نظمیں ہیں جو بچوں کی ذہنی استعداد، عمر اور دلچسپیوں کے عین مطابق ہیں۔ اس مجموعے میں راہیؔ نے نظم ''ہوائی جہاز'' اور نظم ''خزاں'' میں بچوں کو اردگرد کے ماحول میں پائی جانی والی مختلف اشیاء کی آوازوں سے روشناس کیا ہے۔ اس کے علاوہ اچھے بچوں کی خصوصیات کو منظوم انداز میں بہت خوب صورت طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ بچوں کو برابری اور مساوات کا درس دیا

گیا ہے۔ان کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ پہیلیاں بھی لکھی گئی ہیں۔اسی طرح راہیؔ کا دوسرا شعری مجموعہ ''الف سے ائی'' بھی K&H پبلشرز نے ۲۰۱۲ء میں چھاپا۔''الف سے ائی'' کے شعری مجموعے میں راہیؔ نے سادہ، رواں اور عام فہم زبان استعمال کر کے بچوں کی نفسیات کے مطابق با تصویر نظمیں تخلیق کی ہیں اور کھیل کھیل میں بچوں کو معلومات پہنچانے کی عمدہ کاوش کی ہے۔

کتاب کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے کیا گیا ہے۔ بچوں کو دلچسپ انداز میں گنتی سکھانے کے ساتھ ساتھ دس تک پہاڑے بھی سکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کے علاوہ کتاب میں بچوں کو حروف تہجی اور توڑ جوڑ کی مشق بھی کرائی گئی ہے اور آخر میں ان کو مختلف رنگوں کا شعور دینے کے لئے مختلف اشیاء کچھ اشعار بھی باندھے گئے ہیں جس سے بچے نہ صرف محظوظ ہوتے ہیں بلکہ محظوظ ہونے کے ساتھ مختلف قسم کے رنگوں سے بھی آشنا ہوتے ہیں۔

راہیؔ کا تیسرا شعری مجموعہ ''ذرا سوچو تو'' کے نام سے K&H پبلشرز کی مدد سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب مختلف مفید، دلچسپ اور سبق آموز قطعات پر مشتمل ہے۔ یہ قطعات اس قدر سبق آموز اور دلچسپ ہیں کہ اگر انہیں نصابی کتب میں شامل کیا جائے تو اس سے بچوں کی تعلیم و تربیت اور تعمیرِ شخصیت میں خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔اس مجموعے میں ''حمد'' کے ساتھ ''نعت'' کی صنف سے بھی بچوں کو متعارف کرایا گیا ہے اور اسلام کے بنیادی ارکان، ماں، استاد کی عزت و احترام، سچ کی اہمیت اور جھوٹ کی ذلت، وقت، دوستی، وفا کے موضوعات پر خوب صورت اشعار لکھے گئے ہیں۔کچھ مشہور تلمیحات کو بھی اشعار کے روپ میں ڈھالا گیا ہے جو راہیؔ کے فنی عظمت کا ثبوت ہے۔

راہیؔ کا چوتھا شعری مجموعہ ''مطلب بے مطلب'' جو ''نان سینس رائمز'' پر مشتمل ہے، بھی K&H پبلشرز کے زیر اہتمام ۲۰۱۲ء کو شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل ۴۹ نظمیں ہیں جس میں مختلف جانوروں اور پرندوں کے بارے میں معلومات اور ان کی خصائل و عادات کا ذکر مزاحیہ انداز میں کیا گیا ہے۔

راہیؔ کا پانچواں شعری مجموعہ ''مشاعرے'' کے نام سے رقم ہے۔ یہ مجموعہ بھی K&H پبلشرز اسلام آباد نے ۲۰۱۳ء میں چھاپا۔ اس مجموعے میں راہیؔ نے پرندوں، جانوروں اور حشرات الارض کے مابین مشاعرے، ان کی خصوصیات اور جبلتوں کو بنیاد بنا کر پیش کئے ہیں۔ان مشاعروں کے ذریعے بچوں کو جانوروں اور پرندوں کے بارے میں معلومات دلچسپ، معلوماتی اور منظوم انداز میں پہنچائی گئی ہیں۔

چونکہ شجاعت علی راہیؔ کو مختلف اصناف میں طبع آزمائی کا شوق ہے' چنانچہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لئے انہوں نے نہ صرف بڑوں کے لئے مختلف اصناف میں لکھا، بلکہ بچوں کے لئے بھی مختلف اصناف میں لکھنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ بچوں کے لئے شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے نثر میں بھی لکھا۔نثر میں انہوں نے خاص طور پر ناولٹ لکھے۔مجموعی طور پر انہوں

نے کل ۱۲ ناولٹ تحریر کئے ہیں جن میں ''باغی چیونٹیاں''،'' تتلیوں کا میلہ''،'' ڈائنا سور کیوں غائب ہوگئے''، ''بلی کی آپ بیتی''،''کبوتر''،''بولتے برگد''،''سرخ سیارہ''،''ماں''،''قہقہہ''،''حیرت انگیز''،''عظیم لوگوں کے عظیم خواب'' اور'' بچے: (ڈور یمان، جاپان اور پاکستان)''وغیرہ شامل ہیں۔ان میں سے پہلے سات ناولٹ باقاعدہ طور پر چھپ چکے ہیں اور باقی پانچ ناولٹ طباعت کے مرحلے سے گزر رہے ہیں اور انشاء اللہ بہت جلد منظر عام پر آجائیں گے۔ناولٹ نگاری میں انہوں نے رنگارنگ موضوعات پر باقاعدہ تحقیق کر کے قلم اُٹھایا ہے اور حقیقی کرداروں سے کام لے کر ناولٹ کی خوب صورتی میں اضافہ کیا ہے۔

ان کا پہلا ناولٹ ''باغی چیونٹیاں'' ہے جو کہ ایک سبق آموز ناولٹ ہے۔یہ ناولٹ راہیؔ نے چیونٹیوں کی عادات اور خصائل پر باقاعدہ تحقیق کر کے لکھا ہے اور اس میں چیونٹیوں کی اہمیت ،فضیلت اور مختلف اقسام کا ذکر کیا ہے۔ان کا دوسرا ناولٹ ''تتلیوں کا میلہ'' ہے جو تتلیوں کے دیس کی ایک کہانی ہے۔یہ ناولٹ تتلیوں کی مختلف اقسام ،رنگوں اور ان کی پُر اسرار زندگی سے متعلق ایک مکمل تحقیق ہے۔اس میں ان کی پیدائش کے مختلف مراحل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح تتلیاں جنم لینے کے بعد زندگی کا ایک بہار دیکھنے کے بعد جلد فنا ہو جاتی ہیں۔

تیسرا ناولٹ ''ڈائنا سور کیوں غائب ہوگئے'' میں راہیؔ نے بچوں میں ریسرچ کلچر کو فروغ دینے اور انہیں لکھنے لکھانے کی ترغیب دینے پر لکھا ہے۔یہ بھی ایک تحقیقی ناولٹ ہے ،جس میں ڈائنا سوروں کے بارے میں باقاعدہ تحقیق کر کے لفظ ڈائنا سور کا مطلب، ان کی اقسام ،خصوصیات ،زمین پر ان کی حکمرانی اور ان کے عنقا ہونے کی وجوہات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔دور حاضر میں ڈائنا سوروں کے بارے میں جو تحقیقات کی گئی ہیں، اُسے بھی کہانی کا حصہ بنایا گیا ہے اور یوں ڈائنا سوروں کے بارے میں طلبہ وطلبات کو بہت سی معلومات بہم پہنچا کر یہ نصیحت کی گئی ہے کہ وہ اس کائنات میں موجود مختلف چیزوں اور مخلوقات کے بارے میں ریسرچ کر کے جاننے کی کوشش کریں۔

راہیؔ صاحب نے بچوں کے لئے اپنا چوتھا ناولٹ ''بلی کی آپ بیتی'' کے نام سے لکھا۔اس ناولٹ میں بلیوں کی نفسیات، ان کی عادات واطوار، جذبات واحساسات اور خصوصیات پر تحقیق کی گئی ہے۔یہ ناولٹ ''آپ بیتی'' ہونے کی وجہ سے جہاں ایک طرف دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے ہے، وہاں یہ معلومات کا بھی ایک مفید ذخیرہ ہے جس میں دنیا بھر میں پائی جانے والی قیمتی ، امیر ترین، سب سے لمبی اور تیز رفتار بلیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔یہ ناولٹ اس قدر دلچسپ ہے کہ جب قاری ایک دفعہ اسے پڑھنا شروع کردے، تو وہ اسے ایک ہی نشست میں پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔راہیؔ صاحب کے پانچویں ناولٹ کا موضوع ''کبوتر'' ہے۔ان کے دیگر ناولٹوں کی طرح یہ ناولٹ بھی ان کے زرخیز تخلیقی اور تحقیقی ذہن کا کرشمہ ہے۔ اس ناولٹ میں انہوں نے کبوتر کی صفات، اس کی تاریخی اہمیت وتقدس اور خصوصیات کو زیر بحث لایا ہے اور انسانوں کے

ساتھ اس کے قریبی رشتے کو موضوع بنایا ہے۔ راہیؔ صاحب کو پرندوں سے ایک خاص انسیت ہے، تب ہی انہوں نے اپنی شاعری میں اور بچوں کے لئے تخلیقات میں پرندوں کے متعلق بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ یہ ناولٹ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ کبوتر کے مقدس روپ کا ہے اور اس کا اسلوب اس لحاظ سے سنجیدہ ہے، جبکہ دوسرا حصہ طنز مزاح پر مبنی ہے جس میں جاسوس کبوتروں کی جاسوسی کو ایشو بنا کر پاک بھارت کی سیاسی کشیدگی کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ آخر میں راہیؔ دونوں ممالک کے درمیان اس طرح کی معمولی معمولی باتوں سے اجتناب کرنے کی ضرورت پر زور دے کر امن وآشتی کا پیغام دیتے ہیں، جو ایک طرح سے اس ناولٹ کا مرکزی خیال بھی ہے۔

''بولتے برگد'' شجاعت علی راہیؔ کا چھٹا ناولٹ ہے جو بچوں اور بڑوں دونوں کے لئے یکساں سبق آموز اور مفید ہے۔ یہ درختوں کی زبانی درختوں کی اہمیت وافادیت کو آشکارا کرتی ہے۔ اس میں تین ایسے برگدوں کے ذریعے کہانی بیان کی گئی ہے، جو بولنے کی صلاحیت سے نوازے گئے ہوتے ہیں۔ اس ناولٹ میں مختلف واقعات اور چھوٹے چھوٹے ضمنی قصے بیان کئے گئے ہیں۔ ناولٹ کا انداز بیانیہ ہے۔ ٹمبر مافیا کو صحیح معنوں میں بے نقاب کرنے کی بہترین سعی کر کے انہیں تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ ناولٹ اپنی دلچسپی، تجسس اور روانی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔

''سرخ سیارہ'' راہیؔ کا ساتواں طبع شدہ ناولٹ ہے۔ موجودہ دور چونکہ ایک سائنسی دور ہے، ہر طرف کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا دور دورہ ہے اور کتاب کلچر زوال پذیر ہو رہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر بچوں کے لئے مفید، معلوماتی اور بامقصد سائنسی ادب تخلیق کیا جائے، چنانچہ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے راہیؔ نے ''سرخ سیارہ'' کے نام ناولٹ لکھا جس میں نظام شمسی، مریخ اور اس کے حوالے سے زندگی کا ایک تصوراتی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ راہیؔ کے باقی ناولٹ تا حال غیر مطبوعہ ہیں۔ چونکہ زیر نظر مقالے میں راہیؔ صاحب کی صرف طبع شدہ تخلیقات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس لئے یہاں غیر مطبوعہ تخلیقات کا سرسری ذکر کیا جاتا ہے، مثلاً ان کا ناولٹ ''بچے: (ڈوریمان، جاپان اور پاکستان)'' ایک تخیلاتی سفرنامہ ہے جو ناولٹ کے انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں پاکستان اور جاپان کی ثقافت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دنیا کے چند غیر معمولی طور پر ذہین بچوں کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ ''حیرت انگیز'' جو بذات خود ایک مکمل ناولٹ ہے لیکن اگر اسے سرخ سیارہ کے بعد پڑھیں تو یہ اس کا حصہ دوم معلوم ہوتا ہے۔ ''قہقہہ'' نفسیاتی موضوع پر لکھا ہوا ایک دلچسپ ناولٹ ہے، اسی طرح ''عظیم لوگوں کے عظیم خواب'' گوتم بدھ سے عبدالستار ایدھی تک مختلف تاریخی شخصیات سے متعلق ایک ناولٹ ہے جس میں ان کی زندگی سے متعلق ان لمحات کو تحریری وتخلیقی طور پر گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے جو ان کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ ناولٹ ''ماں'' میں مصنف نے

ایک ایسی ماں کا ذکر کیا ہے جو اپنے اکلوتے بیٹے سے بچھڑ کر طرح طرح کے کرب سہتی ہے اور جی بہلانے کے لئے انسانوں اور جانوروں کو وہ پیار دینے کی بھرپور سعی کرتی ہے جو وہ اپنے گمشدہ بیٹے کو دینا چاہتی تھی۔ اس کے بیٹے پر ماں سے جدائی کے بعد جو کچھ گزرتی ہے، وہ بھی انتہائی کربناک ہے۔ وہ اغوا ہونے کے بعد وزیرستان سے افغانستان پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد حالات ڈرامائی طور پر جو صورتحال اختیار کرتے ہیں وہ ابتداء سے اختتام تک قاری کی دلچسپی برقرار رکھتی ہے۔ پس راہیؔ نے بچوں کے لئے مفید، بامقصد اور معلوماتی ناولٹ تحریر کئے ہیں۔ اس صنف میں انہوں نے بچوں کے لئے سب سے زیادہ لکھا ہے۔

راہیؔ نے شاعری اور ناولٹ نگاری کے علاوہ بچوں کے لئے مختصر کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی دو کتابیں ''ہم نے زردہ کھایا'' اور ''چڑیوں کی چہکار'' زیرِ نظر مقالے میں شامل ہیں۔ کہانیوں کے ان دونوں مجموعوں میں راہیؔ نے متنوع موضوعات پر لکھا ہے۔ یہ کہانیاں قصہ کے تمام لوازمات اور فنی عناصر پر پورا اترتی ہیں جنہیں پڑھ کر بچوں میں نیکی ، اچھائی، خوش اخلاقی اور دوسروں کی مدد کرنے کے جذبات موجزن ہوتے ہیں اور وہ اخلاقی برائیوں جیسے جھوٹ، حسد، بُری صحبت اور شرارت سے خود بخود توبہ کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں اور ناولٹ میں کہانی پن، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری اور تجسس جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ان کہانیوں میں تجسس کے ساتھ ساتھ جدید دور کی دنیا سے شناسائی کا سامان بھی موجود ہے۔ خاص طور وہ کہانیاں جن میں سائنسی موضوعات کو برتا گیا ہے، ان میں خشک اور بیزار کن سائنسی معلومات کو کہانی کا روپ دے کر بچوں کے اندر سائنسی شعور پیدا کرنے کی کامیاب کوشش ملتی ہے۔ یہ کہانیاں بچوں کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل بھی کرتی ہیں اور ان میں سائنس کی طرف متوجہ ہونے کے رجحان کو بھی جنم دیتی ہیں۔

اس کے علاوہ ان کہانیوں میں بچوں کو زندگی کا سلیقہ سکھانے کی کوشش ملتی ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات بچوں کو کہانی کے انداز میں مفید اور ذمہ دار شہری بنانے کا حوصلہ اور عزم دیتے ہیں۔ انہیں یہ بتاتے ہیں کہ زندگی کا مقصد انسانیت کا فروغ ہے نہ کہ ہوس اور دولت کی طلب۔ انسانیت' راہیؔ صاحب کی تحریروں کا سب سے بڑا سبق ہے اس لئے وہ ہر طرح کے تعصب سے بچوں کو نفرت سکھاتے ہیں۔ ان کی ہر تحریر میں ایک پیغام ہوتا ہے۔ ان کی کہانیاں بچوں کو معلومات عامہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں نیک بننے کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہے۔

راہیؔ صاحب نے بچوں کے لئے دیگر اصناف کی طرح ڈرامے کی صنف میں بھی اپنا حصہ ڈالا ہے۔ اس حوالے سے اُنہوں نے دو ڈرامے تحریر کیے ہیں جن میں ''شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا'' اور ''بچے ہوں تو ایسے ہوں'' شامل ہیں۔ ''شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا'' ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ڈراما پاکستانی معاشرے کے ایک اہم المیے کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ڈراما دراصل عظیم نامی ایک معذور بچے کی کہانی ہے، جو بچپن میں پولیو کے قطرے نہ پلانے کے

سبب معذوری کا شکار ہو جاتا ہے۔ چونکہ معذوری نہ صرف ایک جسمانی مسئلہ ہے بلکہ درحقیقت یہ بے پناہ نفسیاتی مسائل کی جڑ بھی ہے۔ اس ڈرامے میں 'راہیؔ نے فن ڈراما نگاری کے تقاضوں کی گرہ کشائی کی ہے اور معذور بچوں کو ایک مثبت پیغام دیا ہے کہ وہ معذوری کو ہرگز اپنی راہ کی رکاوٹ نہ سمجھیں، بلکہ حالات کا مقابلہ کر کے زندگی کے اصل مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اسی طرح ان کا دوسرا ڈراما '' بچے ہوں تو ایسے ہوں'' راہیؔ کی حقیقی زندگی سے وابستہ کرداروں پر مشتمل ایک ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں بھی بچوں کو کھیل کھیل میں اچھی عادات اور اچھے اخلاق کی طرف راغب کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ خوشحال اور پر امن معاشرے کا قیام صرف حکومت کی ذمہ داری ہی نہیں بلکہ ہم سب کا فرضِ اوّلین ہے۔ قوم کے ہر فرد کا اپنا کردار ہوتا ہے۔ کوئی قوم تب ہی مہذب بن سکتی ہے جب اس قوم کے بچے اور بوڑھے بغیر کسی غرض اور لالچ کے اپنے ملک کے لوگوں کی مشکلات کو دور کریں۔ یوں اس ڈرامے میں راہیؔ نے معاشرے کے سدھارنے میں بچوں کے کردار کو واضح کیا ہے کہ بچے ہی کسی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں اور ان کے بغیر معاشرہ و سماج اپنے اعلیٰ مقاصد کو ہرگز حاصل نہیں کر سکتا۔

راہیؔ صاحب کی کتابیں ایک ایسے دور میں منظر پر آئی ہیں کہ کتاب کلچر زوال کا شکار ہے۔ بچوں میں کتاب بینی کا جذبہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اسکول کی کتابوں کو بھی رٹا لگا کر یاد کرتے ہیں اور نظام تعلیم بھی مطالعے کا شوق پیدا نہیں کر رہا۔ اس لئے راہیؔ صاحب نے اس اہم موڑ پر ان کتابوں کے ذریعے معاشرے میں مطالعے کا شوق پیدا کیا ہے اور اپنے گراں قدر تخلیقات کی بدولت ادبِ اطفال کے مقاصد کے حصول کو ممکن بنایا ہے۔ بچوں کے لئے اُنہوں نے بے شمار نظمیں، ناولٹ، مختصر کہانیاں اور ڈارمے لکھے ہیں اور یوں ایک بامقصد ادب تخلیق کیا ہے۔ ان کا تخلیق کردہ ادب بچے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ بچوں کے لئے لکھی گئی' چاہے راہیؔ صاحب کی نظمیں ہوں، کہانیاں یا ناولٹ ہوں، یہ سب تحریریں بچوں کو بامقصد تفریح کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت کا بہترین سامان فراہم کرتی ہیں۔ ان کی تحریریں بتاتی ہیں کہ راہیؔ صاحب ایک استاد کی حیثیت سے بچوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ بچوں کی تعلیم میں ادب کے کردار سے بخوبی آگاہ ہیں، اس لئے انہوں نے بچوں کے لئے اپنی تحریروں میں صرف تفریح ہی فراہم نہیں کی، بلکہ ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر خاطر خواہ تربیت کا اہتمام بھی کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں اردو زبان سیکھنے پر بھی کافی توجہ دی گئی ہے۔ وہ آسان اور عام فہم زبان لکھ کر بچوں کے ذخیرہ الفاظ میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کی انفرادیت اس لحاظ سے بھی قائم ودائم ہے کہ انہوں نے قدیم وجدید دونوں ادوار میں بچوں کے لئے لکھ کر ادبِ اطفال کے دامن کو رنگا رنگ موضوعات سے نوازا اور جدید دور کے تقاضوں کو بھی سمجھا۔ کہانیوں اور

ناولٹوں میں سائنسی فکشن پر بھی لکھا۔ان کا ناولٹ ''سرخ سیارہ'' اس ضمن میں ایک روشن مثال ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ راہیؔ بچوں کے لئے ہر طرح کے موضوعات پر قلم اُٹھانے کی اہلیت وصلاحیت رکھتے ہیں۔صرف یہی نہیں بلکہ اپنی مختصر کہانیوں کے مجموعے ''چڑیوں کی چہکار'' میں بھی راہیؔ نے تقریباً آٹھ کہانیاں لکھی ہیں، جن میں ''ایک مقام کی کہانی''، ''پہاڑوں کی شکست وریخت''، ''چندا ماموں کا خط''، ''حیرت انگیز تبدیلی''، ''دھنک بستی''، ''مایال آئینے میں''؛''اور میں جلتا رہا'' اور ''تین پراسرار سرنگ'' شامل ہیں۔

ادب اطفال کے ساتھ ساتھ بڑوں کے ادب میں بھی شجاعت علی راہیؔ کا مقام ومرتبہ سنہرے حروف میں یاد رکھنے کے قابل ہے اور اس کا اعتراف ان مضامین ومقالات کی صورت میں موجود ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف ادبی رسائل اور اخبارات میں چھپتے رہے ہیں۔مختلف جامعات نے بھی راہیؔ صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایم۔اے اور ایم۔فل کے تحقیقی مقالات قلم بند کروائے ہیں۔ان مقالات کے مطالعے سے راہیؔ صاحب کی ادبی شخصیت کی مختلف جہتیں سامنے آئی ہیں۔ان جہتوں میں انہوں نے بڑوں کے لئے حمد،نعت،مرثیہ،سلام،غزل اور نظم کی اصناف میں اپنے فن کا لوہا منوایا ہے اور نثر میں افسانہ،خودنوشت،مضمون اور بچوں کے لئے نثری تحریریں لکھ کر خیبر پختونخوا کی روایت میں ایک ہمہ جہت مقام حاصل کیا ہے۔

بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ راہیؔ صاحب نے ایک مشن کے طور پر ادب اطفال کے دامن کو اپنے بیش قیمت تخلیقات سے وسعت اور رونق بخشی۔اُمید کی جاتی ہے کہ بچوں کے ادب کی روایت وتاریخ مرتب کرتے وقت راہیؔ جیسے سنجیدہ لکھاری کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا،بصورت دیگر موجودہ دور میں بچوں کے لئے جو معیاری اور مقصدی کام ہوا ہے وہ گزرتے وقت کے گرد وغبار تلے دب کر رہ جائے گا۔

کتابیات

۱۔ بنیادی ماخذ:

۱۔ شجاعت علی راہیؔ: زمِ شگوفے: طفیل آرٹ پرنٹرز، ۱۹۸۳ء

۲۔ شجاعت علی راہیؔ: الف سے امی: K&H پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

۳۔ شجاعت علی راہیؔ: مطلب بے مطلب: K&H پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

۴۔ شجاعت علی راہیؔ: ذرا سوچو: K&H پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

۵۔ شجاعت علی راہیؔ: مشاعرے: K&H پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء

۶۔ شجاعت علی راہیؔ: باغی چیونٹیاں: K&H پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

۷۔ شجاعت علی راہیؔ: تتلیوں کا میلہ: K&H پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

۸۔ شجاعت علی راہیؔ: ڈائنا سور کیوں غائب ہو گئے: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۷ء

۹۔ شجاعت علی راہیؔ: بلی کی آپ بیتی: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۷ء

۱۰۔ شجاعت علی راہیؔ: کبوتر: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۷ء

۱۱۔ شجاعت علی راہیؔ: بولتے برگد: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۸ء

۱۲۔ شجاعت علی راہیؔ: سرخ سیارہ: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۹ء

۱۳۔ شجاعت علی راہیؔ: ہم نے زردہ کھایا: K&H پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

۱۴۔ شجاعت علی راہیؔ: چڑیوں کی چہکار: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۸ء

۱۵۔ شجاعت علی راہیؔ: شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۸ء

۱۶۔ شجاعت علی راہیؔ: بچے ہوں تو ایسے ہوں: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۹ء

۱۷۔ شجاعت علی راہیؔ: پھول کھلے یا نہ کھلے: ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء

۱۸۔ شجاعت علی راہیؔ: برف کی رگیں: آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء

۱۹۔ شجاعت علی راہیؔ: چراغ گل نہ کرو: ماورا پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۹ء

۲۰۔ شجاعت علی راہیؔ: ہجرت مسلسل: ماورا پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۲ء

۲۱۔ شجاعت علی راہیؔ: نالۂ شب گیر (مناجات): شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات، ۲۰۱۷ء

۲۲۔ شجاعت علی راہیؔ: ابابیلیں (سونشتر): شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات ۲۰۱۸ء

۲۳۔ شجاعت علی راہیؔ: بلیک باکس: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، سوات ۲۰۱۸ء

۲۔ ثانوی مآخذ:

۱۔ احمد پراچہ: کوہاٹ کا ذہنی ارتقاء: ضیاء آرٹ پریس، پشاور، ۱۹۸۶ء

۲۔ اشرف کمال: محمد: ڈاکٹر: اصطلاحات: بک ٹائم کراچی، ۲۰۱۷ء

۳۔ اکبر رحمانی: پروفیسر: اردو میں ادب اطفال (ایک جائزہ): ایجوکیشنل اکادمی، اسلام پورہ، جاگاؤں، ۱۹۹۱ء

۴۔ انور جمال: پروفیسر: ادبی اصطلاحات: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

۵۔ Britannica Junior Encyclopedia: Vol 4C: Junuary 1, 1966

۶۔ جاوید نہال: پروفیسر: انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب: اردو رائٹرز گلڈ، کلکتہ، س۔ن

۷۔ جگر مراد آبادی: کلیات جگر: عبداللہ اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۲ء

۸۔ جگن ناتھ آزاد: اقبال کی کہانی: ترقی اردو بورڈ، دہلی، ۱۹۷۶ء

۹۔ حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۸ء

۱۰۔ Henery Commager: From "Introduction of the "A Critical History of Children Literature: "MEIGS" 1953

۱۱۔ خاطر غزنوی: ننھی منی نظمیں: سنڈیکیٹ آف رائٹرز، پشاور ۱۹۹۳ء

۱۲۔ خوشحال زیدی: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: کلر پرنٹرز، دہلی، ۱۹۸۹

۱۳۔ رفیع الدین ہاشمی: اصناف ادب: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

۱۴۔ رئیس احمد مغل: (مرتب) پرعزم بچے: خیبر پختونخوا، ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور، ۲۰۱۲ء

۱۵۔ زیب النساء بیگم: اقبال اور بچوں کا ادب: ترقی اردو، بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

۱۶۔ سجاد احمد حیدر: کوہاٹ کی علمی و ادبی خدمات: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۱۲ء

۱۷۔ سلیم اختر: ڈاکٹر: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: سنگ میل، پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۸۔ سلیم اختر: ڈاکٹر: افسانہ، حقیقت سے علامت تک: مکتبۂ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۶ء

۱۹۔ سیفی پریمی: اسماعیل میرٹھی: حیات اور کارنامے: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۶۹ء

۲۰۔ شیما مجید: (مرتبہ) بچے اور ادب: گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء

۲۱۔ عبادت بریلوی: ڈاکٹر: روایت کی اہمیت (چند تحقیقی مقالات کا مجموعہ): انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۱۹۵۲ء

۲۲۔ عبدالرؤف: ڈاکٹر: جدید تعلیمی نفسیات: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۶ء

۲۳۔ عبدالقادر سروری: جدید اردو شاعری: انجمن امداد باہمی، مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدر آباد، دکن، ۱۹۳۲ء

۲۴۔ عبدالقوی: دسنوی: بچوں کا اقبال: نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء

۲۵۔ کرامت حسین جعفری: مبادیات نفسیات: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

۲۶۔ گوہر رحمان نوید: صوبہ سرحد میں اردو ادب (پس منظر و پیش منظر): یونیورسٹی پبلشرز، پشاور، ۲۰۱۰ء

۲۷۔ گوہر نوید: کاٹلنگ: روحِ ادب: یونیورسٹی پبلشرز، پشاور، ۲۰۰۷ء

۲۸۔ محمد افتخار کھوکھر: روشنی کا سفر: دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء

۲۹۔ محمد اقبال: علامہ: بانگِ درا: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۶ء

۳۰۔ محمد اقبال: علامہ: ضرب کلیم: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۶ء

۳۱۔ محمد بن عبداللہ ولی الدین خطیب تبریزی: مشکاۃ المصابیح: مکتبۂ محمدیہ، لاہور، جنوری ۲۰۰۵ء

۳۲۔ محمود الرحمن: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: نیشنل پبلشنگ ہاؤس کراچی، ۱۹۷۰ء

۳۳۔ محمود شیرانی: حافظ: پنجاب میں اردو: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، اپریل ۱۹۸۸ء

۳۴۔ مرزا ادیب: اردو میں بچوں کا ادب (ایک جائزہ): مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء

۳۵۔ مشہدی: سیدہ: ڈاکٹر: اردو میں بچوں کا ادب: ایمن پبلی کیشنز، رانچی، انڈیا، ۱۹۹۰ء

۳۶۔ Merriam Webster's Encyclopedia of Literature: Merriam Webster's, Incorporated publishers Spring field, Massachusetts; USA,1995.

۳۷۔ نثار احمد قریشی: ڈاکٹر: صوفی غلام مصطفیٰ تبسم: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

۳۸۔ وزیر آغا: ڈاکٹر: اردو ادب میں طنز و مزاح: مکتبۂ عالیہ، لاہور، س۔ن

۳۹۔ وضاحت حسین رضوی: سید: ڈاکٹر: اردو ناولٹ کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ: ناشر: ڈاکٹر سید وضاحت حسین رضوی، تکیت رائے کالونی، لکھنؤ، ۲۰۰۱ء

۴۰۔ یونس حسنی: ڈاکٹر: اختر شیرانی اور جدید اردو ادب: انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۵ء

اخبارات ورسائل:

نمبر شمار	رسالہ واخبار	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
۱۔	سہ ماہی ''ابلاغ''	پشاور	۱۱ اکتوبر ۱۹۹۱ء
۲۔	مجلہ ''نایاب'' (شجاعت علی راہی نمبر)،	کوہاٹ	جنوری، ۱۹۸۷ء
۳۔	روزنامہ ''بے باک''	کوہاٹ	۲۹ مئی ۲۰۱۲ء
۴۔	روزنامہ ''سرگرم''	ایبٹ آباد	۲۶ اکتوبر ۲۰۱۸ء
۵۔	ہفت روزہ ''انقلاب''	کوہاٹ	۲۵ اگست ۲۰۱۸ء
۶۔	روزنامہ ''آج صبح''	پشاور	۲۴ اپریل ۲۰۱۹ء
۷۔	ماہنامہ ''ماہِ نو''	لاہور	۱۹۷۹ء
۸۔	ماہنامہ ''ساقی''	کراچی	۱۹۵۵ء
۹۔	ماہنامہ ''ساتھی''	کراچی	مئی ۲۰۱۹ء
۱۰۔	ماہنامہ ''مجاہد''	پشاور	دسمبر ۱۹۹۱ء
۱۱۔	ماہنامہ ''پیام تعلیم''	دہلی	ستمبر ۱۹۷۷ء
۱۲۔	مجلہ ''خیابان''	پشاور	۲۰۰۷ء
۱۳۔	مجلہ ''ادبیات''	اسلام آباد	۲۰۱۲ء
۱۴۔	ماہنامہ ''نیا دور''	لکھنؤ	دسمبر ۱۹۷۹ء
۱۵۔	ماہنامہ ''کتاب'' (بچوں کا ادب نمبر)	لاہور	۱۹۷۸ء
۱۶۔	ماہنامہ ''نقوش''	کراچی	اپریل ۱۹۵۲ء

انٹرویوز:

نمبر شمار	نام	بمقام	تاریخ
۱۔	پروفیسر ڈاکٹر عرفان اللہ خٹک	بنوں	۱۵ نومبر ۲۰۱۸ء
۲۔	شجاعت علی راہیؔ	بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد	۱۹ اکتوبر، ۲۰۱۸ء
۳۔	بریگیڈیر طلعت امتیاز نقوی	اسلام آباد	۱۰ نومبر، ۲۰۱۸ء

۴۔	شاہد زمان	کوہاٹ	۲۷ دسمبر، ۲۰۱۸ء
۵۔	سید مشیر حید ر نقوی	کوہاٹ	۱۴ دسمبر، ۲۰۱۸ء
۶۔	شجاعت علی راہیؔ (ریڈیو پاکستان کوہاٹ)	کوہاٹ	۱۲۴پریل، ۲۰۰۶ء
۷۔	شجاعت علی راہیؔ	کوہاٹ/ بحریہ ٹاؤن اسلام آباد	متعدد ملاقاتیں
۸۔	ڈاکٹر اسحاق وردگ	پشاور	۲۵ جولائی، ۲۰۱۹ء

غیر مطبوعہ تحقیقی مقالات:

۱۔ ڈاکٹر اسحاق وردگ: خاطر غزنوی: احوال و آثار تحقیقی و تنقیدی جائزہ: (پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ) شعبۂ اردو جامعہ پشاور، ۲۰۱۵ء

۲۔ اسحاق وردگ: ڈاکٹر: ادبِ اطفال کی روایت پر ایک نظر: مقالہ (غیر مطبوعہ)

۳۔ نوشین ودود: اردو میں بچوں کے ادب کا ارتقاء اور صوبہ سرحد: تحقیقی مقالہ، (ایم۔ اے اردو) شعبہ اردو جامعہ پشاور، ۲۰۰۹ء

۴۔ حافظ نورین فاطمہ: اردو میں بچوں کا ادب (اکیسویں صدی میں): (ایم۔ فل۔ مقالہ) گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۷ء

۵۔ وزیر جانان اورکزئی: شجاعت علی راہیؔ: احوال و آثار: (ایم۔ اے اردو) مقالہ شعبۂ اردو جامعہ پشاور، ۲۰۰۷ء

۶۔ عمران خان: شجاعت علی راہیؔ کی ادبی خدمات: (ایم۔ فل۔ مقالہ) نادرن یونیورسٹی، نوشہرہ، ۲۰۱۳ء

ویب سائٹس:

۱۔ http://www.u4u.com

۲۔ http://www.iqbalcyberlibrary.net

۳۔ http://urduweb.org

۴۔ http://urdustan.com

۵۔ http://www.urdupoint.com

۳۔ http://urduweb.org

۴۔ http://urdustan.com

۵۔ http://www.urdupoint.com

۶۔ http://urdublogspot.com

۷۔ http://www.rekhta.ogr>ebooks

انگریزی کتابیات وانسا ئیکلوپیڈیا:

۱۔ Henery Commager: From "Introduction of the "A Critical Histroy of Children Literature": MEIGS: 1953

۲۔ Britannica Junior Encyclopedia Vol 4C: Junuary 1, 1966

۳۔ Merriam Webster's Encyclopedia of Literature: Merriam-Webster's, Incorporated publishers Spring field, Massachusetts; USA,1995.

اُردولغات/انسا ئیکلوپیڈیا:

۱۔ اردولغاتِ مترادفات (مرتبہ) پروفیسر محی الدین خلوت، مشرقی کتب خانہ، لاہور

۲۔ فیروز اللغات اردو جامع، از الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز سنز لاہور، ۱۹۶۴ء

۳۔ فرہنگ تلفظ، مرتبہ: شان الحق حقی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان۔طبع چہارم، ۲۰۱۲ء

۴۔ ہندی اردو لغت، راجیسور راؤ، اصغر، بیجیت کتاب گھر چوک گنگا رام، ہسپتال، لاہور، ۲۰۰۳ء

۶۔ http://urdublogspot.com

۷۔ http://www.rekhta.ogr>ebooks

انگریزی کتابیات وانسا ئیکلو پیڈیا:

۱۔ Henery Commager: From "Introduction of the "A Critical Histroy of Children Literature": MEIGS: 1953

۲۔ Britannica Junior Encyclopedia Vol 4C: Junuary 1, 1966

۳۔ Merriam Webster's Encyclopedia of Literature: Merriam-Webster's, Incorporated publishers Spring field, Massachusetts; USA,1995.

اُردو لغات/انسا ئیکلو پیڈیا:

۱۔ اردو لغاتِ مترادفات (مرتبہ) پروفیسر محی الدین خلوت، مشرقی کتب خانہ، لاہور

۲۔ فیروز اللغات اردو جامع، از الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز سنز لاہور، ۱۹۶۴ء

۳۔ فرہنگ تلفظ، مرتبہ: شان الحق حقی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان۔ طبع چہارم، ۲۰۱۲ء

۴۔ ہندی اردو لغت، راجیسور راؤ، اصغر، سچیت کتاب گھر چوک گنگا رام، ہسپتال، لاہور، ۲۰۰۳ء